لیمی نیٹیڈ گرل

(ناول)

ڈاکٹراختر آزاد

نام : اختر علی

قلمی نام : اختر آزاد

تاریخِ پیدائش : ۲۰ر فروری ۱۹۶۶ء

مقامِ پیدائش : شام پور، پیرپینتی ، بھاگل پور (بہار)

تعلیم : پی ایچ ڈی، نیٹ (یو جی سی)

پیشہ : درس وتدریس

مصنّف کے پتے :

☆ مکان نمبر۔۳۸، روڈ نمبر۔۱

آزادنگر، مانگو، جمشید پور۸۳۲۱۱۰ (جھارکھنڈ)

☆ شعبہء اردو، جواہر نواُدیہ ودیالیہ، (منسٹری آف ایچ آر ڈی، انڈیا گورنمنٹ)

پوسٹ۔ بی کُٹنگ ، وایا۔ ٹاٹانگر،

سیچولتا، سرائے کیلا۔۸۳۱۰۰۲ (جھارکھنڈ)

فون نمبر: ۰۹۵۷۲۶۸۳۱۲۲

dr.akhtarazad@gmail.com

MODERN PUBLISHING HOUSE

9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002

PhoneNo-011-23278869, MOBILE: 9312566664

E.MAIL: vijaybooks@yahoo.com

LAMINATED GIRL (Novel) Rs-400/-

BY: DR.AKHTAR AZAD 2013

لیمی نیٹیڈ گرل

(ناول)

ڈاکٹر اختر آزاد

ناشر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹رگولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۔۱۱۰۰۲

سنِ اشاعت: 2013
تعداد : 500
قیمت : چارسوروپے
کمپوزنگ : نورالصّباح
سرورق : مہتاب عالم پرویز
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔2

ISBN:978-81-8042-269-0

زیرِاہتمام:
پریم گوپال مِتّل

کتاب ان پتوں پر بھی دستیاب ہے

مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ۔دہلی۔ممبئی۔علی گڑھ

آزاد کتاب گھر، جمشید پور، تاج بک ڈپو، رانچی، بک امپوریم، پٹنہ

انتساب

☆

اُن کے نام

جنہوں نے

لیمی نیشن پروسیس کے خلاف

احتجاج

کا

علم

بلند کیا

اور اس کی شروعات

گھر کی چہار دیواری سے کی

اُسے

میدانِ عمل بنایا

اور

بیٹیوں کو

''لیمی نیٹیڈ گرل''

بننے سے

بچایا

☆

تحریک بدن لڑکی

☆

اُس کے نام

جس

کی

روح

تحریک بدن میں سما کر

آج بھی

زندہ ہے

....

عورت

کی

عظمت

کی

خاطر

کل بھی

زندہ رہے گی

نئے قانون بدن میں سما کر

درندوں کو

پھانسی پر لٹکا کر

☆

1

قارئین اور لیمی نیٹیڈ گرل

قارئین!

یہ سچ ہے کہ پچیس سالوں سے آپ میرا تعاقب کر رہے ہیں ۔مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں ''لیمی نیٹیڈ گرل'' کو اپنے ناول کا موضوع بناؤں..........بہت کوشش کرنے کے بعد میں نے ہمّت کی ۔

قلم اُٹھایا اور موضوع کو اَبواب میں تقسیم کیا۔

پھر تخلیقی دنیا کے کرداروں کا انتخاب کیا اور ناول لکھنے بیٹھ گیا۔

لکھتے وقت جو مشورے آپ نے دیئے ہیں ۔اُس کا میں نے خاص خیال رکھا ہے ۔کیوں کہ یہ ناول آپ کی اِیما پر میں لکھ رہا ہوں ۔لکھ نہیں رہا ہوں بلکہ اگر یہ کہوں کہ آپ لکھوا رہے ہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اِس لئے پڑھتے وقت یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ آپ نے رئیلیٹی دنیا کے جن کرداروں کو مجھ سے ملوایا ہے،اُسے میں نے ناول میں اُس کی شخصیّت کی مناسبت سے پیش کیا ہے یا نہیں.........؟

اگر نہیں تو آپ کو یہ حق ہے کہ اُن کرداروں کو آپ اپنے ذہن ودماغ سے نکال کر ناول کے ساتھ اِس طرح مربوط کر دیں کہ وہ اِس کا حصّہ لگنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی دلچسپی بھی بنی رہے۔

ورنہ ''لیمی نیٹیڈ گرل'' نہ آپ کے ہاتھ آئے گی نہ ہی میرے۔

برسوں کی محنت یوں ہی رائیگاں چلی جائے گی۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ برسوں کی محنت رائیگاں جائے؟

☆☆☆

2

ناول اور اِس کا محرّک

قارئین!

آپ اِس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ میں نے اپنے ناول کی شروعات آپ سے کی ہے اور آپ ہی اِس ناول کے اصل محرّک ہیں ۔ یہ صرف آپ کو دھوکے میں رکھنے کے لئے کیا گیا ہے ۔تاکہ آپ کی حمایت ہمیں حاصل ہو اور آپ کے پیسے سے ناول چھپوا سکوں ۔آپ سے ناول پر جھوٹ سچ لکھوا سکوں۔قومی اور بین الاقوامی اکادمیوں پر دباؤ بنا سکوں کہ وہ اِس ناول پر مجھے انعام واکرام سے نوازیں۔

دراصل اِس ناول کے محرّک وہ تمام لوگ ہیں۔جن کے دماغ میں برسوں سے یہ موضوع کیڑے کی طرح رینگ رہا ہے ۔ وہ جب بھی کچھ لکھنے کے لئے قلم اُٹھاتے تو یہ موضوع اُن کے قلم کی روشنائی میں گھُل کر کاغذ پر اُترنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔لیکن سب کچھ ذہن میں محفوظ رہنے کے بعد بھی وہ اُسے مکمل نہیں کر پائے۔

جب بھی لکھنے بیٹھتے ان کی نظر اپنے ہی گھر میں الجھ کر رہ جاتی۔

کبھی بیوی سے،کبھی بیٹی سے،کبھی بہن سے........

کبھی لوگوں سے ملواتے ہوئے اُنہیں ایک طرح کی طمانیت سی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے خاندان کی لڑکیاں لیمینیٹ ہوکر اسٹیج کی رونق بننے لگیں تو آنکھوں میں پانی اُترنے لگا۔ جسے گود میں کھلایا تھا۔اب ان کی طرف دیکھتے ہوئے جھجھک محسوس ہونے لگی تھی ۔دوستوں سے ملواتے ہوئے آنکھیں شرم سے جھُکنے لگی تھیں۔

لیمی نیشن کے اس عہد میں بھی وہ سر اُٹھا کر جینا چاہتے ہیں۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں سر اُٹھا کر کس طرح جئیں..؟

☆☆☆

3

لیمی نیشن پروسیس اور سوچ کا قافلہ

قارئین!

آپ کے دباؤ کے باعث لوگوں کی اس سوچ کو میں مکمل کرنے جا رہا ہوں۔

مکمّل ہونے کا لذّت آمیز احساس صرف وہ عورت بتا سکتی جس کے وجود پر سماج نے بانجھ کا لیبل چپکا یا ہو اور اُس کی کوکھ نُما تالاب کے قدرتی کیچڑ میں ایک دن کنول کِھلکھِلا کر ہنس پڑا ہو۔

اِس اذیت ناک درد سے ادیب اکثر نبرد آزما ہوتا ہے۔

آپ نے بھی یقیناً ''لیمی نیٹیڈ گرل'' کو بے راہ روی پر چلتے دیکھا ہوگا۔ ذرا سوچئے کہ جب تہذیب کی گرمی سے لیمی نیشن پگھلے گی۔ اس کے مُضِر اثرات سے جلد جلنے لگے گی۔ تب اُسے کسی نہ کسی شجر کے نیچے آنا ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم شجر لگاتے، ہماری سوچ میں ہی بدلاؤ آنا شروع ہوگیا۔ ہم وہ جو کبھی گھر کی عزّت کو پڑوسیوں کی نظروں سے بھی بچا کر رکھتے تھے۔ سر پر آنچل اور سینے پر دوپٹّہ کا پہرا دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُس کی جگہ ٹاپ، جینس اور مینی اسکرٹ پہنانے لگے۔

یہیں سے لیمی نیشن کا پروسیس شروع ہوا۔

آج یہی لیمی نیشن عالمی منظر نامے میں حُسن کی علامت بن گیا ہے۔ موڈرنیٹی کی پہچان ہے۔ اور ہم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی بیٹیوں کو لیمینیٹ ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں .... پڑھنے لکھنے کی عمر میں ڈانس اور سانگ کا منچ فراہم کر رہے ہیں۔

اُس سے ہر طرف تعفُّن پیدا ہو رہا ہے۔

تعفُّن سے کیا آپ کا جینا دوبھر نہیں ہو رہا ہے؟

☆☆☆

4

مغربی ڈِش اور لیگس فرائی چِکن

قارئین!

شام کا مغربی آنچل وقت کے دوش پر لہرا رہا ہے اور اُس کو چھو کر گذرنے والی ہوا مشرقی اُفق پر بیٹھی نئی نسل کی سانسوں کے راستے آہستہ آہستہ اُس کے اندر اُتر رہی ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان سانس کی کڑی جہاں کمزور پڑی روح کا رشتہ جسم سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر کپل اور شوبھا کے درمیان کے رشتے تب کمزور پڑنے لگے جب ٹی وی چینلز نے ٹی آر پی کی اُگاہی کے لئے نئی نسل کے جسموں پر مرچ مصالحہ لگا کر وقت کے توے میں مغربی تیل سے ڈیپ فرائی کیا اور اسکرین نما پلیٹ میں موڈرنیٹی کا نمک چھڑک کر زندگی کے رنگین ٹیبل پر اِس طرح خوش نما بنا کر پیش کیا کہ چھُری کانٹے سے لیس لوگوں نے ٹیبل مینرز کو بالائے طاق رکھ کر رئیلیٹی شو کے اِس نادر کباب پر چاروں طرف سے یلغار کر دیا۔

''یار بہت ٹیسٹی ہے۔''

''ہاں میں نے کب کہا کہ ٹیسٹی نہیں ہے۔''

''ٹیسٹی ہے تو اِس کا مطلب.........!''

''مطلب کہ ہمیشہ زبان پر اِس کا ذائقہ باقی رہے۔''

اور اِس طرح ذائقہ دار ڈِش کو زندگی کے مینو میں شامل کر لیا گیا۔

اِس کے بعد ہر روز وقت نے زندگی کے ڈائننگ ٹیبل پر لیگس فرائی پروسنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اِس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ پیٹ کا ہاضمہ خراب نہ ہو۔ لیکن جنہیں زیادہ لیگس کی عادت تھی اُنہیں اِس سے کیا مطلب کہ زیادہ گوشت خوری صحت کے لئے مُضر ہے۔

لیکن رئیلیٹی کی موڈرن دنیا ''کھاؤ اور موج کرو'' کے نئے مول منتر کے ساتھ

آگے بڑھ رہی تھی کہ جو سامنے ہے اُسے اِنجوائے کرو تا کہ بعد میں زندگی کو تم سے کوئی شکایت نہیں رہے۔ کیوں کہ دنیا ایک بازار ہے جہاں ساری چیزیں ترازو میں تولی جاتی ہیں ۔ یہاں تک کہ نئی نسل بھی۔

اب لوگ اِس ترازو میں اپنے اپنے بچّوں کو بھی تولنے لگے تھے اور دیکھنے لگے تھے کہ کس میں کتنا وزن ہے۔ جس کا جتنا وزن ہوتا ریئلیٹی بازار میں اُس کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی۔

شوبھا نے ریئلیٹی کے ترازو میں جب ایک دن ڈاکٹر کپل سنگھ کی غیر موجودگی میں اپنی بیٹی پریتی کو تولا، تو اُسے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ اگر ریئلیٹی کے فارمولے پر رکھ کر وہ اُس کے سنہرے جسم کو کلکولیٹ کرتی ہے تو اُس کے جسم سے کہیں زیادہ سونا اس کے بینک لاکر میں ہوگا.........اور یہی وجہ ہے کہ ایک دن جب ڈاکٹر کپل تھکے ہارے ڈسپنسری سے گھر لوٹے اور آتے ہی اُنہوں نے اپنی پانچ سالہ بیٹی کے گلے میں اِسٹیتھو اِسکوپ ڈالا اور ائرپیسیس کو کانوں میں پہنا کر ڈایا فرام اُس کے ہاتھوں میں دیا۔ اور ابھی اُسے گود میں اُٹھا کر دن بھر کا پیار نچھاور کرنا ہی چاہا تھا کہ تبھی شوبھا دوڑی ہوئی آئی اور اُن کی گود سے پریتی کو اُتار کر ایک جھٹکے میں اِسٹیتھو اِسکوپ چھینا اور ایک طرف زور سے پھینک دیا۔ سامنے رکھا ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ ایک جھناکے کے ساتھ فریم سے الگ ہو گیا۔ اِسٹیتھو اِسکوپ جس طرح سے شوبھا نے چھینا تھا اُس سے پریتی کے کانوں میں رگڑ پیدا ہوئی۔ وہ رونے لگی تو غصّے میں شوبھا نے ایک تھپڑ اُوپر سے اور جڑ دیا۔ وہ ماں کی اِس حرکت پر اچانک روتے روتے چپ ہو گئی تھی۔ لیکن شوبھا چلائے جا رہی تھی۔

''مسٹر کپل! ایک بات یاد رکھو کہ یہ وہ زمانہ نہیں کہ بچّوں کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر انجینیئر بنایا جائے۔ یہ سب ریئلیٹی شو کی پیداوار ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں اِسے ڈانسر بنانا چاہتی ہوں۔ اِس لئے تم اِسے بہکانے کی بے وقوفی مت کرو۔''

اُس وقت ڈاکٹر کپل نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اُسے سمجھانے کی کوشش

کی تھی۔ ''سب کچھ گیت سنگیت اور ڈانس سے نہیں ہوتا۔ تم نے بھی ہائر ایجوکیشن حاصل کی ہے۔ اِس لئے تمہیں ایجوکیشن کا ویلیو معلوم ہونا چاہئے۔'' ہاتھ پکڑ کر اُس نے اُسے صوفے پر بٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ پریتی کا ہاتھ پکڑے اُسی طرح کھڑی رہی۔

'' ویلیو.........!''

غصّے کا پارہ جب کچھ نیچے اُترا تو ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیرے شوبھا نے ڈاکٹر کپل پر وار کیا۔

''وہ اپنے بازو والے جونیئر انجینیئر ہیں نا؟ اُس کا اسٹیٹس اگر دیکھا جائے تو آپ کے سامنے کیا ہے.........؟ کچھ بھی نہیں ہے نا۔'' اُس نے خود ہی جواب دیا۔ ''سوسائٹی میں سب سے کم رُتبہ تھا اُس کا۔ لیکن اُس کی سات سالہ بیٹی کنول نے ڈانس کمپٹیشن میں ایک کروڑ کیا جیتا۔ مبارک باد دینے والوں کی بھیڑ لگ گئی ہے۔ آج تو منتری بھی آئے تھے۔ وہ بھی محبّت کا چیک پکڑا گئے۔ ہر کوئی اُسے آج اپنی 'بیٹی' کہہ رہا ہے۔ ملک کی عزت سمجھ رہا ہے۔ تحفے اتنے آ رہے ہیں کہ رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ ایک نے تو فلیٹ بھی گفٹ کر دیا ہے ۔ ایک طرف یہ سب کچھ اور دوسری طرف چار مہینے تک مسیز شرما بیٹی کے ساتھ کبھی دہلی اور ممبئی کے اسٹار ہوٹلوں میں گھومتی رہی ہیں۔ ٹی وی پر ماں کی بھی تصویریں آ رہی تھیں۔ میں تو کل تک خود کو اُس سے سُپر سمجھتی تھی۔ لیکن اب اُس گنوار سے بھی مجھے ٹپس لینے پڑیں گے۔''

یہ کہتے کہتے وہ کچھ جذباتی سی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کپل نے ایک بار پھر شوبھا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کچن کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔

''دیکھو میں ڈسپنسری سے تھکا ہارا لوٹا ہوں۔ چائے وائے پلاؤ۔ یہ سب باتیں ابھی چھوڑو۔ بعد میں دیکھیں گے.........''

ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ بولی۔ ''کیسے چھوڑ دوں.........؟''

ایک بار پھر ڈاکٹر کپل نے اُسے پیار سے سمجھانا چاہا۔ ''ارے بھئی! پہلے پریتی کو پڑھنے دو۔ پھر دیکھیں گے کہ اُسے کیا بننا ہے۔ یہ ڈانس وانس اور گیت سنگیت میں رکھا ہی کیا

ہے۔کل تک یہی بھانڈ منڈلی میں ہوتے تھے۔شادی بیاہ کے موقعے پر گھر گھر ناچتے گاتے تھے۔اور تم ہو کہ اِسے وہی بنانا چاہتی ہو۔جسے کل گری ہوئی نظروں سے لوگ دیکھتے تھے۔''

''لیکن آج ایسا نہیں ہے ڈاکٹر کپل! زمانہ بدل گیا ہے اور زمانے کے ساتھ بہت کچھ بدل گیا ہے ،اس لئے خود کو بدلنے کی کوشش کرو۔'' شوبھا نے وقت ،حالات اور فائدے کو سامنے رکھ کر اُلٹے اُنہیں ہی بدلنے کی تلقین کر دی۔

''نہیں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔'' دلائل کی روشنی میں اُنہوں نے شوبھا کی باتوں کی تردید کرنی چاہی۔'' آج بھی وہی ماں باپ ہیں ،اور آج بھی وہی اولادیں ہیں۔بس اگر بدلا ہے تو وہ ہے ہماری سوچ کہ سب کچھ پیسہ ہے ....لیکن ایسا نہیں ہے۔آج بھی اسکرین پر کم کپڑے میں اپنی بیٹیوں کو دیکھ کر باپ کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔اور آج بھی بیٹیاں جان بوجھ کر اِس سنہری دلدل میں دھنستی نہیں ہیں۔ بلکہ زبردستی ماں باپ ہی اُسے ریشم کی سڑک پر چلنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔لیکن جانتی ہو یہ سڑک کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔؟ کوئلے کی کان میں۔''

شوبھا کو ڈاکٹر کپل کی اِن باتوں پر غصّہ آجاتا ہے___ ''اس طرح کی بکواس اور فالتو باتیں بند کرو۔تمہیں معلوم ہی کیا ہے کلاکاروں کے بارے میں........ارے اُن کی بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔حسین اور رنگین ۔زندگی کے جتنے رنگ ہیں سب اُن کے یہاں موجود ہیں۔اِس لئے کلاکاروں کی عزّت کرنا سیکھو۔نظریں جھکنا خود بخود بھول جائیں گی۔''

''ایسا ہے شوبھا جی !''مسکراتے ہوئے کہا۔''جو اصل میں کلاکار ہیں اور اپنی کلاکاری سے دنیا بھر کی چیزوں میں ایسی جان ڈال دیتے ہیں کہ ہم سب عش عش کر اُٹھتے ہیں۔لیکن آج تمہاری نظر میں اِس طرح کے کلاکار کی حیثیت مٹّی کے بھاؤ ہے اور جو مٹّی ہے اُسے غلطی سے تم نے سونا سمجھ لیا ہے ....اِس لئے میرے اور تمہارے دیکھنے کا نظریہ الگ ہے۔اور جہاں تک رہی بات لیڈیز کلاکاروں کو دیکھنے کی تو اُنہیں لوگ کس کس نظر سے اور کیسے کیسے زاویے بدل کر کہاں کہاں دیکھتے ہیں وہ تم کیا جانو گی۔کیوں کہ تمہاری آنکھوں

میں تو لالچ کا CATRACT اُگ آیا ہے۔اِس لئے تم دیکھنا بھی چاہو تو دیکھ نہیں پاؤ گی۔یوں سمجھ لو کہ تمہاری قسمت میں اِن ریئل کلاکاروں کو دیکھنا لکھا ہی نہیں ہے۔اور جسے تم دیکھ رہی ہو وہ تو ریئلیٹی شو کے تعفُّن کی وجہ سے ہر طرف کُکر مُتّے کی طرح اُگ آئے ہیں۔''

''تعفُّن اور کُکر متّے ....''

''ہاں نہیں تو اور کیا........''

''اگر تمہاری یہی ذہنیت رہی تو تمہیں اِسی تعفُّن اور سڑاندھ میں بٹیی بھی کسی کُکر متّے کی طرح دکھائی دے گی۔اُس وقت تمہارے لئے جینا بہت مشکل ہو جائے گا۔اِس لئے اپنی ذہنیت کو بدلو۔پھر دیکھو کیسے سامنے کا منظر آگ سے پھول میں بدل جاتا ہے۔''شوبھا نے نصیحت کی گولی کھلانے کی کوشش کی۔

''آگ میں پھول کا منظر تمہیں دکھائی دیتا ہو تو دیکھو،لیکن بھگوان کے لئے میری پھول سی بچّی کو اُس آگ میں مت ڈالو۔''

ڈاکٹر کپل نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔لیکن اُن کی اِن باتوں کا شوبھا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔اور وہ ہٹ دھرمی کے انداز میں بولتی ہی چلی گئی۔

''ریئلیٹی کی دنیا کیسی ہے اِس سلسلے میں ، میں تم سے کوئی رائے نہیں مانگ رہی ۔میں نے اِسے نو ماہ اپنی کوکھ میں پالا ہے۔تم سے زیادہ اِس کے فیوچر کی مجھے فکر ہے۔اور ایک بار اگر میں نے کہہ دیا تو تم بھی کان کھول کر سُن لو کہ اگر تم اِس کے ڈانسر بننے کے راستے میں رکاوٹ بنے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔اور پھر ڈاکٹر تو میں اِسے کسی حال میں بننے نہیں دوں گی۔تم نے ڈاکٹر ہو کر مجھے کیا دیا۔ایک گھر خریدنے کے لئے تو ہزاروں پاپڑ بیلے۔اِس لئے میں اِس نرک میں بیٹی کو نہیں ڈھکیلنا چاہتی۔ڈانس کے صرف ایک شو میں لاکھوں ملتے ہیں سمجھے۔''

☆☆☆

5

ڈاکٹر، مریض اور کیس ہسٹری

قارئین!

کلینک میں مریضوں کی بھیڑ تھی۔ نرس فہرست کے حساب سے ترتیب وار ایک ایک مریض کو ڈاکٹر کپل کے چیمبر میں بھیج رہی تھی۔ لیکن آج پہلی بار نرس نے یہ محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب مریضوں کی کیس ہسٹری جاننے کے لئے کچھ اُلٹے سیدھے سوالات کر رہے ہیں۔ ایک بخار کے مریض کا کیس ہسٹری لکھنے کے بعد اُنہوں نے مسکراتے ہوئے ایک عجب سا سوال کیا۔ جس کا بخار سے کوئی تعلّق نہیں تھا۔

''کیا آپ ریلیٹی شو دیکھتے ہیں۔؟''

''کیوں دیکھتے ہیں۔؟''

''کیا یہ وقت کی بربادی نہیں ہے؟''

''کیا آپ کے بچّے بھی گُڈّا گُڈّی کا کھیل چھوڑ کر ریئلیٹی شو دیکھتے ہیں۔؟''

''دیکھتے ہیں یا آپ اُنہیں دیکھنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔؟''

''اچھا اس لئے آپ مجبور کرتے ہیں کہ اُن کا مستقبل آپ کو ریئلیٹی شو کے گربھ میں نظر آتا ہے۔''

''کیا کہا کہ یہ زمانہ ہی ریئلیٹی شو کا ہے۔؟''

''تو جناب آپ کے اندر بھی ریئلیٹی شو کا ہی بخار ہے۔ جو سیدھا دماغ پر اٹیک کرتا ہے۔ اور فی الحال اِس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ویسے تسلّی کے لئے دوا لکھ دے رہا ہوں۔''

نرس رینوکا داس نے جب تمام مریضوں سے اِس طرح کے سوالات کرتے ہوئے ڈاکٹر کپل کو دیکھا تو اُسے بہت حیرانی ہوئی۔ کیوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی کلینک میں تقریباً پانچ سالوں سے اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی لیکن کبھی اُس نے ڈاکٹر صاحب کو اِس

طرح کے سوالات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے بہانے سے دو چار مریضوں کے پرسکرپشن دیکھے۔ وہاں سب ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُنہیں ڈاکٹر صاحب کی بے تُکی باتیں پریشان کر رہی تھیں۔

رینوکا داس سے رہا نہیں گیا۔ مریض کی لائن ختم ہوتے ہی وہ ہمّت کر کے چیمبر میں داخل ہوئی۔

''سر طبیعت تو ٹھیک ہے نا.........؟''

''ہاں.........! کیوں..........؟'' پھر نرس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے۔

''مجھے کیا ہوا...........؟''

''نہیں نہیں! بس میں ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔

''اصل میں مجھے آج صبح سے ہی ہلکا ہلکا بخار ہے۔ سوچی تھی کہ آخر میں آپ کو دکھا لوں گی۔''

پانچ سالوں سے وہ نرس کا کام کر رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کپل کو کوئی ایسا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اُس کے لئے کوئی دوا تجویز کرتے۔

ڈاکٹر کپل پہلے چونکتے ہیں۔ پھر مذاق کے موڈ میں خود کو تبدیل ہوتا دیکھ کر مسکراتے ہیں۔

''رینوکا جی! اگر ڈاکٹر اور نرس بھی بیمار پڑنے لگیں تو پھر سماج کا کیا ہوگا......؟''

کچھ وقفے کے بعد۔'' ہلکے پھلکے بخار کا ڈاکٹر تو ہر کوئی ہوتا ہے۔ تم خود سے ہی کوئی دوا لے لیتی۔''

''ہاں کوئی دوا لے تو سکتی تھی۔ لیکن.........؟'' ہونٹوں پر مسکُراہٹ کی لالی سجائے وہ آگے بڑھی۔'' لیکن آج جب میں نے اِتّو ویٹو آئیڈیاز کے ساتھ مریضوں کا علاج کرتے آپ کو دیکھا تو سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ کیوں نہ ہم بھی اس نئے طریقہءعلاج کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ سے اپنا کیس ہسٹری بنوالیں۔''

''ڈاکٹر کپل کو آج رینوکا داس کی بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ ویسے رینوکا

داس بولتی بہت کم تھی۔لیکن جس طرح سے اُس نے آج اپنی بیماری کے سلسلے میں ڈاکٹر کپل سے بات کی تھی وہ فوری طور پر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

’’تمہارا مطلب.........؟‘‘

میں نے دیکھا کہ آج آپ مریضوں سے مرض کے بارے میں کم اور ریئلیٹی شو کے بارے میں زیادہ سوال کر رہے تھے۔‘‘ وہ بولتے بولتے مسکرانے لگتی ہے۔’’یہ علاج کا کوئی خاص طریقہ ہے کیا سر.........؟‘‘

ویسے ڈاکٹر کپل نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رینو کا داس اُس سے اِس طرح کے سوال بھی کرسکتی ہے۔اِس لئے اُنہوں نے جواب دینے میں تھوڑا سا وقت لیا۔

’’ہر زمانے میں ڈاکٹروں کا طریقۂ کار الگ رہا ہے۔اور پھر یہ تو ریئلیٹی کا زمانہ ہے۔جس طرح زہر زہر کو کاٹتا ہے اُسی طرح ریئلیٹی جیسی بیماری میں ریئلیٹی کا انجیکشن ہی کام آتا ہے.........ویسے رینو کا جی! اِس سلسلے میں، میں آپ سے آج کل میں بات کرنے والا تھا۔اچھا ہوا کہ آپ نے خود سے بات چھیڑ دی۔‘‘ کرسی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے۔

’’چلو پہلے بیٹھو پھر بتاتا ہوں کہ علاج کے اِس نئے طریقۂ کار کی اہمیت وافادیت کیا ہے۔‘‘

رینو کا داس کے لئے ان پانچ سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اِس طرح سے ڈاکٹر کپل سے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے جارہی تھی۔ویسے مریضوں کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر کپل رسماً اُن سے حال چال پوچھ لیا کرتے تھے۔

’’کیسی ہو رینو کا.........؟‘‘

لیکن آج اُنہیں یہ سب پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔کیوں کہ اِس سے پہلے رینو کا نے انوکھے طریقۂ علاج اور کیس ہسٹری کے مدِّ نظر اُن سے ہی طبیعت پوچھ لی تھی۔جواب میں ڈاکٹر کپل نے جب زہر سے زہر اور ریئلیٹی سے ریئلیٹی کی بات کی تب رینو کا داس کے چہرے پر بےاطمینانی کی لہر دوڑ گئی، جسے ڈاکٹر کپل کی آنکھوں نے بھی محسوس کیا۔

کرسی پر رینو کا داس کے بیٹھتے ہی ڈاکٹر کپل نے کلائی کو ہاتھوں میں لے کر نبض کی

رفتار کو گھڑی کی سوئی کے ساتھ دوڑانے کی کوشش کی۔کون کس سے آگے نکل رہا ہے یہ دیکھے بغیر اُنہوں نے سوال کر دیا۔جس کا تعلق نہ ہی نبض سے تھا اور نہ ہی گھڑی سے۔

’’بچّے کتنے ہیں ....؟‘‘

’’دو____ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔‘‘

’’کتنے بڑے ہیں دونوں.........؟‘‘

’’لڑکا سات سال کا اور لڑکی چار سال کی۔‘‘

’’دونوں کو کیا بنانا چاہتی ہو____؟‘‘

’’پہلے چاہتی تو کچھ اور تھی۔لیکن.........‘‘ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے آگے کہا۔’’اب چوں کہ زمانہ بدل رہا ہے۔اور بدلتے زمانے کے ساتھ بدل جانے میں ہی بچوں کی بھلائی ہے، اِس لئے لڑکے کو ڈانسر اور لڑکی کو سنگر بنانا چاہتی ہوں۔کیوں ٹھیک ہے نا سر.........؟‘‘ رینو کا داس نے سر ہلا کر اس طرح پوچھا جیسے بچّوں کو اِس لائن میں ڈال کر اُس نے مستقبل پر کمندیں ڈال دی ہوں۔

یہ سنتے ہی ڈاکٹر کپل کے ہاتھ کی پکڑ اُس کی نبض پر ڈھیلی پڑ گئی۔اُس وقت اُن سے کوئی جواب نہیں بن پایا تھا.........کیوں کہ سوال کے جس گربھ میں جواب پوشیدہ تھا، اُس کے اندر حرکت تو ہو رہی تھی لیکن تولّد ہونے کا جو درد تھا اُس میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

اُس وقت تک رینو کا داس اُن کے اندر کی اِس حرکت سے بالکل لاعلم تھی۔

انتظار کے بعد جواب نہیں آیا تو مسکراتے ہوئے اُس نے سوال کا سرا ہی بدل دیا۔

’’آپ کیا بنا رہے ہیں سر اپنی پیاری بٹیا کو.........؟‘‘

ڈاکٹر کپل اِس سوال پر پہلے کچھ دیر خاموش رہے۔اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔اِس کوشش کے نتیجے میں ذہن پر ایسا دباؤ پڑا کہ گربھ کی حرکت میں خود بخود اضافہ ہوتا چلا گیا۔اور پھر آہستہ آہستہ درد اُن کے گربھ سے ہوتا ہوا اُن کے شریانوں کے راستے پورے جسم میں پھیل گیا۔آخر کار درد اتنا بڑھا کہ آواز کا غبارہ باہر نکلتے ہی نوکیلے

دانتوں کی زد میں آ کر پھٹ پڑا۔

’’میں کیا بنا رہا ہوں اپنی بیٹی کو یہ پوچھنے والی تم ہوتی کون ہو.........؟‘‘ ڈاکٹر کپل غُصّے میں ریوالونگ چیئر سے اُٹھ کھڑے ہوئے ۔’’تمہاری ہمّت کیسے ہوئی یہ پوچھنے کی ....؟‘‘ اُن کی سُرخ سُرخ آنکھیں چشمے کے لینس سے ٹکرا کر تھری ڈی کی طرح باہر نکل آئی تھیں ۔اُس وقت رینوکا داس کے گمان بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر کپل کبھی اُس سے اِس طرح کا برتاؤ کریں گے۔

’’ساری سر! مجھ سے غلطی ہوگئی.........‘‘

رینوکا داس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس سے کیا غلطی ہوئی۔ اِس کے بعد بھی اُنہوں نے معافی مانگ لی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اگر اُس نے بحث ومباحثے میں وقت ضائع کیا تو نقصان اُسی کا ہے۔ اِس لئے جلد سے جلد چیمبر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ نکلنے کی کوشش بھی کی۔لیکن ڈاکٹر کپل سامنے آ گئے اور راستہ روک لیا۔

’’غلطی ہو یا نہ ہو، تمہیں کل سے کلینک آنے کی ضرورت نہیں ہے.........‘‘ آواز میں کپکپاہٹ تھی۔’’اور ہاں !اس ماہ کی تنخواہ لیتی جاؤ.........تا کہ بچّوں کو کتاب کاپی کے بجائے .... پاؤں میں باندھنے کے لئے گھنگھرو.........اور گلے میں لٹکانے کے لئے ہارمونیم خرید کر دے سکو۔‘‘

غصّے سے وہ تھر تھر کانپ رہے تھے ۔اُسی حالت میں اُنہوں نے سامنے رکھی الماری کو کھولا اور اُس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر رینوکا داس کو ایک جھٹکے میں پکڑا دیا۔

اِس ماہ کے ابھی پندرہ دن ہی گذرے تھے ۔لیکن ڈاکٹر کپل نے پورے ماہ کا پیسہ دے کر اُن کی چھٹّی کر دی تھی ۔ وہ پیسہ لینا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ بولنا چاہتی تھی ۔لیکن ڈاکٹر کپل کے غصّے کو دیکھتے ہی چپ کا تالا لگ گیا۔ وہ حیرت و اِستعجاب میں کچھ دیر ڈوبی رہی۔ چیمبر سے کیسے باہر نکلی۔ ڈاکٹر کپل شٹر گرا کر کب وہاں سے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔ اُسے

کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ اور جب پتا چلا تو اُس کے سامنے آس پاس کے دکان دار کھڑے تھے۔ یہ جاننے کے لئے کہ نرس رینوکا داس نے وہ کون سا گناہِ عظیم کیا کہ ڈاکٹر کپل نے اُسے نوکری سے نکال دیا۔ پھر بھیڑ سے اُبھرنے والی سرگوشیاں اُسے ہی مجرم کے کٹگھرے میں کھڑا کر رہی تھیں۔

’’مرغا سمجھ کر سالی شادی کی چھُری سے حلال کرنا چاہتی ہوگی.........‘‘

’’ارے اِن کے یہاں حلال نہیں جھٹکے کا رواج ہے.........‘‘

وہ بغیر کسی کا جواب دیئے گھر جانے والی سڑک پر تھکے ہوئے قدموں کے سہارے اپنے مردہ جسم کو گھسیٹتی رہی۔ خود کو کوستی رہی کہ اُسے خواہ مخواہ بیمار پڑنے کی ضرورت کیا تھی؟.........وہ اپنی بیٹی کو کیا بنا رہے ہیں مجھے اس سے کیا مطلب تھا۔ نہ ہی یہ سب میں جاننے کی کوشش کرتی اور نہ ہی وہ مجھے نوکری سے نکالتے۔

☆☆☆

6

رئیلیٹی شو اور رنگین چشمہ

قارئین!

وقت نے شوبھا کی آنکھوں میں رئیلیٹی شو کا ایسا رنگین چشمہ لگا دیا تھا کہ روشنی سے شرابور اسٹیج پر چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ہونٹوں سے نکلتے مدُھر گیت اور گیتوں پر تھرکتے پاؤں اور وی آئی پی باکس میں سج دھج کر بیٹھی عورت اور اُس کے چہرے پر جیت کی بھینی بھینی خوشبوؤں میں لپٹی مسکراہٹ اور اُس مسکراہٹ کی دبیز تہہ سے جھانکتا زندگی کا وہ سارا حُسن جو میڈیا کی چکا چوندھ نے عطا کیا تھا، اِس کے سوا اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

آہستہ آہستہ یہی سب کچھ اُس کی زندگی کا حصّہ بن گیا۔ اب وہ پریتی کو بھی ڈانس کے گُر سکھا کر منچ پر اُتارنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ بھی وی آئی پی باکس کا حصّہ بن سکے۔ وہ بھی کیمرے کے مرکز میں سمٹ سکے۔ اُس کے چہرے پر بھی جلتے بجھتے قمقمے آنکھ مچولی کا کھیل کھیلیں اور اُس کے چہرے پر بھی جگنوؤں جیسی ٹمٹماہٹ ہو۔ پریتی کے پرفارمینس پر اُس سے بھی انٹرویو لئے جائیں۔ اِدھر پریتی ٹیلینٹ کا پرچم لہرائے اور اُدھر لاکھوں کروڑوں کا چیک اُس کی گود میں آ کر گرے۔

خواہشات کے اِنہی پاؤں پر چلتے ہوئے ایک دن شوبھا ہاتھ میں مٹھائی کا پیکٹ لئے جونیئر انجینئر دلیپ شرما کے گھر پہنچ گئی تاکہ اُن کی پتنی سے دوستی بڑھا کر، کمپٹیشن جیتنے کے فارمولے اُڑا سکے۔ ضرورت پڑنے پر حُسن کے امتحان میں نقل کروا کر پریتی کو اتنے نمبر دلوا سکے کہ وہ کنول کی طرح ''رئیلیٹی شو'' جیت سکے۔

مسیز شرما سے ملنے کے لئے شوبھا نے وقت کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا کہ اِس سے پہلے دوستوں، رشتہ داروں اور سیاسی لوگوں کے ساتھ ساتھ میڈیا والے انٹرویو کے

لئے پہنچیں، وہ اُس کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر قابض ہو جانا چاہتی تھی۔

کال بیل کی مدُھر آواز گونجتے ہی مسیز شرما نے دروازہ کھولا۔

شوبھا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اُسے نمسکار کیا۔

مسیز شرما پہلی نظر میں شوبھا کو پہچان گئی۔ پھر بھی انجان بنی رہی۔

''جی آپ کون......؟''

''میسیز شرما! آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں......''

''جی کہیں دیکھا تو ضرور ہے۔ شاید اِسی کیمپس میں کہیں.........''

''جی جی! آپ نے ٹھیک پہچانا۔ میں آپ کی پڑوسن........ڈاکٹر کپل سنگھ کی مسیز شوبھا کپل........''

''اچھّا اچھّا! آپ وہ ہیں جن کے یہاں قریب ایک سال پہلے کنول کو گود میں اُٹھائے روتی ہوئی دوا لینے گئی تھی اور آپ نے اندر سے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

مسیز شرما کو یکایک وہ دن یاد آ گیا تھا جس دن وہ رات کے بارہ بجے ایک پارٹی سے لوٹی تھی۔ کنول کو بدہضمی سی ہو گئی تھی۔ اس نے دو تین اُلٹیاں کی تھیں۔ اُس رات مسٹر شرما کہیں آفیسیل کام سے شہر سے باہر تھے۔ اِس لئے وہ خود ہی اُسے اٹھائے ڈاکٹر کپل کے یہاں پہنچ گئی تھی۔ لیکن.........؟

''مسیز شرما یقین مانو میرے پتی گھر پر نہیں تھے۔ بولو تو قسم کھاتی ہوں کہ اُس رات سچ مچ میں وہ کلینک میں ہی رہ گئے تھے۔'' شوبھا جھوٹ کے پکڑے جانے اور کام کے بگڑ جانے کے خوف سے گھبرا گئی تھی۔ اِس لئے اُس وقت وہ قسم پر قسم کھاتی چلی گئی۔

''کلینک میں ....''، قسم کے باوجود مسیز شرما کے نتھنوں سے جھوٹ کی بُو اِس طرح ٹکرائی جیسے لائی ڈیٹیکٹر مشین نے اُس کے دل کی دھڑکنوں کو ریکارڈ کرنے کے بعد زور سے ڈکار لی ہو۔

شوبھا کو جب اِس غلطی کا احساس ہوا کہ اُسے کلینک کی جگہ نرسنگ ہوم کہنا چاہئے

تھا،تب وہ فوراً بات بدل دیتی ہے۔

''نہیں نہیں نرسنگ ہوم میں.........اکثر رات میں ایمرجنسی ڈیوٹی اُن کی وہاں رہتی ہے۔''

بات کی ڈور کو سلجھاتے ہوئے وہ پریتی کو آگے کر دیتی ہے۔

''یہ ہے میری بیٹی پریتی.........'' پھر اصل بات پر آجاتی ہے۔'' دو دن سے ٹی وی میں کنول کے ڈانس کے خوب چرچے ہیں۔چمپیئن شپ جیت کر اس نے ہم سبھوں کا جو گورو بڑھایا ہے وہ کسی سپنے جیسا ہے.........'' پھر مسکراتے ہوئے۔'' پریتی اخبار میں کنول کی تصویر دیکھ کر ضد کرنے لگی کہ مجھے ابھی کنول دیدی کے پاس لے چلو۔اب بچّوں کی ضد تو رکھنا ہی پڑتی ہے نا.........؟'' شوبھا مسکراتے مسکراتے بچّوں کی ضد والی بات پر ایسی مسکین صورت بنالیتی ہے کہ مسیز شرما کو ترس آجاتا ہے۔

''اچھّا۔اچھّا تو پھر اندر آئیے۔''

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شوبھا چہکنے لگی۔''مسیز شرما! پہلے کنول بٹیا کو تو بلایئے تا کہ اُسے مبارکباد دوں۔اُس کا منہ میٹھا کروں.........''

''بٹیا کنول! دیکھو کون آیا ہے تم سے ملنے .....''مسیز شرما نے وہیں سے آواز لگائی۔

کنول ابھی کچھ دیر قبل ہی اُٹھی تھی اور ابھی فریش ہو کر اخبارات میں اپنی تصویریں دیکھ رہی تھی کہ ماں کی آواز سُن کر چونکی۔لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ نانا نانی جس ٹرین سے آرہے ہیں اُس کے آنے میں ابھی تین چار گھنٹے کا وقت ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی جیت کی خوشی بانٹنے کے لئے دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم تک آئی۔لیکن جیسے ہی اُس کی نظر شوبھا اور پریتی پر پڑی وہ دروازے کے سامنے رک گئی۔شوبھا نے بڑھ کر پیار سے اُسے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کی۔لیکن کنول بہت اصرار کے بعد بھی وہیں منہ بنا کر کھڑی رہی۔

''جاؤ بیٹا! جاؤ.........کتنے پیار سے انٹی تمہیں اپنے پاس بٹھا رہی ہیں۔جیت کی خوشی میں تمہارے لئے مٹھائی بھی لائی ہیں.........''

''مجھے نہیں کھانا ہے میٹھائی ویٹھائی.........یہ گندی انٹی ہیں۔ایک دن اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر کر دیا تھا۔

''خبردار! جو دوبارہ پریتی کو بلانے آئی۔تم ٹھہری جونیئر انجینئیر کی بیٹی اور اِس کے پاپا کیا ہیں جانتی ہو.........؟ ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر.........اپنے برابر کی لڑکیوں کے ساتھ دوستی کیا کرو.........سمجھی نیچ لڑکی.........؟'' زور سے کان کھینچتے ہوئے اُنہوں نے مجھے دھکّا دیا تھا اور میں وہیں گر پڑی تھی۔''

شوبھا کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کنول سال بھر قبل ہوئی اِس بات کو بھولی نہیں ہوگی۔لیکن اُسے اپنے پیار اور مٹھائی پر اتنا بھروسہ تھا کہ جیسے ہی وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جیت کی خوشی میں اُس کا مُنہ میٹھا کروائے گی، وہ ساری کڑواہٹ کو بھول کر اُس کی گود میں بیٹھنے کے لئے تیاّر ہو جائے گی۔لیکن کنول کے منفی رویّے سے کچھ حد تک اُس کے چہرے پر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔اِس پر قابو پانے کے لئے اُس نے اپنی طرف سے انتھک کوشش کی۔

''مسیز شرما! یہ کیا کہہ رہی ہے اپنی کنول بٹیا.........؟ میں نے اُس دن کان ضرور پکڑے تھے۔لیکن پیار سے۔اور یہ کہا تھا کہ تم انجینئیر کی بیٹی ہو اور پریتی ڈاکٹر کی۔تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کھیلا کرو۔اور جب بھی یہاں آؤ اپنی ممّی کو ساتھ لیتی آؤ۔ہم لوگ مل بیٹھ کر باتیں کریں گے تب تک تم دونوں بھی آپس میں کھیل کود اور موج مستی کرتے رہنا۔لیکن اِس نے میرے پیار کو غلط سمجھ لیا'' شوبھا نے جھوٹ کے لفظوں پر سچ کی پالش کر کے اِس طرح چمکانا چاہا کہ مسیز شرما اُس میں کھو جائے۔

''نہیں ممّی! انٹی جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''نہیں بیٹا! تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' پھر شوبھا، مسیز شرما کی طرف

دیکھتے ہوئے بولی ۔ ’’آپ یقین جانیئے میں کنول کو اتنا پیار کرتی ہوں جتنا پریتی کو اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ میری پریتی کنول کی طرح ہی بنے ۔ کنول سے اُسے انسپائریشن ملے ۔‘‘

جھوٹ کے اُن لفظوں پر چڑھے سچ کی پالش کو اس بار شوبھا نے انسپائریشن کی دھوپ دکھا کے اُس کی چمک میں اور بھی ستارے ٹانکنے کی کوشش کی تا کہ اُس چمک میں مسیز شرما کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں ۔

’’بیٹا کنول ! پریتی انٹی کی بات سننے کے بعد اب تو ساری غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی........بیٹا ! تمہاری خوشی پر تمہیں ڈھیروں مبارک باد دینے آئی ہیں ۔ قبول کرو اور سارے گلے شکوے ختم کر کے وہ ٹرافی، سرٹی فکیٹ، البم اور گفٹ لا کر دکھاؤ جو تمہیں ملے ہیں۔‘‘ مسیز شرما نے کنول کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

پریتی پہلے تو مُنہ بناتی ہے۔ پھر ماں کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے کمرے میں جاتی ہے اور کچھ ہی دیر میں وہ سب کچھ لے کر باہر آتی ہے ۔ دیکھنے اور دکھانے کے درمیان شوبھا اُسے میٹھائی پر میٹھائی کھلاتی ہے۔ گود میں بٹھا کر بہت دیر تک پیار کرتی ہے۔ ڈھیر ساری دعائیں دیتی ہے.......... بالآخر اِن دعاؤں کا اثر کنول پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیتے دنوں کی ساری کڑواہٹ کو بھول کر پریتی کو اپنے کمرے میں لے جاتی ہے۔ پھر دونوں گڈّا گڈّی کے کھیل میں مصروف ہو جاتی ہے ۔ رئیلیٹی شو یا ڈانسنگ کمپٹیشن کے متعلق نہ ہی پریتی نے اُس وقت کچھ پوچھا اور نہ ہی کنول نے کچھ بتانا ضروری سمجھا ۔ اِس اثناء میں دونوں نے کھیل ہی کھیل میں گڈّا اور گڈّی کی شادی بھی رچائی۔

اِس کھیل میں کنول کو بہت مزا آیا تھا ۔ گڑیا کی رُخصتی پر اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے۔

’’تم رو رہی ہو........؟‘‘ پریتی نے اُس کی آنکھوں کے کنارے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

’’میری گڑیا کی شادی جو ہو گئی ہے۔ اب تو وہ مجھے چھوڑ کر اپنے سسرال چلی

جائے گی۔‘‘ کنول نے مسکرانے کی کوشش کی۔

’’ارے میں تو بس یوں ہی گڈّے کی ماں بنی تھی ۔ میں تمہاری گڑیا تھوڑی لے جاؤں گی ۔ وہ تو تمہارے پاس ہی رہے گی۔‘‘ پریتی نے اُسے سمجھایا۔

’’نہیں، نہیں.......اب تو اُس کی شادی ہو گئی ہے ۔ اُس کا سسرال تو تمہارا گھر ہے ۔ اِس لئے تمہیں وداع کر کے تو لے جانا ہی ہوگا۔‘‘

پھر کنول نے پریتی کے ایک ہاتھ میں گڈّا اور دوسرے ہاتھ میں گڈّی پکڑا دی۔

دوسری طرف ڈرائنگ روم میں نوکرانی چائے کی ٹرے لے آئی تھی۔ شوبھا چائے کی پہلی چسکی کے ساتھ ہی اپنی شرمندگی کو پی جانا چاہتی ہے۔

’’مسیز شرما ! اگر انجانے میں مجھ سے کوئی بھول چوک ہوئی بھی ہو تو اُسے درگذر کریں گے ۔ ویسے میں نے کبھی کنول کو.........؟‘‘ پھر دوسری چسکی لیتے ہوئے بولی۔’’ اب کنول صرف آپ کی نہیں پوری سوسائٹی کی عزّت ہے..........اور آپ ہم سب کے لئے ایک ’آدرش ماں‘ ہیں۔‘‘

’’اِس حوصلہ افزائی کے لئے بہت بہت دھنیہ واد شوبھا جی.........‘‘ مسیز شرما نے مسکراتے ہوئے اپنے ہی انداز میں اُس کا شکریہ ادا کیا۔

پھر بات ہی بات میں شوبھا نے مسیز شرما سے کنول کی تیاریوں کے متعلّق اتنی ساری جانکاری حاصل کر لی کہ ضرورت پڑنے پر وہ پریتی کے اندر سارے گُر انڈیل کر اُسے ڈانسنگ تالاب میں کنول کی طرح کھلا سکے.........خود مسیز شرما کا روپ دھارن کر کے زندگی کی اُونچی اڑان کے لئے اپنی خواہشات کو نئے پنکھ دے سکے تا کہ خواب دیکھنے سے پہلے ہی اُس کی تعبیر آنکھوں میں ستارے بن کر جھلملانے لگیں۔

☆☆☆

7

رات، پارٹی اور ڈانس کا مِینو

قارئین!

اِس کے دوسرے ہی دن ڈاکٹر کپل کے اِنکار کے باوجود شوبھا نے شرما پریوار کو اپنے یہاں پارٹی پر بُلا لیا۔ اِس کے ساتھ ہی ساتھ اُس نے اپنی آٹھ دس سہیلیوں کو مدعو کر کے پارٹی کی شان میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

دیر رات تک پارٹی چلی۔

ڈاکٹر کپل اِس طرح کی پارٹی کے حق میں نہیں تھے۔ اِس لئے وہ صرف شامل ہی نہیں ہوئے بلکہ اُس رات غصّے میں گھر بھی نہیں آئے۔

شرما جی یوں تو اِس پارٹی میں درجنوں گوپیوں کے درمیان اکیلے کرشن کنہیا بنے بیٹھے تھے۔ اُنہیں بہت اچھّا لگ رہا تھا۔ شوبھا اُن کی خوب آؤ بھگت کر رہی تھی۔ سہیلیاں بھی مسٹر شرما! مسٹر شرما کر کے چھیڑ رہی تھیں۔ لیکن چھیڑ چھاڑ میں جب درجنوں گوپیوں کے درمیان رہنے والے شرما جی کی بانسری کی آواز ماند پڑنے لگی تو وہ دُعا کرنے لگے کہ ڈاکٹر کپل کلینک سے جلد آجائیں تاکہ وہ ایک سے دو ہو جائیں۔ پھر دونوں گوپیوں پر بانسری کا ایسا جادو چلائیں گے کہ وہ سب کی سب مبہوت ہو کر اس کے اِرد گرد سمٹ آئیں گی۔ اِس لئے اُس رات کئی بار شرما جی نے شوبھا سے پوچھا تھا۔

''شوبھا جی! کیا بات ہے ڈاکٹر کپل ابھی تک نہیں آئے۔ فون کر کے ذرا معلوم کر لیں.........اور اُنہیں کہئے کہ جلد آئیں۔ میں اُن کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں۔''

مسٹر شرما کے بار بار اِس طرح سے پوچھنے پر وہ یہی کہتی رہی۔ ''بس کچھ ہی دیر میں آجائیں گے۔ فون پر بات ہوئی ہے۔ لیکن کھانے سے ٹھیک پہلے شوبھا نے کہا.........

''ابھی میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نکل ہی رہے تھے کہ ایک ایمرجنسی کیس آگیا۔ کہہ

رہے تھے کہ کیس ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ جونیئر ڈاکٹروں کے بھروسے نہیں چھوڑ سکتے۔ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اِس لئے اُنہیں رات بھر نرسنگ ہوم میں ہی رہنا پڑے گا۔''

کان سے موبائل لگا کر اُنہوں نے کچھ اِس صفائی سے جھوٹ پر سچ کا ملمّع چڑھایا کہ مسٹر شرما کو سچ کا گمان ہوا۔

شوبھا نے یہ پارٹی ڈاکٹر کپل کی مرضی کے خلاف دی تھی۔ پارٹی کو لے کر دونوں کے درمیان کہا سُنی بھی ہوئی تھی۔

''اُس کی بیٹی نے ایسا کون سا کام کیا ہے کہ اُس کے بدلے اُس کے سارے پریوار کو کھانے پر بُلا رہی ہو۔ ارے لڑکی نے ڈانس ہی تو کیا ہے۔ اگر بہت کرنا ہے تو دو چار چاکلیٹ اُس بچّی کو لے جا کر دے دو۔''

لیکن شوبھا بیٹی کے بجائے ممّی اور پاپا کو خوش کرنا چاہتی تھی تاکہ آگے بڑھنے کے راستے ایک ایک کر کے کھُلتے چلے جائیں۔ ضرورت پڑے تو مسیز شرما کا استعمال کر لیں اور اگر اس کی غیر موجودگی میں مسٹر شرما نے فراخ دلی دکھائی تو اُسے بھی کام پر لگایا جا سکے۔

لیکن پارٹی کے سلسلے میں گذشتہ رات ہی ڈاکٹر کپل نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں اُس رات پارٹی میں ہی نہیں، گھر بھی نہیں آؤں گا۔ کلینک، نرسنگ ہوم یا پھر کہیں بھی سو جاؤں گا۔''

لیکن شوبھا کو اِس کے کہیں بھی سونے پر بھلا اعتراض کیوں ہوتا.........؟ وہ خود بھی پارٹی سے اُنہیں دور رکھنا چاہتی تھی۔ اِس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ پارٹی کا حصّہ بنے تو پھر کوئی بھی کھُل کر انجوائے نہیں کر پائے گا۔ پارٹی کا ستیہ ناش ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ چُپّی سادھ لی کہ کہیں بھی سوئے۔ لیکن پارٹی پورے شباب میں چلنی چاہئے۔

کھانے سے پہلے ڈرائنگ روم کے سرخ کارپیٹ پر کنول نے اپنا وہ بیسٹ پرفارمینس (منّی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لئے) پیش کیا۔ جس کی بنیاد پر اُسے ڈانس کی

لِٹل کوئین کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔اِس کے بعد شوبھا نے پریتی کو''شیلا کی جوانی'' جیسے گیت پر ڈانس کرنے کے لئے کہا۔آخر میں شوبھا نے''چولی کے پیچھے کیا ہے....؟'' جیسے گانے پر جسم کے ایک ایک حصّے کو تھرکا کر ڈانس کے تئیں اپنی دیرینہ محبّت کے خزانے لٹائے۔

تالی ،قہقہے، اور ہنگاموں کے تال پر تھرکتے ہوئے سبھی ڈائننگ ٹیبل تک پہنچے۔شادی کے بعد پہلی بار داماد کی آمد یا بہت ہی اہم وی آئی پی گیسٹ کے لئے جس طرح کا اہتمام ہوتا ہے کچھ ویسا ہی انتظام شوبھا نے شہر کے مشہور ریسٹورینٹ کے حوالے کیا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر ریسورینٹ کے بیرے نے اپنے ہاتھوں سے ہی کھانا سروکیا۔ سب نے سیر ہوکر کھایا۔مسیز اور مسٹر شرما نے کھانے کی تعریف کی۔آخر میں سویٹ ڈش کا دور چلا۔اِس دوران جب سب کے ہونٹ سویٹ سویٹ تھے تبھی شوبھا کے اصرار پر مسیز شرما نے اُن کی پریتی کے لئے فیوچر پلان تیار کیا۔

اِس نئے فیوچر پلان کے مطابق دوسرے دن مسیز شرما کے ہمراہ شوبھا اُس مشہور ڈانسنگ اسکول کی زیارت کو پہنچی جہاں سے کنول نے ٹریننگ لی تھی۔مسیز شرما نے اپنے اثرورسوخ کا خوبصورت استعمال کیا تو پریتی کو بہت آسانی سے وہاں ایڈمیشن مل گیا۔

''پرنسپل صاحب! کنول کی طرح پریتی کو بھی میری ہی بیٹی سمجھئے۔جس طرح کی اسپیشل ٹریننگ آپ دے سکتے ہیں دیجئے گا۔پیسے کی ذرا بھی فکر نہیں کیجئے گا۔کیوں شوبھا ....؟''مسیز شرما نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجّہ بناتے ہوئے ترچھی نگاہ سے شوبھا کی طرف دیکھا۔

چھجّے دار ہاتھوں کے نیچے سے جھانکتی دو ترچھی آنکھوں کی زبان سے شوبھا واقف تھی۔اِس لئے وہ ایک قدم آگے بڑھ کر پرنسپل صاحب کے کچھ اور نزدیک ہوگئی۔

''جی پرنسپل صاحب! آپ پریتی کو بس ایک کامیاب ڈانسر بنا دیں۔اِس کے عِوض آپ مجھ سے روپیہ پیسہ، زمین جائداد........اور اس کے علاوہ بھی کچھ مانگیں گے تو وہ بھی میں دینے کے لئے تیّار ہوں۔''یہ کہتے ہوئے نظریں خود بخود جھُک گئیں۔

''بہت خوب........'' چشمہ اُتارتے ہوئے۔''ہم لوگ بس گارجین میں یہی دیکھتے ہیں کہ کس میں کتنا جنون ہے کہ مقصد کی حصولیابی کے لئے ضرورت پڑنے پر وہ اپنا سب کچھ تیاگ سکے........'' شوبھا کی آنکھوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے۔''آپ کی آنکھوں میں مجھے وہ سب کچھ نظر آرہا ہے........بس شوبھا جی! یوں سمجھئے کہ آپ کی بیٹی ڈانس کی دنیا میں برسوں راج کرنے والی ہے۔کیوں کہ ہمارے یہاں ایک سے ایک ڈانس ماسٹر ہیں۔''

پھر پرنسپل نے پریتی کا ہاتھ پکڑ کر پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اُسے اپنی کرسی پر بٹھالیا۔

''نام کیا ہے تمہارا ....؟''

''پریتی سنگھ۔''

''کس نے رکھا........؟''

''پاپا نے۔''

''نہیں ،نہیں پرنسپل صاحب !اسے کیا پتا........؟ یہ نام میرا رکھا ہوا ہے۔اِس کے گال پر پریتی زِنٹا کی طرح ڈِمپل بنتے ہیں۔اس لئے میں نے یہی نام رکھ دیا۔اصل میں وہ میری فیوریٹ جو ہے۔''

''لیکن آپ کی فیورٹ کون ہے........؟''مذاقیہ انداز میں شوبھا نے پرنسپل صاحب سے پوچھا۔

''بہت ساری ....لیکن سچ بات یہ ہے کہ آپ کی پریتی آج سے ہی میری فیوریٹ ہوگئی ہے۔اِس کا فزک ڈانس کے لئے ایک دم پرفیکٹ ہے۔''

پھر پرنسپل صاحب نے پریتی کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''پریتی !تمہاری پریکٹس کل سے شروع ہو جائے گی۔تم دیکھ رہی ہو نا کہ تمہاری ممّی تمہارے لئے کتنی فکر مند ہیں۔اِس لئے تمہیں ڈانس میں بہت محنت کرنی ہے۔اور ہاں یہاں آنے سے پہلے جوس اُوس پی لیا کرنا تا کہ ہڈّی وڈّی مضبوط ہو سکے۔''

پھر شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے سے اُنہوں نے آگے کہا۔

’’اب اِس کے ڈائٹ کے لئے جو مینو پروسپیکٹس میں لکھا ہے اُس کے مطابق ہی آپ سب کچھ دیں گی۔اور ٹائم ٹو ٹائم یہاں آتی بھی رہیں گی۔تا کہ آپ کو فیڈ بیک بھی ملتا رہے اور ہماری شوبھا بھی بڑھتی رہے۔‘‘ گولڈن فریم کے چشمے کو چہرے سے الگ کرتے ہوئے اس بار پرنسپل صاحب نے شرارتی آنکھوں سے شوبھا کو اُوپر سے نیچے تک جیسے ہی دیکھا مسیز شرما سے رہا نہیں گیا۔

’’واہ پرنسپل صاحب واہ!.......لیکن شوبھا کی شوبھا بڑھانے میں اِس شوبھا کو مت بھول جایئے گا، کیوں کہ اِس نے بھی دو تین سال آپ کی شوبھا بڑھائی ہے۔‘‘

مسیز شرما نے خود کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بات ختم کی تو پرنسپل صاحب کنول کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے اور رازدارانہ انداز میں بولے۔

’’مسیز شرما! آنے والے دو چار سالوں میں آپ کی شوبھا کا بھی کوئی جواب نہیں ہوگا۔‘‘

8

حُسن کی منڈی اور اے ٹی ایم کارڈ

قارئین!

شہر کے مشہور ڈانسنگ اسکول میں پریتی کا ایڈمیشن کے بعد جب شوبھا گھر پہنچی تو اُنہیں ایک طرح کی راحت کا احساس ہوا۔جیسے کہ ڈانسنگ کوئن وہ خود بننے والی ہے۔اُس وقت اُس کا جسم تھرکنے کے لئے بے تاب تھا۔میوزک آن کر کے کمر لچکانا شروع کر دیا تھا.........اُس کے اندر اتنی بھی سُدھ بُدھ نہیں تھی کہ ڈاکٹر کپل کی کھوج خبر کرے۔رات بھر وہ کہاں رہے ہیں.......کلینک،نرسنگ ہوم یا پھر اپنے دوست حامد کے گھر.........؟ فون کرنا بھی اُس نے گوارا نہیں سمجھا۔اور تو اور جب وہ مسیز شرما کے ساتھ پریتی کو لے کر ڈانسنگ اسکول کے لئے نکلی تو اُس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر وہ گھر آ گئے تو کیا ہوگا.........؟ وہ کہاں جائیں گے.........؟ کسی کو چابھی دینے کا خیال بھی اُسے نہیں رہا۔

اور خیال آتا بھی کیوں.........؟ وہ تو اچھّی طرح جانتی تھی کہ اِس عمر میں وہ کہاں جائیں گے.........؟ کون پوچھے گا اُنہیں...........؟ طوائف کے کوٹھے پر جا نہیں سکتے۔گھوم پھر کر اُسے اُسی کھونٹ سے بندھنے کے لئے آنا ہوگا، جہاں وہ اندھیرے میں جگالی کیا کرتے تھے۔

لیکن اتنا ضرور سوچا تھا کہ گھر آتے ہی آج وہ سب سے پہلے اُن سے بات کرے گی تا کہ بعد میں اُنہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ سب اُن کے علم میں نہیں ہے۔یا میں نے انہیں خبر نہیں کی۔

رات مضمحل تھی اور وہ پریشان.......

برسوں بعد آج اُسے ڈاکٹر کپل کے آنے کا انتظار تھا۔تا کہ وہ جلد سے جلد اپنا فرمان سُنا کر آرام گاہ کے مخملی بستر پر میٹھی نیند کا لُطف اُٹھا سکے۔

اِنتظار کی لمبائی سے وہ رات اور بھی مضمحل ہوگئی تھی۔

جب ڈاکٹر کپل کے تھکے ہوئے قدموں کی چاپ رات کے سینے پر اُبھری تو رات اُس کے وجود کو سمیٹے چُپ چاپ گیٹ کے اندر داخل ہوگئی، اور جب ڈرائنگ روم کے صوفے تک پہنچی تو یہاں تک آتے آتے رات اور بھی مضمحل نظر آنے لگی تھی۔

لیکن شوبھا کو نہ ہی ڈاکٹر کپل کے تھکے ہوئے قدموں کی چاپ سے مطلب تھا اور نہ ہی رات کے مضمحل ہونے کی فکر تھی۔ اور نہ ہی اُسے یہ جاننا تھا کہ وہ گذشتہ رات کہاں رہے......؟ اُسے تو صرف کپل کے آنے کا انتظار تھا۔ فرمان سنانے سے مطلب تھا ....

صوفے پر ڈاکٹر کپل کے دھنستے ہی اُنہوں نے قینچی جیسی زبان نکالی۔

''کل رات پارٹی سے خود کو الگ رکھ کو تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ مسیز اور مسٹر شرما انجوائے نہیں کر پاتے.........'' سامنے سے چہرے پر گر آئے کٹے ہوئے بالوں کی لٹ کو ایک ہاتھ سے کان کے اُوپر چڑھاتے ہوئے۔ ''اور ہاں! ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ بعد میں یہ مت کہنا کہ میں نے نہیں بتایا........''

بالوں کی لٹ ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے جھولنے لگی تھی۔ لیکن اِس بار کانوں پر ڈالنے کے بجائے انگلیوں سے چھلّے بناتے ہوئے بولی۔

''آج مسیز شرما کے ساتھ میں بھی ڈانس اسکول گئی تھی۔ بڑی مشکل سے پریتی کا ایڈمیشن بیس ہزار میں کروایا ہے۔ سنڈے سنڈے ایک ٹیچر کو بھی گھر پر بُلا لیا ہے۔ وہ مہینے میں صرف پانچ ہزار لے گا۔''

بالوں کو انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے شوبھا نے اُن کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے وہ اُن کی رضا نہیں، بلکہ فیصلہ مسلّط کر رہی ہو۔

''پانچ ہزار......؟'' ڈاکٹر کپل کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ....؟ صبح دس بجے سے دو بجے تک اور پھر پانچ بجے سے آٹھ بجے تک۔ یہاں تک کہ لنچ

کے ٹائم بھی نرسنگ ہوم میں بیٹھتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کما سکوں.........'' پھر حیرت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''تمہارے کہنے پر ہی باپ دادا کی نشانی کو اونے پونے میں بیچ کر میں اِس ہائی سوسائٹی میں رہنے آیا تاکہ پریتی کو ایجوکیشن کے لئے بہتر سے بہتر ماحول مل سکے۔''

''ایجوکیشن........؟'' وہ تیکھی ہنسی ہنستی ہے۔ ''جسے تم بھانڈ منڈلی سمجھتے ہو نا؟ اُس کا رُتبہ بڑے بڑے ایجوکیشنسٹ سے اُوپر ہے۔''

''تیرے سوچنے سے کسی نچنیا اور گویّا کا رتبہ اگر اُوپر ہو گیا تو دُنیا میں ہر روز ایک نئی سونامی سے لوگوں کا سامنا ہوگا۔''

ڈاکٹر کپل کی زبان پر آنے والی سونامی کو لفظوں کے رِکٹر اسکیل سے ناپا جا سکتا تھا
۔

لفظوں کی اِس سونامی میں جب شوبھا کو لگتا ہے کہ اِس کی آواز کی ناؤ تنکے کی طرح بہہ جائے گی تو وہ ساحل تک پہنچنے کے لئے چپّو زور زور چلانے لگتی ہے۔

''تم مانو یا نہیں مانو لیکن آج وہی نئی نسل کے آئیڈیل ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ آج کون ہے جو شاہ رُخ اور ایشوریہ کو نہیں جانتا........؟''

''جاننا الگ بات ہے۔'' ڈاکٹر کپل نے اپنی بات کو الگ طرح سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ویسے ایشوریہ کو تم دنیا کی سب سے خوبصورت عورت اور فلم کی سب سے کامیاب ہیروئن سمجھتی ہوگی۔ لیکن میری نظر میں اُس کی حیثیت دو کوڑی کی ہے........ حُسن کی منڈی میں اپنے انگوں کا پردرشن کر کے مِس ورلڈ کا خطاب جیتنے سے اگر تم سمجھتی ہو کہ اِس سے عورت کی عزّت بڑھتی ہے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔''

پھر ڈاکٹر کپل رک کر سوال کرتے ہیں۔

''یہ کیسی عزت جس کی بنیاد میں ہی ننگا پن ہو........؟''

شوبھا جب خود کو سرِعام ننگا ہوتے ہوئے دیکھتی ہے تو فوراً دفاعی تلوار لے کر کھڑی

ہو جاتی ہے اور اپنے آڑے ترچھے وار سے جسم کے کپڑے الگ کر کے اُسے بھی مادرزاد کر دینا چاہتی ہے تا کہ ایک ننگا دوسرے ننگے کو دیکھ کر ننگا نہ کہہ سکے۔

''تمہاری بنیاد میں کیا ننگا پن نہیں ہے ....؟ سیدھے کیا تم مریم کی کوکھ سے ٹپکے ہو........؟''

پھر اُسے سمجھانے کے انداز میں۔

''دیکھو بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم بس اتنا جان لو کہ گیت سنگیت اور ڈانس کی خوبصورت سڑک ہی فلم انڈسٹری تک جاتی ہے۔''

''جاتی ہے تو جائے۔ مجھے اِس سے کوئی سروکار نہیں۔''

ڈاکٹر کپل کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک طرح کی بے بسی بھی۔
لیکن وہ کسی بھی قیمت پر ہتھیار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

''لیکن مجھے تو ہے۔ کیوں کہ میری بیٹی خوبصورت ہے۔'' اس نے 'خوبصورت' پر زور دیا۔

''یہ خوبصورتی ہی ایک باپ کے لئے عذاب ہے۔'' جواب میں ڈاکٹر کپل نے باپ اور عذاب کو دانتوں سے چبا کر خوبصورتی کے زور کو کم کرنا چاہا۔

''لیکن میرے لئے یہی خوبصورتی آج ایک 'اے ٹی ایم کارڈ' ہے۔''

یہ کہتے ہی شوبھا کی معنیٰ خیز مسکراتی آنکھیں اے ٹی ایم مشین میں بدل گئی تھیں، جس کے اندر سے خوبصورتی کیش ہو کر نوٹوں کی شکل میں باہر نکل رہی تھی۔

ڈاکٹر کپل کو اب یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شوبھا کے لئے خوبصورتی کے کیا معنیٰ ہیں۔ اور جب بیٹی اے ٹی ایم کارڈ لگنے لگے تو پھر آپ چاہیں جتنے بھی پاس ورڈ بدل دیں، لیکن شوبھا جیسی عورت جسمانی سسٹم کو ہائیک کر کے سب کچھ کیش کرا لے گی۔

ڈاکٹر کپل یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کانپنے لگے۔ اُنہوں نے ایک نظر پریتی پر ڈالی جس کا ہاتھ شوبھا نے اب بھی زور سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں کی باتیں سُن رہی تھی

اور ساتھ ہی ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر دونوں آپس میں اِس طرح سے کیوں لڑ رہے ہیں۔؟

لیکن پریتی کا معصوم ذہن اِن باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کپل نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے نزدیک کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی پاپا کے پاس جانا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کی کلائی پر شوبھا کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت تھی۔ اس لئے وہ جا نہیں سکتی تھی۔

اے ٹی ایم والی بات پر ڈاکٹر کپل کے اندر کا اُبال جسم کے حصار کو توڑ کر جب باہر نکلنے کے لئے بے چین ہوا تو یہ بے چینی مُنہ کے راستے کچھ اِس طرح باہر نکلی۔

''یہ تو بہت ہی شرم کی بات ہے کہ تم 'ماں' ہو کر بیٹی کو اے ٹی ایم کارڈ سمجھ رہی ہو اور اُس کی خوبصورتی کو چیک کی طرح کیش کرانا چاہتی ہو۔''

ڈاکٹر کپل نے ''کیش'' پر زور دیتے ہوئے ماں کی عزّت کو للکارا تو ماڈرن دور کے فیمنزم کلچر کو (جسے آدھی دنیا قبول کر چکی ہے) شوبھا نے نئے سیناریو کے پیشِ نظر اپنی سوچ کی کیش بُک کو اِس طرح رکھا جیسے اُس پر کسی آڈِٹ کی ضرورت نہیں۔ تمام خامیوں سے پاک ہو۔

اس لئے وہ خود کو موردِ الزام کے کٹگھرے میں کھڑا نہ کر کے ڈاکٹر کپل کے ساتھ ساتھ مرد ذات اور وقت کو قصوروار ٹھہرانے لگی۔

''ٹی وی میں جتنے اشتہار آتے ہیں اُس میں پروڈکٹ چاہے سوئی ہو یا جہاز سب میں خوبصورت لڑکیاں ہی نظر آتی ہیں۔''

''اچھی آواز کیا صرف گوری چمڑی کے پاس ہوتی ہے........؟''

''تم نے کبھی کسی چینل میں کالی یا بدصورت لڑکی کو خبریں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے ....؟''

''میگزین کا کور ہو تو لڑکی۔''

''بینک کا کاونٹر ہو تو لڑکی۔''

''سیلز مین ہو تو لڑکی۔''

''پی اے ہو تو لڑکی۔''

''ہر فرم میں کمپیوٹر پر نازک انگلیاں تھرکاتی نظر آتی ہیں لڑکیاں۔''

''آج لڑکیاں ہی بازار کا بھاؤ طے کرتی ہیں۔''

''دنیا کی اِس ریئلیٹی سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جس کی بیٹی جتنی خوبصورت ہوگی اُن کے یہاں رشتے دروازوں سے ہی نہیں کھڑکیوں اور روشن دانوں سے بھی ٹپکتے ہیں ۔میں تو کہتی ہوں کہ بازار میں جس چیز کا ڈیمانڈ ہواُسے گوڈون میں رکھ کر سڑانا کون سی عقل مندی ہے............؟''

9

باپ، موڈرن دلال اور بیٹی

قارئین!

کئی دن سے ڈاکٹر کپل سوچ رہے تھے کہ شوبھانے پریتی کو جن راستوں پر ڈال دیا ہے، اُن راستوں پر کبھی کنول بھی چلی ہوگی ۔ اُس وقت جس طرح کے نفسیاتی دباؤ سے میں گذر رہا ہوں ۔ ہر پل جس طرح کے تناؤ سے بکھر رہا ہوں ، کیا ویسے ہی اثرات کبھی دلیپ شرما کے اندر پیدا ہوئے ہوں گے.......؟

یہ ایک اہم سوال تھا۔ جس کا جواب ڈاکٹر کپل اپنے اندر تلاش کر رہے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر کپل گھر سے کلینک کے لئے نکلے۔لیکن تلاش کے قدم کیا بہکے کہ وہ پہنچ گئے جونیئر انجینیئر دلیپ شرما کے آفس ۔سی پی ڈبلیو ڈی۔ جہاں معلوم ہوا کہ اُن کی ڈیوٹی فیلڈ میں لگی ہوئی ہے۔ وہ وہاں سے سیدھے اُس سائٹ پہنچے، جہاں ڈانس اسکول کی ا نئی بلڈنگ تعمیر ہورہی تھی۔

دلیپ شرما ڈاکٹر صاحب کو پہچانتے تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی سوچ میں پڑ گئے کہ ڈاکٹر صاحب یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کس سے کام ہوسکتا ہے؟ کہیں سائٹ پر کوئی بیمار تو نہیں ہو گیا۔؟ کہیں اُن سے ہی تو کوئی کام نہیں ہے........؟

کانچ کے کیبن سے باہر نکلتے ہی اُنہوں نے گرم جوشی سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ اور یہاں......کہئے کن سے ملنا ہے.........؟''

''آپ سے ہی ملنے آیا ہوں انجینیئر صاحب!'' ڈاکٹر کپل نے بھی اُسی گرم جوشی سے جواب دیا۔

''کہئے کیا کام ہے........؟'' مسکراتے ہوئے۔''ویسے ہمارے پاس تو ٹھیکیدار اور بلڈر ہی آتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے پاس تو ہمیں خود جانا پڑتا ہے۔'' پھر دانت باہر نکالتے

ہوئے۔''کوئی خاص بات ہے کیا ڈاکٹر صاحب........! کہیں کوئی فلیٹ ولیٹ تو نہیں بنوانا ....میرے پاس آ گئے ہیں تو سمجھئے آپ کا سارا کام سستے میں ہو جائے گا........اور کہیں کوئی زمین و مین ہے تو اچھّے خاصے بلڈر سے بھی ملوا دوں گا۔ میرے رہتے ہوئے آپ کو کسی طرح کا ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب بولئے کون سا کام کروانا ہے........؟'' انگڑائی لیتے ہوئے اُنہوں نے پوچھا۔

''نہیں شرما جی ! ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' پھر وہ کچھ سنجیدہ سے ہو گئے۔

''تھوڑی سی عزّت ہے۔لیکن اب وہ بھی نیلامی کی کگار پر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں تا کہ عزّت کی کشتی ریئلیٹی کے بھنور میں ڈوبنے سے بچ جائے۔

''کیا........؟'' ریئلیٹی کے نام پر وہ چونکتے ہیں۔

''میری ایک بیٹی ہے دلیپ شرما جی........!'' آواز کی نلی سے درد ٹپکنے لگا تھا۔

''پریتی ہی نام ہے نا اُس کا........؟ ''

''جی۔ جی ہاں........''

''بہت پیاری اور خوبصورت ہے ۔ بالکل میری کنول کی طرح........''

''جی........!''

ڈاکٹر کپل کے مُنہ سے اچانک اِس طرح نکلا جیسے اُنہوں نے گالی دی ہو۔لیکن شرما جی کو لگا جیسے پریتی کو کچھ ہو گیا ہو۔

''کیا ہوا ہے اُسے........؟'' دلیپ شرما کی آنکھیں سوال بن گئیں۔

''یہی تو پریشانی ہے کہ میری پتنی شوبھا اُسے کنول کی طرح بنانا چاہتی ہے۔'' ڈاکٹر کپل کی آواز میں ایک پریشان حال باپ کی بے بسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ آپ کی پریشانی ہے کپل صاحب........؟'' پھر مسکراتے ہوئے اُنہوں نے آگے کہا۔''ارے آپ کو تو فخر ہونا چاہئے کہ آپ کی پتنی نے پریتی کے لئے ریئلیٹی شو کا انتخاب کیا ہے جس کی دھوم پوری دنیا میں ہے۔''

''لیکن مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی پتنی کو سمجھائیں کہ وہ میری بیٹی کے معاملے میں میری مسیز کو انکریج نہ کرے۔ ورنہ میری زندگی جہنّم بن جائے گی۔''

''ارے کیسے باپ ہیں آپ کہ اپنی بیٹی کا فیوچر نہیں دیکھ رہے ہیں۔'' دلیپ شرما نے ماڈرنیٹی کے چشمے سے پہلے حقارت بھرے انداز میں دیکھا پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''گھر میں بیٹی کو رکھ کر کیا کریں گے آپ........؟ جوان ہوتے ہی شادی کر دیں گے۔ کیا ملے گا اِس سے آپ کو........؟ مجھے دیکھئے پل میں کروڑ پتی ہو گیا ہوں۔ اتنی سی عمر میں بیٹی نے اتنا نام کر لیا ہے کہ شادی کی بھی کوئی چنتا نہیں ہے مجھے۔ جانتا ہوں کہ ایک دن کوئی کروڑ پتی ہی اُس پر مر مٹے گا۔''

ڈاکٹر کپل پہلے اُن کی اِن باتوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں۔

''بیٹی جتنا بھی نام کما لے۔لیکن چنتا ہر باپ کو ہونی ہی چاہئے شرما جی! چاہے وہ بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو........جس دن ایک باپ، بیٹی کی طرف سے چنتا مکت ہو گیا۔ سمجھئے پرلوک نزدیک آ گیا۔''

''مجھے آپ نصیحت نہ کریں اور نہ ہی اپنے وچار تھوپیں........میں نے اپنی بیٹی کے لئے جو سوچا۔ وہ کیا........آپ اپنی بیٹی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ مجھے اُس سے کوئی مطلب نہیں۔'' دلیپ شرما نے دوٹوک لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔''........اور رہی بات آپ کی مسیز اور پریتی کے میرے گھر آنے اور میری مسیز کے انکریج کرنے کی۔ تو یہ آپ کا معاملہ ہے۔ آپ اپنے معاملے کو کیسے سلجھائیں گے وہ آپ اپنے اَستر سے دیکھیں اور کرپیا یہاں سے جائیں۔ کیوں کہ مجھے اور بھی کئی کام نپٹانے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ غُصّے سے پیچھے مڑے اور بڑبڑاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے کیبن کی طرف بڑھ گئے۔

اُنہیں جاتے دیکھ پیچھے سے ڈاکٹر کپل نے تلخ لہجے میں کہا۔

''جانے کے لئے تو یہاں ہر کوئی آیا ہے۔لیکن جاتے جاتے میری ایک بات یاد رکھنا کہ بیٹی کی گمنامی باپ کی چِتا کو کم کرتی ہے،لیکن لوگوں کی زبان پر جیسے جیسے نام چڑھتا ہے،باپ کی فکر اُتنی ہی بڑھتی جاتی ہے.........اگر کسی باپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا تو سمجھ لیجئے کہ رشتے کی بنیاد میں کہیں صاف خون کی کمی رہ گئی ہے۔اور وہ باپ نہیں بیٹی کا موڈرن دلال ہے۔''

ڈاکٹر کپل کی اِن باتوں پر دلیپ شرما غصّے سے آگ بگولہ ہو گئے۔اُس نے چیخ چیخ کر آس پاس کام کر رہے لوگوں کو بُلا لیا۔اُن کے گالوں پر کئی تھپّڑ رسید کرنے کے بعد انہیں دھکّے مار کر سائٹ سے باہر نکلوا دیا۔

ڈاکٹر کپل اگر چاہتے تو سیدھے پاس کے تھانہ میں جا کر رپورٹ درج کرا سکتے تھے۔لیکن مصلحتاً تھانہ کی طرف بڑھتے بڑھتے اُنہوں نے خود کو روک لیا تھا کہ ایسے موڈرن دلالوں کے رشتہ دار سیاسی لوگ ہوتے ہیں جن کا اُٹھنا بیٹھنا اکثر تھانے میں ہوتا ہے۔اگر ایسے میں وہ تھانے کے چکّر میں پڑ گئے تو پھر شوبھا آسانی سے اُسے اپنے بنائے ڈانسنگ نرک میں کھینچ لے گی۔

☆☆☆

10

ڈانسنگ فیلڈ، اِسکوپ اور چائے کی پیالی

قارئین!

ڈاکٹر کپل کے پاس اب ایک ہی چارہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے ساس سسر سے اِس سلسلے میں بات کریں اور اگر بات بن گئی تو ٹھیک ہے ورنہ اکلوتے سالے پر دباؤ بنا کر وہ اُس کی بہن کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں گے۔

ایک دن ڈاکٹر کپل کلینک جلدی بند کر کے اپنی اسکوٹر نکالی اور وہاں سے وہ سیدھے سسرال پہنچ گئے۔کلینک اور سسرال کے درمیان یہی کوئی آٹھ دس کیلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔دن اتوار کا تھا۔سالے صاحب بھی گھر پر کرکٹ کا مزہ لے رہے تھے۔ریٹائرڈ ساس سسر کہاں جاتے؟ سالے کی نئی نویلی بیوی بھی گھر پر ہی تھی۔دو تین مہینے ہی ہوئے تھے۔لیکن اپنے شکم کے اُبھار کو پلّو سے ڈھکنا سیکھ رہی تھی۔سبھوں نے ڈاکٹر کپل کا پُر جوش استقبال کیا۔اُنہیں کلینک اور نرسنگ ہوم سے باہر نکلنے کا کم ہی موقع ملتا تھا۔اِدھر وہ بہت دنوں کے بعد سسرال پہنچے تھے۔اکیلے تو وہ کبھی سسرال گئے ہی نہیں۔شوبھا ہمیشہ ساتھ رہتی۔وہ بھی آنے کی خبر پہلے ہی فون سے مل جایا کرتی۔لیکن آج اِس طرح سے بنا فون کئے اور وہ بھی اکیلے اور اُس پر بھی بغیر مٹھائی کے دیکھ کر ساس کو سمجھتے دیر نہیں لگی کہ کچھ تو بات ہے........؟ چہرے کے تاثرات پڑھنے کے بعد سب نے یہ محسوس کیا۔آخر کار ساس کے اشارے پر سالے نے کہا۔

''بھیّا کیا بات ہے۔بغیر دیدی کے آج اور وہ بھی کلینک کے سمئے میں........گھر میں سب ٹھیک ہے نا.........؟'' پارس ریموٹ رکھ کر اُن کے بغل میں آکر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہوتا تو کیوں آتا.........؟'' ڈاکٹر کپل کا چہرہ کچھ اور گمبھیر دکھائی دے رہا تھا۔

''پریتی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا........؟'' سسر صاحب نے اپنی بیٹی کی خیریت معلوم کرنا چاہی۔

''شوبھا سے کچھ کہا سُنی ہوگئی ہے کیا بیٹا........؟'' ساس فکر مند نظر آنے لگی تھی۔

ڈاکٹر کپل پہلے پہل تو خاموش رہے۔ پھر ایک ایک سبھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ابھی کچھ ہوئی ہے اور کچھ باقی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بیچ میں انٹرفیئر کریں تاکہ میری پریتی مجھ سے دور ہونے سے بچ جائے۔'' اُن کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''یہ سب کیا کہہ رہے ہیں جیجا جی! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......'' پارس نے مسکراتے ہوئے مذاق میں اپنی بیوی شیاملی کو آواز لگائی۔ ''جیجا جی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ جلدی چائے لے آؤ تاکہ ان کا موڈ ٹھیک ہو سکے۔''

کچھ دیر تک کمرے کا ماحول سکوت کا پہرہ رہا۔ کیوں کہ اُس کے مذاق پر بھی اُن کے چہرے پر ہنسی کی رم جھم برسات نہیں ہوئی جو اکثر سالے اور بہنوئی کے درمیان گفتگو کے ایسے ساون میں ہوتی ہے۔

شیاملی چائے لے آئی اور ''نمستے'' کہہ کر دینے کی کوشش کی تو ڈاکٹر کپل نے اُسے ٹیبل پر رکھنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں نہیں! چائے تو آپ کو میرے ہاتھ سے ہی لینا ہوگی۔'' شرارت بھرے انداز میں اُنہوں نے اِس طرح کہا جیسے انکار کی صورت میں پینٹ بھیگنے کا خطرہ ہے۔ پھر مسکراتے ہوئے۔'' جیجو! آج بھر میرے ہاتھ سے لے لیں۔ پھر جلدی نصیب نہیں ہوگی کیوں کہ کل سے نرتیہ اکاڈمی جوائن کر رہی ہوں۔ جہاں بچوں کو ڈانس سکھاؤں گی۔ اور اگر کبھی موقع ملا تو آپ کو بھی انگلی پر نچاؤں گی........'' یہ کہتے ہوئے اُس نے پارس کی طرف اشارہ کیا۔ ''اِنہوں نے تو مجھے آتے ہی کہا تھا کہ جب تم نے ڈانسنگ سیکھی ہے تو کسی اسکول

میں ڈانس ماسٹر بن جاؤ۔ اب تو ممّی پاپا نے بھی ''ہاں'' کر دی ہے۔''

اِس جیت پر وہ مسکرا رہی تھی۔

پھر وہ مسکراتے ہوئے زبردستی اُن کا ہاتھ پکڑ کر چائے دینے کی کوشش کرتی ہے۔

''جیجو! اب تو آپ اپنی سرہج کے ہاتھ کی آخری چائے پی لیجئے۔''

''لیکن تم اِس حالت میں ڈانس........؟''

''وہ کیا ہے جیجو! بچّے تو آتے جاتے رہیں گے۔ لیکن اپرچیونیٹی کبھی کبھی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ کل جوائننگ کے بعد ایک ہفتے کی چھٹّی لے لوں گا۔ اور اُسی بیچ ابارشن ہو جائے گا۔ ہم بھی فری، اسکول والے بھی خوش اور گھر میں پیسہ کا پیسہ بھی۔ آج سارا کھیل تو پیسے کا ہی جیجو''

شیاملی کی ضد پر چائے اُس کے ہاتھ سے لے کر ایک ہی گھونٹ میں گرم گرم اپنے حلق میں انڈیل لیتے ہیں۔

چائے کے ساتھ ایسی نازیبا حرکت کسی کو بھی پسند نہیں آتی ہے۔ سب ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے ہیں........اُس وقت کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ کوئی کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ بڑی ہمّت کر کے پارس نے کہا۔

''آپ کیا کہہ رہے تھے جیجا جی........؟''

لیکن ڈاکٹر کپل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پارس تیکھا سوال کرتا ہے۔

''ایسا شوبھا دیدی نے کیا کر دیا کہ پریتی آپ سے دور ہوگئی........؟''

''وہ اُسے ڈانسر بنانا چاہتی ہے۔ ریئلیٹی شو میں بھیج کر اُس سے پیسے کمانا چاہتی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے یہ جملے کچھ اِس طرح سے ادا کئے کہ لوگوں کی حمایت اُن کے حق میں ہوگی۔ لیکن جب اُنہوں نے ایک نظر ڈالی تو اُنہیں اِس بات کا افسوس ہوا کہ وہ کن لوگوں کے درمیان مصالحت کے لئے آیا ہے۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں اُنہیں اپنی اِس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہوئی نظر آئی۔

''ارے یہ تو کتنی اچھی بات ہے۔ کتنے شبھ وچار ہیں دیدی کے ....'' پارس نے دیدی کی وکالت کرتے ہوئے آگے ناصحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''جیجا جی! میں نے تو ابھی سے اپنی آنے والی اولادوں کے لئے اس طرح کا فیوچر پلان ترتیب دے دیا ہے۔ارے آج کل تو اِسی لائن میں سب سے زیادہ پیسہ ہے۔سب سے زیادہ عزّت ہے۔میں کہتا ہوں جیجا جی کہ پریتی کو اِس فیلڈ میں آگے بڑھنے دیجئے.........شیاملی نے تو ڈانس میں ماسٹر ڈگری کیا ہے۔یہ ابھی کل ہی بتا رہی تھی کہ ہمارے یہاں 'ریئلیٹی شو' کی بہار آئی ہوئی ہے۔جس کی وجہ سے ڈانسنگ فیلڈ میں اِسکوپ ہی اِسکوپ ہے۔''

''اسکوپ ....؟'' ڈاکٹر کپل کی آنکھیں حیرت میں ڈوب گئی تھیں۔''نہیں چاہئے مجھے ایسا اِسکوپ۔جس میں میری بیٹی منچ پر ڈانس کرے اور لوگ ڈانس کے علاوہ سب کچھ دیکھیں۔''

''آپ کیا پُرانے خیال کو لے کر بیٹھ گئے ہیں جیجا جی۔'' پارس نے اُنہیں آناً فاناً میں موڈرنیٹی کا پاٹھ پڑھانا شروع کر دیا۔''ارے یہ تو ایک کلا ہے۔کلا اور کلا کار کی تو ہمارے یہاں پوجا کی جاتی ہے۔اور آپ اُسے ہی بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔''

''ارے داماد بابو! اِس میں کیا ہے.......؟ اگر وہ اُسے ڈانس سکھانا چاہتی ہے تو سکھانے دو۔پڑھ لکھ کر آخر اُسے مردوں کے ساتھ ہی نوکری کرنی ہے۔اِس لئے اُسے ابھی سے فری لائف جینے دو۔آج کل اِتنا نہیں دیکھا جاتا۔اگر یہ سب دیکھو گے تو جینا مشکل ہو جائے گا۔اِس لئے زمانے کے ساتھ چلو اور خود کو ٹینشن فری رکھو۔اِسی میں بھلائی ہے۔''

سسُر صاحب نے بھی جب آج کی عدالت میں لڑکیوں کے ڈانس گانے اور کم کپڑے کی وکالت کر کے شوبھا کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دیا تو اُس کے بعد ڈاکٹر کپل کے پاس کچھ کہنے اور سننے کے لئے کیا رہ گیا تھا۔ وہ اپنا سا مُنہ لے کر وہاں سے تھکے ہارے شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح گھر لوٹ آئے۔

اِس طرح سے آخری اُمید بھی ٹوٹ گئی۔

ڈاکٹر کپل کے گھر سے نکلتے ہی پارس نے شوبھا کو فون پر ساری روداد سنا دی۔اِس طرح گھر پہنچنے سے قبل جب سسرال کی بات گھر پہنچ گئی تو ایسے میں اسکوٹر اسٹینڈ کرتے ہی ایک نیا مہا بھارت شروع ہو گیا کہ اُنہوں نے مائکے میں جا کر اُلٹی سیدھی باتیں کیوں کی ....؟

''آخر وہ ایسا کیا کر رہی ہے، جس کا وہ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں........؟''

''وہ پریتی کو صرف ڈانسر ہی تو بنا رہی ہے۔کوٹھے پر تو نہیں بھیج رہی ہے.......؟''

لیکن اُس دن ڈاکٹر کپل نے اُس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔اور جواب دے کر وہ کرتے بھی کیا؟ کیوں کہ جس ماحول کی وہ پروردہ تھی، وہاں سے ابھی ابھی لوٹے تھے۔

جب بنیاد میں ہی گیت سنگیت کی اینٹیں ہوں تو دیواروں سے چھم چھم کی آوازیں تو نکلے گی ہی۔

پھر کیا تھا:

دونوں کے درمیان ہفتوں بات چیت بند رہی۔

☆☆☆

11

ڈانس کے الفابیٹس اور گھنگھرو

قارئین!

اِس مہا بھارت کے باعث ڈاکٹر کپل اب گھر سے کلینک کے لئے جلدی نکل جاتے اور گھر دیر سے لوٹتے۔فرسٹریشن سے پیدا ہوئی اپنی اِس تنہائی کو بانٹنے کے لئے وہ دن میں کم سے کم ایک بار اپنے بچپن کے دوست حامد عالم سے ملنے ان کی کلینک ضرور جاتے۔ حامد عالم کلینک بند کر کے اُنہیں اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔ یہاں پہنچ کر اُنہیں ایک طرح کی گونا گوں راحت کا احساس ہوتا۔

ڈاکٹر کپل جب حامد عالم کی بیوی رخسار اور اُن کی سات سالہ بیٹی رخشندہ کو دیکھتے، اور اُن دونوں کے ساتھ جب شوبھا اور پریتی کے لباس کا موازنہ کرتے تو اُنہیں زمین آسمان کا فرق نظر آتا۔ اور یہی وہ فرق تھا جسے وہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ دونوں جگہ تقریباً ایک سی عمر کی عورت ہے۔ دونوں کی بیٹیوں کی عمر بھی ملتی جلتی ہے۔لیکن اِس کے باوجود حامد عالم کے دروازے تک DANCE کا پہلا الفابیٹ D کے ہاتھ نہیں پہنچے، اور اُن کے یہاں D سے E تک سبھی اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ڈرائنگ روم کے راستے بیڈروم میں داخل ہو گئے۔؟

آخر کیسے.........؟

حامد عالم کے یہاں آتے ہی یہ سوال اُن کے ذہن کے محور پر گردش کرنے لگتا۔اِضطرابی کیفیّت طاری ہو جاتی۔ رخسار بھابی اُنہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ یہ جو فرق آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ کلچر کا ہے.........لیکن وہ اِس بات کو ماننے کے لئے تیّار نہیں تھے کہ کسی خاص مذہب کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہے کلچر کے سبب اتنا فرق بھی ہو سکتا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ عورت دنیا کے کسی مذہب، ذات، رنگ، نسل، بولی کی کیوں نہ ہو؟ وہ

بنیادی طور پر صرف اور صرف عورت ہوتی ہے۔اور عورت کی عزّت بلاتفریق دنیا کے ہر خطّے میں یکساں رہی ہے۔ ہر مذہب میں عورت کا احترام شامل ہے۔اس لئے کہیں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔

اگر کہیں یہ فرق ہے تو کیوں ہے۔؟

جب کہ ایک اپنی بیٹی پر پردہ ڈال رہا ہے اور دوسرا لیمینیٹ کر کے اُسے سڑکوں پر گھما رہا ہے۔

آخر یہ تضاد کیوں.........؟

اور ایک دن اس تضاد کو لے کر ڈِنر کے دوران کافی لمبی بحث چھڑ گئی۔

''حامد تم یقین مانو میں شوبھا کا پتی ہوں۔لیکن اس کے تنگ کپڑے دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے۔ یہ موڈرنیٹی ہے تو اِس سے بھلے ہم پہلے ہی تھے.........کیا ہم نے اپنی ماؤں اور بہنوں کو خوش لباس کپڑے میں نہیں دیکھا ہے۔؟'' اُنہوں نے موڈرنیٹی کے نام پر ہو رہے ننگا پن پر ایک اہم سوال کھڑا کر دیا تھا۔

''دیکھئے بھائی صاحب! ایسے میں عقل سے کام لیں اور شوبھا بھابی کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ موڈرنیٹی پہناوہ اوڑھاوہ کا نام نہیں ہے اور نہ ہی اِس کا تعلّق دیکھنے دکھانے سے ہے۔ یہ دماغ کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ جو ایجوکیشن سے آتی ہے۔'' رخسار بھابی نے اُنہیں ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

''نہیں بھابی جان! اب تو وہ وقت بھی ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ بات صرف کپڑے کی ہوتی تو آنکھیں موند لیتا۔لیکن پانی سر سے اُوپر آ گیا۔ وہ بیٹی کو ڈانسر بنا کر سرے عام نچوانا چاہتی ہے۔ جو مجھے پسند نہیں ہے۔'' اتنا کہتے ہی ڈاکٹر کپل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حامد عالم اُس وقت اُن کے دل کی کیفیت سمجھ گئے تھے۔ اِس لئے وہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے قریب گئے اور ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے دلاسہ دینے کے

انداز میں گویا ہوئے۔

’’لیکن ایسے میں تمہیں ہوش وہواس سے کام لینا چاہئے۔‘‘

’’کیسے کام لوں ....؟ اور کہاں تک کام لوں ....؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔‘‘ ڈاکٹر کپل نے اپنی بے بسی کا اظہار اِس طرح کیا کہ حامد اور رخسار کے چہرے پر اس کا زیرو کس نظر آنے لگا۔

’’نہیں یہ وقت سمجھداری سے کام لینے کا ہے۔‘‘ رخسار نے اندر سے اُنہیں سے ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو سمجھایا۔

’’اب تک تو میں نے سمجھداری سے ہی کام لیا ہے۔‘‘ وہ یہ کہتے ہوئے صوفے کے کچھ اور اندر دھنس گئے تھے۔ ’’اِس سلسلے میں ساس سسر اور سالے سے بھی بات کر چکا ہوں۔ لیکن سب بے سود۔ سب کے سب شوبھا کے ہی طرف دار ہیں۔ اور سارا بلیم مجھ پر ڈال رہے ہیں کہ میں جان بوجھ کر رشتے خراب کر رہا ہوں، پریتی کے ٹیلینٹ کو ڈِسکریج کر رہا ہوں۔‘‘

یہ کہتے کہتے وہ کچھ دیر سانس لینے کے لئے رکتے ہیں، جیسے لمبی دوڑ دوڑنے کے بعد تازہ دم ہونے کے لئے جلدی جلدی سانس لے رہے ہوں۔ اِس دوران آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو ہونٹوں سے ہو کر جب گذرتے ہیں تو آواز خود بخود دھیکتی چلی جاتی ہے۔

’’باپ ہوں نا! اس لئے یہ سب سہہ رہا ہوں۔ لیکن ہمّت نہیں ہاروں گا۔ آخری دم تک اُسے ڈانس کی دلدل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔‘‘

12

اینٹی وائرس ویکسین اور سنہری دلدل

قارئین!

شوبھا پریتی کو لے کر اُس چمکیلی دلدل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مشرق ہو یا مغرب

شمال ہو یا جنوب

لوگ بچّوں کے سنہری دلدل میں اُترنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اِن نظاروں کے درمیان جب ڈاکٹر کپل نے اپنی آنکھوں کی گولیاں گھمائیں تو اُنہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بچّے چاہے کسی سوسائٹی کے ہوں۔ آج اُن کے اندر ’ریئلیٹی شو‘ کا ایسا ’وائرس‘ داخل ہو گیا ہے، جو پڑھ لکھ کر آئی اے ایس، ڈاکٹر، انجینیئر، پرفیسر اور وکیل بننے کو بے وقوفی سمجھتے ہیں۔

اس بے وقوفی کا ایک ہی علاج ہے.........’انٹی وائرس ویکسین‘۔

ڈاکٹر کپل ’’ویکسین‘‘ کے سلسلے میں ایم ایل اے صاحب سے ملے تا کہ ڈاکٹروں کو مہاماری سے نپٹنے کے لئے تیّار کیا جا سکے۔ ایم ایل اے صاحب کبھی سماجی سنگٹھن کے صدر ہوا کرتے تھے۔

سڑک پر سوچ کے پہیئے گھوم رہے تھے۔

’’کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُنہیں اِس کا علم نہ ہو۔ اور ویسے بھی نیتاؤں کے پاس بہت سارے کام ہوتے ہیں۔ چھوٹے موٹے کام وہ کتنا یاد رکھیں گے؟‘‘ سامنے بریکر آ جانے کی وجہ سے سوچ کے پہیئے تھوڑے سست پڑ گئے۔ پھر گیئر بدل کر آگے بڑھ گئے۔

’’یہ کوئی چھوٹی بیماری تو ہے نہیں ’مہاماری‘ ہے۔ اس سے نپٹنا ہی بڑا کام ہے؟ اس لئے وہ میری باتیں سنتے ہی فوراً نجات کا راستہ نکالنے کے لئے کمیٹی بنا دیں گے۔‘‘

راستوں کے کئی موڑ کاٹنے کے بعد سوچ کے پہیئے ایک عالی شان کوٹھی کے سامنے آ کر رک گئے۔

تلاشی کے بعد سیکورٹی ڈاکٹر کپل کو ایم ایل اے صاحب کے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ وہ اُنہیں دیکھتے ہی مسکراتے ہیں اور چشمہ اُتار کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پتھّر کی ایک آنکھ چمکنے لگتی ہے۔ ویسے وہ چشمہ کم ہی اُتارتے تھے.........آنکھ کا قصّہ یہ ہے کہ ایک بارگینگ وار میں اُن کی بائیں آنکھ میں گولی لگی تھی۔ لیکن دور سے لگی تھی اس لئے زیادہ اندر نہیں گئی اور بچ گئے۔ اس رات اُن کے گُرگے آدھی رات کو گھر کے اندر گُھس کر ڈاکٹر کو اِسی کمرے میں اُٹھا لائے تھے.........ڈاکٹر نے بڑی مشکل سے گولی نکالی تھی۔ گولی نکالنے کے دوران جب وہ چیخ رہے تھے تو اُن کے گُرگے نے کان کے نیچے زور سے تھپّڑ بھی بجایا تھا کہ بھائی کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر کپل کو اُنہوں نے پہچان لیا تھا۔

''آیئے ڈاکٹر صاحب! آیئے.........کہیئے کیسے کشٹ کیا آپ نے۔ جب میں کشٹ میں تھا تو آپ یہاں آئے تھے۔'' صوفے پر لیٹے لیٹے ٹاپ لیس فلم، جسے بڑے چاؤ سے ٹی وی پر دیکھ رہے تھے اُسے پہلے ریموٹ سے آف کیا۔ پھر بیٹھتے ہوئے بولے۔'' میں کشٹ کے ندان کے لئے خود آپ کے یہاں پدھارتا۔ کیوں کہ بُرے وقت میں آپ ہمارے بھگوان جو ٹھہرے۔ کہیں پرسنل نرسنگ ہوم کے لئے لائسینس وائسینس تو نہیں لینا ہے.........؟ بس حکم کیجئے آپ کا کام تو چُٹکی میں ہو جائے گا۔''

چٹکی بجاتے ہوئے اُنہوں نے اپنے اُسی ہاتھ سے اپنے ٹکلے سر کو سہلایا۔

''ایسا ہے ایم ایل اے صاحب کہ اِس وقت میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں ۔جس کا علاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' ڈاکٹر کپل نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بولو ڈاکٹر بولو! کون ہے جو تمہیں کشٹ دے رہا ہے۔ اس کی ماں کی.........ارے بولتا کیوں نہیں ہے ڈاکٹر.........! بولو.........؟'' ایم ایل اے نے غُصّے میں چیختے

ہوئے پوچھا۔

''ڈانسنگ اسکول میں میری بیٹی کا ایڈمیشن.........'' ڈاکٹر کپل کے آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُنہوں نے چلّانا شروع کر دیا۔

''سالے ایڑے پرنسپل کی اتنی ہمّت کہ وہ میرے ڈاکٹر صاحب کے بچّے کا ایڈمیشن نہیں لے گا۔''

بیچ میں ڈاکٹر کپل ''نہیں نہیں.....وہ بات نہیں ہے ایم ایل اے صاحب'' کہتے رہے۔ لیکن وہ اُن کی باتوں کو بغیر سُنے زور زور سے چلّانے لگے۔

''ارے او کالیا.........''

''ابے او کاٹرا او کیل.........کہاں مر گیا سب.........؟''

دونوں اندر سے دوڑتے ہوئے اس طرح آئے جیسے کچھ ہو گیا ہے۔

''کیا بات ہے باس.........کسی نے اپنے لونڈوں پر اٹیک تو نہیں کر دیا۔''

اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اپنی کمر میں گھوڑا اڈالنے لگتے ہیں۔

''ابے آج اتنی ہمّت کس میں ہے کہ سلیم کانے کو آنکھ دکھائے.........؟''

ابتدائی غنڈہ گردی کی سند حاصل کرنے کے دوران ایک آنکھ سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ گولی ڈاکٹر کپل نے نکالی تھی اور پتھّر فورن جا کر لگوایا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کپل نے جس دن گولی نکالی تھی اُس کے دوسرے دن گھر میں کسی نوکیلی چیز کے گُھس جانے کا بہانہ بنا کر ہسپتال میں داخل ہو گئے تھے۔ اور اُسی رات ہسپتال سے بھاگ کر چاقو کی نوک سے مارنے والے کی آنکھیں نکال لیں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آرام سے ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے کوئی کیس نہیں بن پایا۔ تب سے 'کانے' کا لاحقہ دُم چھلّہ بن کر اُن کے نام کے ساتھ جُڑ گیا۔ اب تو نام کے ساتھ جب کوئی کانے کا لاحقہ لگانا بھول جاتا ہے تو وہ اُسے گالیوں سے بھرپور نوازتا ہے۔ اُس کے لئے 'کانے' کا یہ ٹائٹل کسی 'سر' اور 'ڈاکٹر' کے خطاب سے کہیں بڑا تھا۔

''تم ڈاکٹر صاحب کو لے کر ڈانسنگ اسکول جاؤ اور اِن کے بچّے کا کھڑا کھڑا
ایڈمیشن کرا کر آؤ۔ اگر کوئی اونے پونے کرے تو سالے کو گاڑی میں بٹھا کر ایڈمیشن رجسٹر
کے ساتھ یہاں لے آنا۔ پھر تو سالے کا یہیں ایڈمیشن ہوگا رات بھر۔''

''اتنا بھڑ کنے کا نہیں کانے بھائی۔ میں جو جا رہا ہوں۔ شہر میں کس کی ہمّت ہے
کہ میں جاؤں، آپ کا نام لوں اور کام نہ ہو........'' اتنا کہتے ہی اُس کی نظر ڈاکٹر کپل پر
پڑی۔ آنکھوں میں شناسائی کے دیپ جلے۔ اُسی نے ڈاکٹر کو ریوالور کی نوک پر رات بارہ
بجے گھر سے اُٹھایا تھا۔

''ارے نمسکار ڈاکٹر صاحب! آپ کا کام تو چٹکی میں ہوگا۔ کیوں کہ وہ ڈانسنگ
اسکول کسی اور کا نہیں سلیم کانے صاحب کا ہی ہے۔ بس کاغذ پر نام کسی اور کا ہے تاکہ
.........ارے یہ سب سے آپ کو کیا مطلب۔ چلئے جلدی سے ایڈمیشن کروا کے آتے ہیں
۔'' وکیل کانڑے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر کی طرف چلنے لگا۔ تبھی ڈاکٹر کپل نے اپنا
ہاتھ چھڑایا اور روہانسی آواز میں بولے۔

''میں یہاں ایڈمیشن کے لئے نہیں، بیٹی کا نام کینسل کروانے آیا ہوں۔''

ڈاکٹر کی اِن باتوں پر سب کے سب حیران کن نظروں سے اُنہیں دیکھنے لگے۔

''کیا بکواس کر رہا ہے؟' سلیم کانے اُسے اِس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی پاگل
سے پالا پڑا ہو۔'' ڈاکٹر! وہ شہر کا سب سے مشہور ڈانسنگ اسکول ہے۔ وہاں تو رئیسوں کے
بچّوں کا ایڈمیشن بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ اور تم ہو کہ اپنے بچّے کا ایڈمیشن کٹوانے آئے ہو۔''

''ہاں ایم ایل اے صاحب! اگر آپ میری بیٹی کا ایڈمیشن کینسل کروا دیں تو میں آپ
کا زندگی بھر احسان مانوں گا۔'' ڈاکٹر کپل نے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے والے انداز میں کہا۔

''دیکھو اگر تم آدمی کٹوانے کی بات کرتے تو میں سوچتا بھی.........'' سلیم کانے
دانت نکال کر ہنستا ہے۔''لوگ تو میرے پاس ایڈمیشن کروانے آتے ہیں۔ تم پہلا آدمی ہے
جو ایڈمیشن کٹوانے آیا ہے۔ مجھے ڈاکٹر اس لفڑے میں مت ڈالو اور یہاں سے جاؤ۔'' ایک

بار پھر وہ دانت نکال کا ہنستا ہے۔'' لیکن جاتے جاتے مہاپرش اتنا تو بتا دو کہ تم اپنے بچّے کا
ایڈمیشن کٹوانا کیوں چاہتے ہو۔؟''

سلیم کانے کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ اسلئے وہ یہ معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ ایڈمیشن
کینسل کروانے کے پیچھے کیا اسباب ہیں۔؟

''اصل میں میری بیوی، بیٹی کو ڈانسر بنانا چاہتی ہے۔'' ڈاکٹر کپل کو خود اپنی ہی
آواز کنویں کی گہرائی سے آتی ہوئی سنائی دی۔

''اور تم اُسے ڈاکٹر بنانا چاہتے ہوگے.......؟'' سلیم کانے کی ایک آنکھ تو ایسے بھی
نہیں تھی لیکن اُس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اُس نے اپنی تیسری آنکھ کا استعمال کیا ہے۔'' ہے
نا یہی بات ڈاکٹر........؟ بس تم لوگوں کی یہی پریشانی ہوگی۔ آن بان کی........'' پھر
مسکراتے ہوئے نرمی سے بولے۔'' ارے بناتی ہے تو بنانے دو.........اگر یہ ڈانس اسکول
نہ ہو تو پھر ہم جیسے لوگ جو اکثر کسی نہ کسی پروگرام میں چیف گیسٹ ہوتے ہیں۔ وہاں کی
تو رونق ہی ختم ہو جائے گی........ جاؤ جا کر اپنی کلینک سنبھالو ڈاکٹر۔ کیوں جان بوجھ کر زندگی
کو شمسان بنانے پر تُلے ہو۔؟''

ایم ایل اے سلیم کانے نے سیاسی چیئر گرلس کے تحفّظ کی خاطر اُنہیں جہاں دبی
زبان میں سمجھایا وہیں اپنے ہی اسٹائل میں ڈرانے کی بھی کوشش کی۔

ڈاکٹر کپل کچھ حد تک ڈر گئے۔ اِس لئے اُنہوں نے آگے سلیم کانے سے کچھ بھی
نہیں کہا۔ خاموش قدموں پر خود کو سہارا دیئے وہاں سے آ گئے۔

زندگی کو مُٹھی میں چھپائے شمسان گھاٹ کے راستے جب وہ باہر نکلے اور کچھ دور
آگے بڑھے تو دھیرے دھیرے ڈر پیچھے چھوٹنے لگا۔ اور جب فاصلہ بڑھ گیا تب اُنہوں
نے سوچا کہ کیوں نہ اِس سلسلے میں کسی سماجی ایکٹی وِسٹ سے بات کی جائے۔ وہ اِس طرح
کے مسئلے کو اہمیت دیتے ہیں اور مثبت حل تلاش کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی سماج
کے لئے وقف ہوتی ہے۔ سماج کے بنیادی ڈھانچے کو بچانے کے لئے وہ ہر مورچے پر ڈٹے

رہتے ہیں۔یقیناً وہ اُن کا ساتھ دیں گے اور ایسے ڈانسنگ اسکول جو نئی نسل کو گمراہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔اُس پر قانونی نکیل کسیں گے۔

سوچ کا آخری قدم سماجی ایکٹی وسٹ کے دروازے پر دستک کے ساتھ ختم ہوا۔

''آیئے ، آیئے ڈاکٹر صاحب ! لیکن آپ نے یہاں آنے کی کیوں تکلیف کی ......خبر کر دیتے تو میں ہی آجاتا۔کوئی خاص بات ہے کیا۔؟''اُنہوں نے خلوص کا ثبوت دیتے ہوئے اُن کا پہلے خیر مقدم کیا۔پھر جب آنے کا سبب دریافت کیا تو ڈاکٹر کپل بولے۔

''ہاں کچھ خاص کام سے ہی آیا ہوں.........''

''اچھا تو پھر کہیے.........''

''وہ ٹاکیز کے سامنے جو سُپر ڈانسنگ اسکول ہے نا اُس میں میری بیٹی کا ایڈمیشن ہوا ہے۔''

سماجی ایکٹی وسٹ سبودھ بنرجی نے اپنی پتنی کو آواز دی۔'' سندھیا جی ! فریج سے مٹھائی لیتے آنا ڈاکٹر صاحب آئیں ہیں اور ساتھ میں خوش خبری بھی لائیں ہیں۔اِن کی بیٹی کا کل ہی سپر ڈانسنگ اسکول میں ایڈمیشن ہوا ہے۔''

بات ختم ہوتے ہوتے ہی سندھیا جی اندر سے حاضر ہوئیں اور ٹرے میں مٹھائی کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے بولیں۔''بہُت بہُت مبارک ہو ڈاکٹر بھائی صاحب۔''

''لیکن آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ کل اُس کا سُپر ڈانسنگ اسکول میں ایڈمیشن ہوا ہے۔''حیرت سے آنکھیں پھیل کر کچھ باہر نکل آئی تھیں۔

''ایسا ہے ڈاکٹر صاحب ! کہ کل پرنسپل صاحب ایڈمیشن رجسٹر لے کر یہاں آئے تھے۔سائن کرنے کے دوران نظر پڑ ہی گئی۔''اُس وقت سماجی ایکٹی وِسٹ کے چشمے سے جھانکتی دو آنکھیں اور بھی پیاری لگ رہی تھیں۔

لیکن اس بات پر ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بے یقینی کی حد تک زاویہ بدلنے سے سوالیہ نشان کی علامت بن گئی تھیں۔

''ایڈمیشن رجسٹر پر آپ کا سائن.........؟''

سندھیا جی، جو مٹھائی کی ٹرے رکھ کر سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھیں، مسکراتے ہوئے بولیں۔''اِن دنوں ایم ایل اے سلیم کا نے صاحب کے بہت خاص ہیں۔اُنہوں نے ہی ڈانسنگ اسکول کا سکریٹری اِنہیں بنوایا ہے۔جب بھی اسکول میں کوئی کام ہو آپ یہاں بے جھجک آجایئے گا۔سارا کام گھر بیٹھے ہو جائے گا ۔''

آدھی مٹھائی منہ کے اندر تھی اور آدھی ہاتھ میں۔منہ کا ذائقہ اس طرح تبدیل ہو گیا جیسے کسی نے کریلے کا رس منہ میں انڈیل دیا ہو۔جیسے تیسے کر کے بچی ہوئی مٹھائی کو ٹرے میں رکھ کر وہاں سے اِس طرح بھاگے جیسے مدھو مکھّی کا جھنڈ اُس کے پیچھے پڑا ہو ۔

سبودھ بنرجی اور اُن کی بیوی سندھیا جی، اُنہیں کہتے رہے کہ'' چائے پی کر جایئے گا۔''لیکن'' وہ پھر آئیں گے۔ابھی ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' کہتے ہوئے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔

باہر آتے ہی اُنہوں نے پہلے ایک ٹیوب ویل میں دیر تک کُلّہ کیا۔لیکن اِس کے بعد بھی اُن کے منہ سے کڑواہٹ نہیں گئی۔حالانکہ اُنہوں نے ایم ایل اے سلیم کا نے اور سماجی ایکٹی وسٹ سبودھ بنرجی کے پاس جانے سے پہلے بہت کچھ سوچ رکھا کہ ڈانس کے متعلّق 'یہ' کہیں گے اور ریئلیٹی شو پر 'وہ' کہیں گے لیکن اُنہیں 'یہ' اور نہ ہی 'وہ' کہنے کا موقع ملا۔مجبوراً اپنا سا منہ لے کر اُنہیں باہر نکلنا پڑا۔

باہر نکلنے کے بعد اُنہوں نے سوچا کہ اب وہ کیا کریں اور کہاں جائیں.......؟

لیکن جب راستے مسدود نظر آنے لگے تو گھر جانے کے سوا اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔شہر کے سب سے بڑے چوراہے سے گذرتے وقت، جہاں بیچوں بیچ گاندھی جی کی مورتی اِستادہ تھی، اور جسے وہ ہر روز دیکھا کرتے تھے وہاں پہنچتے ہی پاؤں رُک گئے۔مورتی کو اُوپر سے نیچے دیکھا۔کھڑاؤں، چشمے اور لاٹھی پر نظر ڈالی اور سوچا کہ ایک نہایت ہی لاغر سا نظر آنے والا یہ شخص کس طرح سے انگریزوں کے طوفان کا مقابلہ کیا ہوگا؟ یہ صرف

انگریز ہی جانتے ہوں گے..........اِس کے بعد ڈاکٹر کپل ہاتھ جوڑ کر مورتی کے سامنے اِس طرح کھڑے ہو گئے جیسے وہ آج اپنی اور قوم کی داستان سُنا کر ہی دم لیں گیں۔

''باپو! تو نے ملک کو آزاد کرایا کیا اِسی لئے کہ تیری قوم بے راہ روی کا شکار ہو جائے۔تو تو یہاں سے کھڑا کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہوگا کہ ملک کے شکچھا کا اُستر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔آج شکچھا کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی تم سے کہاں چھپا ہے باپو.......آج الکٹرونک میڈیا نے انٹرٹینمینٹ کے نام پر معصوم بچوں کے سامنے گیت سنگیت ڈانس اور ہنسی مذاق کی تھالی میں ڈبل مینگ جیسی سیکسی پکوان پروس کر اُن کے ذہن کو ایسا اسٹیریو ٹائپ بنا دیا ہے کہ رات دن اُن کی زبان پر وہی ذائقہ چڑھا رہتا ہے۔ذرا سوچو باپو! کہ اگر سبھی بچے ڈانسر، گیت کار، لافٹر یا پھر جوکر ہو گئے تو پھر ملک کی ترقّی کا کیا ہوگا۔؟

''کیا آپ ایسی ہی ترقّی چاہتے تھے باپو........؟''

''مولانا آزاد نے بچّوں کے لئے کیا ایسی ہی تعلیم کے خواب بُنے تھے باپو.......؟''

'' نہرو جی کا ''چلڈرنس ڈے'' کیا بچّوں کے لئے گیت سنگیت اور ڈانس کا منچ ہو کر رہ جائے گا باپو.........؟''

''کیا آج یہ لمحہ ٔ فکریہ نہیں ہے۔؟''

وہ بہت دیر تک 'باپو' کی 'مورتی' سے سوال کرتے رہے۔جواب نہیں ملنے کی صورت میں مورتی کو پوری طاقت سے ہلانے کی کوشش کرتے رہے۔چلاّتے رہے۔آخر میں زور زور سے رونے لگے۔

اس طرح کی عجیب وغریب حرکتیں دیکھ کر چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ سی لگ گئی ۔روڈ جام ہوا۔ٹرفک پولس کے انٹرفیئر نے بڑی مشقّت کے بعد انہیں باپوٗ کی 'مورتی' سے الگ کیا۔

☆☆☆

13

موڈرن سوسائٹی،اسٹیٹس اور لگژری کار

قارئین!

'ہائی سوسائٹی' میں گھر خریدنے سے قبل ڈاکٹر کپل کے پاس ایک پرانی اسکوٹر تھی۔لیکن شوبھا کی ضد کہ جب ہائی فائی سوسائٹی میں گھر خرید ہی لیا ہے تو اسٹیٹس کو مینٹین کرنے کے لئے کسی بھی طرح سے نئی کار خریدی جائے،ورنہ رُسوائی ہوگی.........؟

گھر کی خریداری میں لاکھوں روپئے اِدھر اُدھر سے جُٹانے پڑے تھے اور گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ایک اور مصیبت بیوی نے کھڑی کر دی تھی۔پڑوسیوں پر رُعب ڈالنے کے لئے کار اسٹیٹس سمبل کے طور پر پورٹیکو میں کھڑی رہے۔حالانکہ ڈاکٹر کپل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی،لیکن وہ اپنی بات پر اَڑی رہی کہ'' کار کے بغیر لوگ یہی کہیں گے کہ کیسے فقیر آ گئے ہیں سوسائٹی میں۔''

''کسی سوسائٹی میں رہنے سے کسی کی عزّت نہیں بڑھتی، بلکہ جہاں ہم جیسے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں، وہاں کی عزّت خود بخود بڑھ جاتی ہے........اور رہی بات کار کی تو گھر کی خریداری کے بعد اتنے پیسے کہاں ہیں کہ خریدوں؟''

ڈاکٹر کپل نے اسٹیٹس کے ترازو میں عزّت کا بٹکھرا رکھ کر جب خود کو تولنے کی کوشش کی تو ''پیسے کہاں سے لاؤں'' کا پلڑا اُوپر اُٹھ گیا،تب شوبھا نے منہ بچکاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ساتھ کے سارے ڈاکٹر خوبصورت بینگلو بنوا کر قیمتی گاڑیوں میں شان سے گھوم رہے ہیں۔اور ایک تم ہو کہ پیشے کے ساتھ وفاداری دکھانے کے چکّر میں اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی پھٹیچر بنا دیا ہے.........ارے میں تو کہتی ہوں کہ جس طرح سبھی کما رہے ہیں اُس طرح تمہیں کمانے میں کیا ہوتا ہے؟''

ڈاکٹروں کی کھلے عام چل رہی کالا بازاری میں جب شوبھا دیکھتی ہے کہ اُس کے پتی کے ہاتھ کالے نہیں ہو رہے ہیں تو اُسے بے حد افسوس ہوتا کہ کیسا بے وقوف آدمی ہے کہ مٹّی سونے کو پہچانتا نہیں ہے۔

لیکن اِدھر کچھ سالوں سے ڈاکٹر کپل اپنی شوبھا کو پہچاننے لگے تھے۔

''تم کیا چاہتی ہو کہ میں بھی دوسروں کی طرح غریبوں کی کڈنی نکال کر، لڑکیوں کو گربھ کے اندر مار کر، لاعلاج بیماریوں کا اندیشہ بتا کر طرح طرح کا ٹیسٹ کرواؤں، اور جعلی سرٹی فکیٹ بنا کر مفاد پرستوں سے من چاہی قیمت وصول کروں.........تم یہی چاہتی ہو نہ میں بھی اپنا ضمیر بیچوں اور ملک کے ساتھ، قانون کے ساتھ غدّاری کر کے تمہاری بے جا فرمائشیں پوری کروں.........؟''

یہ کہتے ہوئے جب ڈاکٹر کپل نے شوبھا کی طرف دیکھا تو اُس وقت اُس کا چہرہ اِس طرح دکھائی دیا جیسے وہ پارہ جھڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو۔

''دیکھو اِس وقت نہ ہی تمہارے اِس فالتو لیکچر سے کوئی مطلب ہے اور نہ ہی تمہاری ایمانداری سے۔ پیسے کہاں سے لاؤ گے۔؟ چوری کرو گے یا کہیں سے لون لو گے یہ تمہارا سر درد ہے.........میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جب تک نئی کار خریدی نہیں جائے گی، میں اُس گھر میں شفٹ کرنے والی نہیں۔''

پارہ جھڑے آئینے سے خود کو باہر نکالنے کی کوشش میں اُس کے چہرے کے کئی حصّے بے پارہ والی جگہ میں اٹک کر رہ گئے تھے، اِس لئے اُس وقت چہرہ اور بھی عجیب لگ رہا تھا۔

''دیکھو پاگل مت بنو۔ ہمیں یہ گھر ایک ہفتے کے اندر گھر خالی کرنا ہے۔ گاڑی کے لئے نہ پیسے ہیں نہ ہی میں کہیں سے لون لے سکتا ہوں۔ اگر کہیں سے میں نے لیا تو قرض سے کمر اِس طرح ٹوٹ جائے گی کہ ماہر سرجن کے آپریشن کے بعد بھی میں کھڑا ہونے کے لائق نہیں رہوں گا۔'' جھک کر چلتے ہوئے طنزیہ لہجے میں آگے کہا۔'' شوبھا ڈارلنگ! اور میرے پاس کوئی جادوئی چھڑی بھی نہیں ہے کہ گھماؤں اور آسمان سے نوٹوں

کی برسات ہو جائے..........''

''آسمان سے نوٹ گراؤ یا کسی پیڑ سے توڑو، مجھے ایک ہفتے کے اندر گاڑی چاہیئے ہی چاہیئے۔'' پیر پٹکتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر کپل پیچھے پیچھے کمرے میں گئے اور اُسے منانے لگے۔''شوبھا تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری حالت اِس وقت اچھّی نہیں ہے۔ جیسے ہی کچھ پیسے آ جائیں گے کار لے لیں گے۔ ویسے سکنڈ ہینڈ کار کا انتظام میں کسی طرح کر لوں گا۔ بس اب مسکرا دو۔''

''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ میں بچّی نہیں ہوں۔ مجھے بس کار چاہیئے اور وہ بھی نئی کار۔'' اور پھر وہ تکیے کو آنسوؤں سے بھگونے لگتی ہے۔

ڈاکٹر کپل نے جب یہ دیکھا کہ شوبھا کسی بھی قیمت پر ضِد سے ہٹنے والی نہیں ہے۔ تو پہلے اُنہوں نے اپنے دو چار دوستوں سے اِس کا ذکر کیا۔ لیکن سب نے بہانا کر دیا۔ آخر میں وہ ڈاکٹر حامد کے پاس گئے۔ حامد گھر کی خریداری میں پہلے ہی لاکھوں روپئے کی مدد کر چکا تھا اور عنقریب انہیں بہن کی شادی کرنی تھی۔ وہ قرض دینے کی حالت میں نہیں تھے۔ اس لئے پرائیویٹ لون کمپنی کے منیجر سے ملے اور خود گارنٹر بن گئے۔

ایک ہفتے کے اندر نئے گھر کے پورٹیکو میں نئی کار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی۔

''گھر میں جس شان سے گاڑی کھڑی ہے۔ اُسی شان سے اب لوگ ہمیں دیکھیں گے۔'' پوجا کے بعد چمچماتی گاڑی کو تلک لگاتے ہوئے شوبھا نے ڈاکٹر کپل کی طرف دیکھا۔

''گھر کی شان گاڑیوں سے نہیں، وہاں رہنے والے لوگوں سے بڑھتی ہے۔'' بیٹی کے گلے میں بانہیں ڈالے وہ مسکرا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اپنی فلاسفی اپنے پاس رکھو۔ شان گاڑی سے بڑھے یا لوگوں سے.........ہمیں گاڑی چاہیئے تھی اور گاڑی آ گئی۔ دیٹس او کے.........''

اس طرح سے کچھ دنوں کے لئے سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔

پھر کیا تھا: گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ڈاکٹر صاحب اپنی پُرانی اسکوٹر نکالتے اور کلینک کار سے جاتے۔کار چلاتے وقت اُنہیں اب ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا کہ کار خرید وا کر بیوی نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ہفتے میں وہ دو تین دن اسٹیٹس کو مینٹین کرنے کے لئے شوبھا اور بچوں کو لے کر اِدھر اُدھر ایک دو گھنٹے کے لئے نکل جاتے ۔شوبھا کی ضد پر ہفتے میں کم سے کم ایک دن کھانا باہر کھاتے۔ جب کہ یہ اُنہیں پسند نہیں تھا ۔لیکن ایک دن کا معاملہ تھا۔اس لئے وہ شوبھا کی خوشیوں پر رُوک لگانے سے گریز کرتے۔

☆

سُپر ڈانسنگ اسکول میں پریتی کا ایڈمیشن ہوتے شوبھا کے معمول میں بدلاؤ آنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ اب ڈاکٹر کپل کو پہلے کی طرح اسکوٹر سے کلینک بھیجنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ پریتی کو ڈانسنگ اسکول پہنچانے اور لانے میں کار کا استعمال کر سکے۔ یہ بات ڈاکٹر کپل کو ناگوار گذری۔اُنہوں نے کہا۔

''دیکھو! پریتی کے لئے کوئی ٹیمپو یا رکشا کرلو۔''

''بات صرف پریتی کی نہیں ہے۔اُس کے ساتھ میں بھی جاؤں گی۔اور میں اب ٹیمپو یا رکشے سے جانے والی نہیں۔''

''لیکن سوسائٹی کے بہت سارے لوگ اپنے بچّوں کو اسکول ٹیمپو سے چھوڑنے جاتے ہیں۔اس میں برائی کیا ہے۔؟''

لیکن اُس نے یہ کہہ کر ڈاکٹر کپل کی باتوں کو رد کر دیا کہ ''تم تو کار خرید ہی نہیں رہے تھے۔میں نے کہا تھا خریدنے کے لئے۔ اِس لئے تم چپ چاپ اپنی اسکوٹر سے جاؤ۔ مجھے پریتی کا لائف دیکھنا ہے.........'' ناخن پر ہلکی ہوتی ہوئی نیل پالش کو دیکھتے ہوئے وہ آگے کہتی ہے۔''سارے بچّے جہاں رنگ برنگے کپڑے پہنے کار سے آئیں گے وہاں میری بیٹی آٹو رکشا سے جائے گی؟ اس سے تو اُس کے ٹیلینٹ پر بُرا اثر پڑے گا۔وی آئی پیز کے

درمیان تمہاری بھی عزّت مٹّی میں مل جائے گی......... ہاں! ویسے جس دن چھٹّی ہوگی اُس دن کار لے جانا۔''

دوسرے دن.........

شوبھا ڈاکٹر کپل کے کلینک جانے سے پہلے ہی مسیز شرما کے ساتھ ڈانسنگ اسکول کے لئے نکل پڑتی ہے۔

پرنسپل صاحب نے اسکول پہنچنے پر مسیز شرما اور شوبھا جی کا اسپیشل ویلکم کیا۔سینئر ڈانس ماسٹروں کو بلا کر پہلے شوبھا سے ملوایا اور پھر پریتی کو اُن کے حوالے کرتے ہوئے خاص نظر رکھنے کی تاکید کی۔کچھ دیر تینوں خوشگوار ماحول کا لطف اُٹھاتے رہے۔پھر پرنسپل نے کنکھیوں سے مسیز شرما کو دیکھا اور اُسی زبان میں کنکھیاتے ہوئے کچھ کہا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''شوبھا تم پرنسپل صاحب سے پریتی کے فیوچر کا بلو پرنٹ تیّار کروالو۔ مجھے ایک ضروری کام ہے.........'' پھر پرنسپل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''اگر آپ اِس وقت اپنے ڈرائیور سے مجھے بھجوادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

مسیز شرما کے جانے کا جیسے پرنسپل کو انتظار ہی تھا۔اُدھر گاڑی اِسٹارٹ ہوئی اور اِدھر اُنہوں نے شوبھا کو ریسٹورینٹ میں کافی پینے کی پیشکش کر دی۔ جسے اُس نے قبول کر لیا۔

کافی کی چسکیوں کے درمیان پرنسپل صاحب کی نظریں بار بار اُس کی جالی دار ساڑی کے اندر کھُلے گلے کے بلاؤز سے جھانکتی قیامت پر پڑ رہی تھی۔شوبھا بار بار ٹیبل پر کہنی رکھ کر بات کرتے کرتے جھُک کر دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں جب پرنسپل نے محسوس کیا کہ وہ شوبھا سے نظریں بچا کر چاند کا دیدار ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ چاند خود بےتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے تو وہ مسکرانے لگے۔

''آپ بہت خوبصورت ہیں شوبھا جی۔''

''یہ کس نے کہہ دیا.......؟'' ادائے بے نیازی سے وہ بولی۔

''یہ تو آپ کو اپنی جالی دار ساڑی سے پوچھنا ہوگا، جس نے چاند کو اور بھی حسین بنا دیا ہے۔'' پرنسپل نے مسکراتی آنکھوں کے خوبصورت اِشارے سے اُس کے گلے کی گہرائی تک اُترنے کی شرارت کی۔

شوبھا شرماتی لجاتی ہوئی جالی دار آنچل کو درست کرنے کے بہانے کچھ اور جُھک گئی۔ اور پھر کر اُسی اسٹائل میں آنچل کو کندھے پر دوبارہ ڈال دیا۔

''دیکھئے حُسن چھپانے کی چیز نہیں ہے۔ جتنا چھپائیں گی وہ اتنا ہی نُمایاں ہوگا۔'' پرنسپل نے اُن اُبھاروں پر ایک پارکھ کی طرح نگاہ ڈالتے ہوئے حُسن کے لُغت سے نئے معنیٰ اخذ کر کے اُسے خیال کا نیا پیراہن عطا کرنے کی کوشش کی۔

''اِس فلسفیانہ خیال نے تو مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے۔'' قاتل اداؤں سے اُس نے پرنسپل کی طرف دیکھا اور جالی دار آنچل کو ادائے دلبری سے ایک بار پھر کندھے کی طرف اُچھال دیا۔

پھر اس کے بعد کیا تھا۔ شوبھا پریتی کو ڈانس ماسٹروں کے سپرد کرنے کے بعد ہر روز پرنسپل صاحب کے چیمبر میں پرفارمینس جاننے کے بہانے پہنچ جاتی۔ اور پرفارمینس پر گفتگو کے بہانے پرنسپل صاحب شوبھا کو ریسٹورینٹ لے جاتے۔

ایک دن ڈاکٹر کپل کے ایک دوست نے ریسٹورینٹ میں جب پرنسپل صاحب کے ساتھ شوبھا کو کہنی کے بل ٹیک لگا کر مسکراتے ہوئے دیکھا تو اُنہیں اچھّا نہیں لگا۔ شوبھا اُسے بہت اچھّے سے نہیں جانتی تھی۔ بس اُسے لگا کہ اُسے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن وہ شوبھا کو اچھّی طرح پہچانتا تھا۔ دو تین دن لگاتار دیکھنے کے بعد شک گذرا اور اُنہوں نے کیش کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان سے جس کے ساتھ تھوڑی بہت شناسائی ریسٹورینٹ آتے جاتے ہوگئی تھی، معلوم کیا تو پتہ یہ چلا کہ یہ رومانٹک جوڑا ہر روز یہاں آتا ہے اور دو تین گھنٹے کونے والی ٹیبل پر گذار کر چلے جاتا ہے۔

پرمود جو انجینیئر تھا۔ اکثر لنچ ٹائم میں ریسٹورینٹ آیا کرتا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر کپل کی خانگی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اس راز سے پردہ اُٹھا دیا۔

بگڑیل گھوڑی کے مُنہ میں لگام لگانے کے لئے جب ڈاکٹر کپل نے اُسے اپنے بس میں کرنا چاہا تو اُس نے اِس زور سے دولتّی ماری کہ وہ چاروں خانے گر پڑے۔

''تم نرسنگ ہوم میں نرسوں کے ساتھ رات رات بھر جس طرح گل چھرّے اُڑاتے ہو۔ وہ کون نہیں جانتا..........؟'' آنکھ کی کٹوری میں گولیوں کو نچاتے ہوئے بولی۔ ''.زیادہ پارسا بننے کی کوشش مت کرو۔ تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں میں۔ ایک سیدھا سادھا پرنسپل اگر کبھی کبھی مجھے کافی پلاتا ہے تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے.........؟ اگر اُس نے کسی رات مجھے ڈنر کے لئے اصرار کیا تو میں وہ بھی اُس کے ساتھ لے سکتی ہوں۔ کیوں کہ میری بیٹی کا مستقبل اُس کے ہاتھ میں ہے۔ سمجھے!''

اور نہیں سمجھتے ہوئے بھی اُس دن اُنہوں نے سب کچھ سمجھ لیا تھا کہ پریتی کے مستقبل کے لئے وہ اتنی بے چین کیوں ہے؟

بے چینی کے ڈنک کا زہر جب اُس کے لہو میں گھلنے لگا تو ڈاکٹر کپل کی تلملاہٹ میں اور بھی اِضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس پر کسی نوشادر اور چونے کے لیپ کا کوئی مثبت اثر نہیں ہوا۔

اِس طرح مدّتوں اُن کی شریانوں میں یہ زہر دوڑتا رہا۔

☆☆☆

14

لاؤنچنگ پیڈ اور بونسائی طوائف

قارئین!

شریانوں میں دوڑتے زہر نے دھیرے دھیرے ڈاکٹر کپل کی صحت پر اثر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے باعث اُن کی سوچ کمزور پڑنے لگی تھی۔ شوبھا کے سامنے سارے پلان دھرے کے دھرے رہ گئے، اور اب اپنے ہی گھر میں ان کی ایک نہیں چل رہی تھی۔

دوسری طرف شوبھا اپنے سنہرے منصوبے کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے مستعدی کے ساتھ عمل پیرا تھی۔ اب وہ اسکول اور چھوٹے چھوٹے کلبوں میں پریتی کے ڈانس کی نمائش لگانے لگی تھی۔ اِس نمائش کو لے کر دونوں کے درمیان ہمیشہ تضاد دیکھا گیا۔ جہاں شوبھا پرنسپل کی مدد سے پریتی کے ڈانس کو لوگوں میں مقبول بنانے اور شہرت کی اونچائیاں عطا کرنے میں رات دن لگی ہوئی تھی، وہیں چوراہوں، دکانوں اور دیواروں پر ڈانسنگ پوز میں پریتی کی قدِ آدم تصویریں دیکھ کر ڈاکٹر کپل کی آنکھیں غُصّے سے سُرخ ہو جاتیں۔ پہلی بار جب شوبھا نے پریتی کے لئے شہر کے بیچوں بیچ ڈانسنگ منچ تیّار کیا تو اُنہیں ایسا لگا جیسے شوبھا نے کسی اونچی جگہ پر اُن کی بیٹی کے لئے قبر گاہ تیّار کیا ہے۔ اُس دن کلینک سے گھر آتے ہوئے ہر جگہ اِن تصویروں نے اُن کا پیچھا کیا تھا اور کئی بار اُنہوں نے راستہ بدل کر بھاگنے کی کوشش کی تھی، لیکن کامیاب نہیں ہوئے کہ ہر جگہ وہی ادھ ننگی تصویریں اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اُس دن کلینک سے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ گھر پہنچ کر اُنہوں نے جیسے تیسے اسکوٹر اسٹینڈ کیا۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ شوبھا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سجنے سنورنے کا ریہرسل کر رہی ہے۔ اُس وقت ڈاکٹر کپل نے غصّے میں اُس کا بازو پکڑا اور جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''گھر کی دہلیز کے اندر جس بیٹی کو ہونا چاہئے تھا، اُس کے پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر تم نے اُسے چوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔ بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا........؟'' ڈاکٹر کپل رونے لگے تھے۔

رونے کی وجہ سے اُن کے ہاتھوں کا دباؤ بازوؤں پر کمزور پڑ گیا۔ اِس لئے شوبھا خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ کپل سر پکڑے دیر تک روتے رہے۔

لیکن شوبھا کو آنسوؤں سے کوئی مطلب تھا اور نہ باپ کے جذبات سے....... پیسے کے لالچ میں وہ اندھی ہو گئی تھی۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر کچھ دکھائی دے رہا تھا تو وہ تھی پریتی کی قدِ آدم تصویریں تھیں، جو ہر گلی، نکّڑ اور چوراہے پر آویزاں تھیں۔

''جتنی تصویریں تمہاری پوری زندگی میں نہیں چھپی ہوں گی، اُس سے کہیں زیادہ تصویریں ایک دن میں شہر کی دیواروں پر پریتی کی چسپاں ہوئی ہیں۔'' چوٹ کھائی ہوئی شیرنی کی طرح پلٹ کر شوبھا نے اُس کے کانوں پر زور کا پنچہ مارا۔

''ایسی تصویروں کا کیا حاصل جسے دیکھتے ہی لوگوں کو کوٹھے کی یاد آ جائے۔'' پنجے سے بچتے ہوئے ڈاکٹر کپل نے اُس کی طرف طنزیہ جملہ اُچھالا۔

''تمہیں ڈانسنگ منچ کوٹھا دکھائی دیتا ہے اور بیٹی میں ایک طوائف کے بچپن کا عکس........'' وہ غصّے سے پوری طرح تمتمائی ہوئی تھی۔ ''تمہیں شرم آنی چاہئے بیٹی کے بارے میں اِس طرح کی گھناؤنی بات کرتے ہوئے۔''

شوبھا نے ڈانسنگ منچ کو ''کوٹھا'' اور بیٹی کو ''طوائف'' سے تعبیر کرنے والے باپ کی گندی ذہنیت کو جم کر گالی دینے کے بعد جب ایک نظر آئینے میں ڈالی تو اپنی تصویر کو خود کے سامنے سرخرو پایا۔

''شرم مجھے آنی چاہئے یا تمہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ لیکن میں کسی بھی قیمت پر اُسے منچ پر ڈانس کرنے نہیں دوں گا۔ اور تم میری مرضی کے بغیر یہ کر بھی نہیں سکتی۔ کیوں کہ

میں اس کا باپ ہوں ۔ باپ.........‘‘ ڈاکٹر کپل نے سینہ ٹھونک کر اپنے عزم کا اِظہار کیا تو کچھ حد تک شوبھا کی بوکھلاہٹ سامنے آ گئی ۔

’’دیکھو! بیکار میں اپنا خون مت جلاؤ۔ بیٹی ہماری ہے ۔لیکن فکر ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کو ہے ۔ وہی اِس پروگرام کے اِسپانسر ہیں ۔اور تم تو جانتے ہو کہ وہ کیسا آدمی ہے ۔میری بات سمجھ گئے نا.........؟‘‘ بوکھلاہٹ میں اُس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا نہیں چاہتی تھی ۔

’’وہ کیوں لانچ کرے گا میری بیٹی کو ....وہ اچھا آدمی نہیں ہے .... کرمنل ہے سالا ۔‘‘ ڈاکٹر کپل غصّے میں پاگلوں کی طرح چیخنے لگے تھے ۔’’دوسروں کی بیٹیوں کو لانچ کرتا ہے حرام خور ....ایک بار اپنی بیٹی کو لانچ کرنے کا مجھے موقع دے تب سمجھ میں آئے گا کہ چھچھڑوں پر کتّوں کی نظر کیسے پڑتی ہے ۔‘‘

’’دھیرے بولو.........ابھی خود یہاں ایم ایل اے سلیم کانے صاحب آنے والے ہیں ۔‘‘ خوف و دہشت کی چکّی میں لفظوں کے دانے کو پیستے ہوئے شوبھا نے ’کڑ کڑ‘ کی بے ہنگم آواز سے اُنہیں ڈرانے کی کوشش کی ۔

’’میں کسی سے نہیں ڈرتا ....حرامی ہیں وہ لوگ ۔ اُنہیں تو یہی سب کچھ چاہئے ۔‘‘ کہنے کو تو وہ یہ سب کچھ کہہ رہے تھے لیکن ڈر کا پنچھی اُن کے دل کے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا تھا ۔

’’کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ تو پریتی کو بیٹی سمجھتا ہے ۔‘‘ شوبھا پاک رشتے کے دھاگے سے بات کو رفو کرنا چاہتی ہے ۔

’’ماں کو رکھیل سمجھنے والا اُس کی بیٹی کو بیٹی تب تک کہتا ہے جب تک وہ چھوٹی ہے ....ان مادر.........کو اگر کسی نے ایک بار بیٹی کہنے کا موقع دے دیا تو وہ اُس کی عزّت سب سے پہلے تار تار کرتے ہیں ۔ میں کہتا ہوں کہ اِن کتّوں سے خود بھی بچو اور پریتی کو بھی بچاؤ ۔‘‘

کرمنل بیک گراؤنڈ رکھنے والے سیاست دانوں کی گندی ذہنیت سے وہ بخوبی واقف ہیں اِس لئے ہاتھ جوڑ لیتے ہیں ۔لیکن شوبھا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔

’’تم پاگل مت بنو ۔ ابھی تمہاری بیٹی بہت چھوٹی ہے ۔ کوئی بھی اِس طرح کی گندی بات نہیں سوچ سکتا.........‘‘ شوبھا جب یہ کہہ رہی تھی تب پریتی سے بھی کم عمر لڑکیوں کے دل دہلا دینے والے واقعات ری وائنڈ ہو کر تصویروں کی صورت میں اُس کی آنکھوں کی اسکرین پر گھوم رہے تھے ۔لیکن وہ اگر اقرار کرتی تو پھر اُس کی عیاشانہ زندگی کا کیا ہوتا؟ کروڑوں روپئے کہاں سے آتے ۔؟

’’چھوٹے سے بیج کے اندر ایک بڑا پیڑ چُھپا ہوتا ہے ۔ ہم چھوٹے پودے کی جڑوں میں پانی اِس لئے ڈالتے ہیں کہ بڑا ہو کر وہ ہمیں پھل دے گا.........اِس بات کو تم مانتی ہو یا نہیں.........؟‘‘ ڈاکٹر کپل نے فطری نظام حقیقت کو آشکار کیا ۔

لیکن جواب دینے سے پہلے ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کی قیمتی کار گیٹ کے سامنے آ کر رک گئی ۔ سفید شرٹ سفید پینٹ اور سفید جوتے میں وہ اُترے تو شوبھا اِس طرح دوڑتی ہوئی اُن کے پاس پہنچی اور ہاتھ جوڑ کر مسکرائی جیسے بھگوان نے درشن دیئے ہوں ۔

اِن کے پہنچتے ہی ڈاکٹر کپل بیٹی کو لے کر اندر کمرے میں چلے گئے ۔

ڈرائنگ روم میں پہنچے تو اُنہوں نے پہلے شوبھا کو چشمے کے اندر سے اُوپر سے نیچے تک دیکھا ۔مُسکرا کر حُسن کی تعریف کی اور کہا ۔

’’ایسا ہے شوبھا جی! منچ کا سارا کام دوپہر تک پورا ہو جائے گا ۔‘‘ جیب سے روپئے کا بنڈل نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے ۔’’پچیس ہزار ہیں ۔ پروگرام کے بعد ہو سکتا ہے کہ منتری ونتری بدھائی کے لئے گھر تک پہنچ جائیں تو یہ ناشتے واشتے کے کام آئیں گے ۔‘‘

’’ایم ایل اے صاحب اِس کی کیا ضرورت تھی ۔‘‘ ہاتھوں سے نوٹوں کا بنڈل لیتے ہوئے بولی ۔’’بس آپ کا آشرواد میری بچّی کے سر پر بنا رہے یہی میرے لئے بہت ہے ۔‘‘

''اس کی چنتا آپ نہ ہی کریں تو اچھا ہوگا۔''

''ارے جب آپ ہیں تو پھر مجھے کیسی چنتا.......؟ وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔ جیسے اُسے واقعی کوئی فکر نہ ہو۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک ایم ایل اے سلیم کانے کو ڈاکٹر صاحب کی یاد آ گئی۔ اُنہیں لگا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں اِس لئے وہ ہاتھ واتھ پکڑنے سے پہلے مطمئین ہو جانا چاہتے تھے۔ آہستہ سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔ کلینک سے آئے نہیں کیا۔؟''

''اندر کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔'' جتنا دھیرے ایم ایل اے صاحب نے کہا تھا اِس کے برعکس اُس نے اتنی ہی تیز آواز میں جواب دیا۔

''ارے تو اُنہیں بلایئے نا۔ تاکہ اپنی طرف سے آمنترت کر دوں۔'' بات بدلتے ہوئے فوراً اِس موقعے کو کیش کرانا چاہا۔

''شوبھا اندر جا کر اُنہیں ایم ایل اے صاحب کے پاس چلنے کے لئے کہتی ہے۔ وہ انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی شوبھا زبردستی اُنہیں پکڑ کر لے آتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے........'' آج بہت تھکے ہارے ہیں اِس لئے جلدی سونے جا رہے تھے۔''

''جلدی سونا صحت کے لئے نقصاندہ ہے ڈاکٹر صاحب!.......'' چندلے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے گندے دانت باہر کر دیئے۔'' آج جتنا سونا ہے سولیں کیوں کہ کل آپ کو ساری رات جاگنا ہے.........میں نے نئی نسل کی حوصلہ افزائی کے لئے ڈانس شو کا آیوجن کیا ہے۔ اِس شو کا مُکھ آکرشن پریتی ہے۔ اِس لئے آپ ضرور آیئے گا۔ کسی طرح کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا سمجھے!........اور یہ سب اِس لئے سمجھا رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ڈانس وانس میں تھوڑا بہت بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کی موجودگی بیٹی کی حوصلہ افزائی کے لئے ضروری ہے۔'' شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے اُنہوں نے اپنی کائی زدہ بتیسی باہر نکال دی۔

جاتے جاتے سلیم کانے نے ڈاکٹر کپل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو ہاتھ بڑھانے میں اُنہوں نے تساہلی سے کام لیا اور ملایا بھی تو بے دلی سے۔ اِس لئے جیسے ہی ایم ایل اے سلیم کانے کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی، شوبھا بھڑک اُٹھی۔

''آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ اتنے بڑے شخص ہمارے گھر آئے۔ ہماری ہی بیٹی کے پہلے ڈانسنگ شو کی دعوت دینے کے لئے.........اور آپ ہیں کہ اُن سے ہاتھ ملانا نہیں چاہتے تھے، جیسے اُن کے ہاتھ میں بچّھو ہو۔''

''بچّھو کا کاٹا تو تڑپ تڑپ کر زندہ رہ جاتا ہے لیکن کانے جیسا نیتا جب کاٹتا ہے تو اُسے پانی پینے کا موقع تک نہیں ملتا۔'' ڈاکٹر کپل کے اندر ایسے نیتاؤں کے خلاف جو زہر تھا وہ باہر آ گیا تھا۔

شوبھا بُرا سا منہ بنا لیتی ہے۔'' آپ کو کوئی اپنا دل بھی نکال کر دے دے نا تو بھی آپ اُس پر بھروسہ نہیں کریں گے........اب چاہے کچھ بھی ہو لیکن آپ کو کچھ دیر کے لئے وہاں جانا ہی ہے۔ سمجھے!'' شوبھا نے یہ بات اِس طرح سے کہی جیسے وہ اُنہیں سمجھا نہیں، دھمکا رہی ہو کہ اگر شو میں نہیں گئے تو سلیم کانے کے موڈ کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اُلٹے لٹکا بھی دیں گے۔

شوبھا یہ جانتی تھی کہ ڈانس سے جتنی بھی نفرت ہو اُنہیں لیکن وہ پریتی کا سایہ بن کر وہاں ہر حال میں موجود رہیں گے۔

ڈاکٹر کپل کے چہرے پر شوبھا کے دھمکانے کا اثر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ گُم صُم سے کھڑے رہے۔ پھر بغیر کوئی جواب دیئے کمرے میں چلے گئے۔ پنکھے کو گھنٹوں دیکھتے رہے۔

اُس رات اُنہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

☆☆☆

15

گاندھی چوک، پمپلیٹ اور دوسرا کمرہ

قارئین!

دوسرے دن جب کلینک جانے کے لئے ڈاکٹر کپل نے اپنی کھٹارا اسکوٹر نکالی اور معمول کے مطابق جھٹکا کر ابھی کِک مار رہے تھے کہ تبھی شوبھا صدر دروازے کے اُفق پر نائٹ گون میں طلوع ہوئی۔

''دیکھیئے! ایم ایل اے صاحب کو ناراض کرنے کا مطلب سمجھتے ہیں نا؟ اِس لئے آدھا گھنٹہ ہی سہی، لیکن وہاں آجایئے گا۔''

شوبھا نے یہ سب کچھ اِس ملائمیت سے کہا جیسے اُس کو یہ فکر ہو کہ کہیں نہیں گئے اور سلیم کانے نے بُرا مان لیا تو جینا دوبھر ہو جائے گا۔ اُس کی بھی بدنامی ہوگی۔ اِس رُسوائی سے بچنے کے لئے شوہر سے منّت سماجت کر رہی ہو کہ وہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی لیکن چہرہ ضرور دکھانے آجائیں۔

ڈاکٹر کپل کِک مارنے میں لگے رہے۔ اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جیسے ہی بوڑھی اسکوٹر اِسٹارٹ ہوئی، وہ کلینک کے لئے روانہ ہو گئے۔

شہر کے تمام چوراہوں پر بڑے بڑے ہورڈنگ میں پریتی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کی نجی ۲۵ ؍گاڑیوں میں بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے تھے۔ اناؤنس منٹ کا کام سڑک چھاپ موالیوں کے ذمّے تھا۔ ساتھ ہی ساتھ پمپلیٹ بھی بانٹے جا رہے تھے۔ جس کا ہیڈنگ تھا۔ ''لِٹل ڈانسنگ کوئین..... پریتی سنگھ!'' اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ ''آپ سب حوصلہ افزائی کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں گاندھی چوک پہنچ کر پروگرام کی شوبھا بڑھائیں۔''

شام ہوتے ہی شہر کی دکانیں وقت سے پہلے ہی بند ہونے لگیں۔ عورتوں نے

رات کا کھانا جلدی بنا لیا تھا تاکہ منچ کے نزدیک کی جگہ حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ کیا بچّے کیا بڑے اور کیا بوڑھے سب کو پریتی کے ڈانس کا انتظار تھا۔ کیوں کہ جس طرح سے اُسے پروجیکٹ کیا جا رہا تھا مانو اِس سے قبل اِس عمر میں کسی نے ویسا ڈانس ہی نہ کیا ہو۔

ڈاکٹر کپل کی کلینک میں بھی کچھ لوگ پمپلیٹ کے ساتھ موجود تھے۔ لیکن اِن میں سے کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کی پریتی اُن کی بیٹی ہے۔ آج سب یہی چاہ رہے تھے کہ جلد سے جلد اُن کا نمبر آجائے۔ جلدی دوا کھا کر کچھ دیر آرام کریں تاکہ پریتی کے ڈانس تک اُن کی طبیعت سنبھل جائے.......... ایک نے تو پیٹ درد کا بہانہ بنا کر ایسا رویا کہ جیسے فوراً دوا نہیں ملی تو جان بھی جاسکتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر اُس کی طرف متوجّہ ہوئے۔ ہاتھ لگتے ہی درد کافور ہو گیا۔ اور وہ علاج بھی کروایا تو پیٹ درد کا نہیں بخار کا۔ ڈاکٹر کپل کو چھوڑ کر سبھی مسکرانے لگے۔

اِس چالاکی کی نقالی کرتے ہوئے دوسرا غش کھا کر وہیں گرا۔ ڈاکٹر اور نرس اُٹھانے کے لئے بڑھے تو ایک مریض نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں پہلے آیا ہوں۔ یہ ناٹک کر رہا ہے۔ صرف ڈانسنگ کمپٹیشن میں جلدی جانے کے لئے..........'' پھر وہ آگے بڑھا۔ ''رُکئے میں جوتا سنگھاتا ہوں۔ سال بھر سے پالش بھی نہیں ہوئی ہے۔ ایک منٹ میں مرگی بھاگ جائے گی۔'' جیسے ہی وہ جوتا ناک کے پاس لے گیا۔ لڑکا ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اِس کے بعد نہ ہی کسی کے پیٹ میں درد ہوا اور نہ ہی کوئی غش کھا کر گرا۔

نرسنگ ہوم میں تو سب کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ ڈاکٹر کپل سنگھ کی اکلوتی بیٹی پریتی سنگھ کا آج فرسٹ 'ڈانس شو' ہے اس لئے آتے ہی سب نے گھیر لیا۔ حالاں کہ کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ پھر بھی وی آئی پی کے لئے کچھ خاص سیٹیں محفوظ تھیں جن کے لئے ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کے دستخط شدہ پاس جاری کئے گئے تھے۔

سینیئر نرس جن کی اکثر ساتھ میں ڈیوٹی رہا کرتی تھی اُس نے دھمکانے والے

انداز میں کہا۔ ''جب تک ہم لوگوں کے لئے دس بارہ پاس کا انتظام نہیں کر دیں وارڈ میں گھسنے نہیں دوں گی۔''

لیکن جب دیکھا کہ بات بننے والی نہیں ہے تو اُس نے دوسری راہ اختیار کرتے ہوئے شوبھا کو فون کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں ایم ایل اے کا ایک آدمی وہاں دس پاس پہنچا گیا۔

جیسے جیسے شام جوانی کی بدنام گلیوں سے گذر کر رات کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی ویسے ویسے عورتیں، بچّے، جوان اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر جلد سے جلد جائے مقام تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ پریتی کی ایک جھلک پانے کے لئے بے تاب تھے۔

ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کی گاڑیاں سڑکوں پر اب بھی دوڑ رہی تھیں۔ کارندے اپنی اپنی ذمّہ داریوں کو بیوٹی ٹچ دینے میں لگے ہوئے تھے۔ اور اِن تمام کاموں کا باریک بینی سے سُپر ڈانسنگ اسکول کے پرنسپل جائزہ لے رہے تھے۔ کہ کمی نہ رہ جائے۔ ایم ایل اے سلیم کانے صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ اس لئے فون تو ہر وقت اُن کے کان سے چپکا ہوا تھا۔ کبھی وہ کاموں کے متعلّق فیڈ بیک دیتے، تو کبھی یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اِس وقت شوبھا جی نے نہایا یا نہیں۔ کپڑے جو ایم ایل اے صاحب نے بھجوائے ہیں وہ پسند آئے یا نہیں۔

پریتی کے چاروں آئٹم پرفارمینس کے لئے چار الگ الگ ڈریسیز ایم ایل اے صاحب نے مشہور فلمی ڈیزائنر سے ڈیزائن کروایا تھا۔ اور اِس خاص موقعے پر شوبھا کے لئے بھی اُسی فیشن ڈیزائنر سے پنک کلر کی ساڑی پر ایسے گل بوٹے کھلوائے تھے کہ آسمان کے چاند ستارے کو اگر خبر ہو جاتی تو وہ بھی دیکھنے کے لئے زمین پر اُتر آتے۔

گھر کی دہلیز پر شام اپنے پنکھ پھیلائے اُتر رہی تھی۔ شوبھا پنک ساڑی کے ساتھ ریہرسل میں مصروف تھی۔ آئینے میں خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت اُس کے چہرے کے تاثّر سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کوئی آئٹم سونگ کرنے جا رہی ہو۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اِس دوران اُسے ذرا خیال نہیں رہا کہ اُسے پریتی کو بھی تیّار کرنا ہے۔

خیال تب آیا جب مسیز شرما اپنی بیٹی کنول کے ساتھ بن ٹھن کر اُس کے گھر پہنچی۔

''ارے چھمک چھلو! تمہیں تو پہلے پریتی کو تیّار کرنا تھا۔''

''پریتی کو.........؟ اُسے تو ڈانسنگ ٹیم تیّار کرے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں سے کیا وہاں تک وہ ننگی جائے گی۔ اِس کے لئے بھی تو آپ نے کپڑے بنوائے ہوں گے۔''

''لو یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔ پرنسپل صاحب نے اسپیشل ڈریس بھیجا ہے۔ بس آپ آ ہی گئی ہیں تو اب فٹافٹ وہ بھی تیّار ہو جائے گی۔'' شوبھا لچھے دار باتوں میں اُلجھا کر اپنی بھول کو صفائی سے چھپانے لگی۔

''ممی میری آج کتنی سندر لگ رہی ہیں انٹی۔'' چہکتے ہوئے پریتی بولی۔

''ہاں ہاں.....لیکن ایسے موقعے پر 'ماں' کو 'سندر' کم لگنا چاہئے۔'' مسیز شرما نے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے ایک آنکھ دبائی۔

''وہ کیوں انٹی........؟'' پریتی نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔

اِس سے پہلے کہ مسیز شرما کچھ کہتی، کنول بول پڑی۔

''آپ بھی تو میرے ڈانس شو میں سج دھج کر جاتی ہیں اور آج بھی قیامت لگ رہی ہیں۔'' یہ کہتے وقت کنول کے چہرے پر رازدارانہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''چپ! بچّوں کو ممیوں پر نظر نہیں رکھنی چاہئے۔ سمجھی۔''

نظریں نیچی کئے مسیز شرما نے شیریں زبان میں جب تنبیہ کی تو چیونٹیوں کا یلغار ہونا طے تھا۔

''ہاں ہاں اِسی لئے تو جب کبھی ایم ایل اے صاحب گھر آتے ہیں تو ممی مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیتی ہیں۔''

پریتی نے بڑی ہی معصومیت سے ایم ایل اے صاحب کے آنے اور دوسرے کمرے میں جانے کا جو آنکھوں دیکھا قصّہ بیان کیا اُس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کنول

نے بھی ایک نیا قصّہ چھیڑ دیا۔ اِس کے قصّے کے بیان میں دوسرا کمرا بھی تھا۔لیکن پریتی والی وہ معصومیت نہیں تھی ۔کیوں کہ معصومیت کا تعلق کچھ حد تک ناسمجھی اور بھولے پن سے ہے۔لیکن اب کنول اتنی بھولی نہیں تھی کہ ناسمجھی کی بات کرتی۔ وقت نے اُسے اچھّا خاصا سمجھدار بنا دیا تھا۔ اِس لئے اُس نے سمجھ داری دکھاتے ہوئے سمجھ داری والی ایسی بات کی کہ کچھ دیر کے لئے مسیز شرما بھی چپّ ہوگئیں۔

''لیکن میرے یہاں اب ایسا نہیں ہوتا، میں چوں کہ تم سے تین چار سال بڑی ہوں اور کچھ سمجھ دار بھی ہوگئی ہوں اِس لئے ایسا ویسا کچھ دیکھتے ہی خود دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔''

سمجھداری بھری ہنسی ہنستے ہوئے جب وہ پریتی کے چہرے پر بھی ویسی ہی ہنسی دیکھنے کی کوشش کرتی ہے تو مسیز شرما کو اپنی چُپّی توڑنی پڑتی ہے کہ کہیں وقت سے پہلے پریتی سمجھدار ہوگئی تو اُس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

''کنول! تم یہ کون سی بات لے کر بیٹھ گئی ہو۔ابھی سے پریتی کے ساتھ اِس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔'' یہ کچھ اِس انداز میں کہا تھا کہ پریتی کو چھوڑ کر سب ہنس پڑے تھے ۔پھر اُسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔''شوبھا آنٹی مجھ سے بھی زیادہ سمجھ دار ہیں ۔تمہارے پر فارمینس کے لئے پرنسپل صاحب نے فنڈ اکٹّھا کیا تھا، لیکن پریتی کے ٹائم میں تو انٹی نے خزانے پر ہی ہاتھ مار دیا۔ایم ایل اے سلم کا نے صاحب تو اِن پر لٹّو ہو گئے ہیں۔''

''ارے مسیز شرما یہ سب بات چھوڑو۔تمہارے پاس تو خزانے کا بھنڈار ہے، تم تو کنول کے ساتھ مہینوں باہر رہی ہو۔ابھی تو میں گھر میں رہ کر گھر کے ہی کھانے پر اِکتفا کر رہی ہوں ۔لیکن اُمیّد ہے کہ کل اِسٹار ہوٹلوں کی شاندار پارٹیوں پر ہمارا بھی قبضہ ہو گا۔'' پنک آنچل کے جھروکے سے شوبھا نے آنکھ ماری۔

''بھگوان تمہاری اِچّھا پوری کرے۔''

ماں کی اِس بات پر کنول کھلکھلا کر ہنسنے لگی، لیکن پریتی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آنٹی

کی بات پر کنول کیوں ہنس رہی ہے اور اُس کی ممّی ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کیوں چپ رہنے کا اِشارہ کر رہی ہیں۔

پھر مسیز شرما اور کنول پریتی کو سجانے میں لگ گئیں۔

پریتی کو میک اپ کے بعد جب شوبھا دیکھا تو وہ اُسے عمر سے دو تین سال بڑی نظر آئی۔ پھر اُس نے کنول کو دیکھا جو اپنی عمر سے کئی گُنا بڑی باتیں کر رہی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگتی ہے کہ پریتی سات سال کی عمر میں اگر نو دس سال کی لگ رہی ہے تو اُس کی جھولی میں دو تین سال پہلے ہی فائدے گرنے لگیں گے۔

☆

خوبصورت لڑکیوں کی عمر خواہ کچھ بھی ہو چھوٹی کو بڑی اور بڑی کو چھوٹی بنا کر دیکھنے کا ہنر دنیا کے زیادہ تر مردیوں سمجھئے ماں کی کوکھ سے ہی سیکھ کر آتے ہیں۔

ایسے میں جہاں شوبھا کو اِس بات کی فکر ہونی چاہئے تھی کہ پریتی عمر کے مطابق ویسی دکھائی دے جیسی وہ اصل میں ہے ۔لیکن اپنی عمر سے بڑی نظر آنے کے باوجود شوبھا کے چہرے پر ایک طرح کا اطمینان تھا۔ایک ایسا اطمینان جو ہمیشہ بڑھتے بچوں کی ماؤں کو تب ہوتا ہے جب وہ گھر سے مہمان نوازی کے لئے نکلتی ہیں تو اُنہیں اِس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ اب اُس کے بچّے میزبان کے بستر پر پیشاب نہیں کریں گے۔

☆☆☆

16

چاند کی گولائی، دیدارِ حُسن اور اپلیکیشن فارم

قارئین!

اب شام کے آنگن میں بیٹھ کر کوئی بھی رات کی خوبصورتی کو آنکھوں کے کیمرے میں قید کر سکتا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان میں تارے اپنی چھٹا بکھیر رہے تھے۔ چاند اپنی گولائی میں تھا اور چاندنی آنکھوں سے آنگن کی طرف جھانک رہی تھی۔ شاید زمینی مخبر نے یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ آج اِس گھر کی خوبصورتی سرِ عام ہونے والی ہے اِس لئے وہ بھی دیدارِ حُسن کے لئے بے تاب تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کا خاص ڈرائیور گاڑی لے کر آیا تو شوبھا نے جلدی جلدی پریتی کے کپڑے، میک اپ کِٹ اور ضروری سامان گاڑی میں رکھوا دیا۔ پریتی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مسیز شرما دونوں گاڑیوں کے پیچھے اسٹیئرنگ سنبھالے کنول کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

تینوں گاڑیاں قریب پندرہ منٹ کے بعد اِسی ترتیب سے ڈانسنگ منچ کے دائیں طرف جا کر رک گئیں۔

ایم ایل اے سلیم کانے صاحب جو پہلے سے ہی وہاں کرسی پر موجود تھے، استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ تیزی سے لپکے اور دروازہ سے باہر نکلنے میں شوبھا کی مدد کی۔ اِس دوران پرنسپل صاحب بھی ویلکم کے لئے پہنچ گئے تھے۔

''آیئے آیئے مسیز شرما! بہت دیر کر دیں آپ نے آنے میں۔'' بول تو وہ مسیز شرما سے رہے تھے لیکن ہاتھ کنول کی طرف بڑھا کر اُسے کار سے اُترنے میں مدد کر رہے تھے۔

''دیر تو ہونی ہی تھی۔ بیٹی کو چھوڑ کر خود آئینے کے سامنے جو بیٹھی تھیں محترمہ ....جیسے آئٹم سانگ پر اُنہیں ہی پرفارم کرنا ہے۔''

شوبھا کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے مسیز شرما نے جب یہ کہا تب ایم ایل اے صاحب ایک ہاتھ سے شوبھا کو اور دوسرے ہاتھ سے پریتی کو سنبھالے اُس کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ مسیز شرما کی اِس بات پر شوبھا مسکرا رہی تھی۔ سلیم کانے نے چٹکی لی۔

''بھلے آئٹم سانگ پر پرفارم نہ کریں لیکن آج کسی آئٹم سے کم نہیں لگ رہی ہیں۔ اگر آپ سب کہیں تو اُنہیں بھی منچ پر نچوا کر سو پچاس لونڈوں سے سیٹی بجوا دوں۔؟'' ایم ایل اے صاحب شوبھا کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بہکے بہکے سے انداز میں بولے۔

پھر سب منچ کے پیچھے گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ گئے۔

''انکل! ممی کمرے میں بہت اچھا ڈانس کرتی ہیں۔'' پریتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا! یہ تو مجھے نہیں معلوم.......'' ایم ایل اے صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو آج کمرے میں لے جا کر معلوم کر لیں گے۔'' مسیز شرما نے دھیرے سے پرنسپل صاحب کو آنکھ ماری جو کنول کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پریتی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ٹھیک اُسی وقت ایم ایل اے سلیم کانے صاحب سے ملنے کے لئے کچھ لوگ قریب آنے لگے تو اُنہوں نے مسیز شرما کی باتوں کا جواب دیئے بغیر بات کا رُخ بدل دیا۔''

''لِٹل کوئین پریتی جی! تم آج خوب محنت سے ڈانس کرنا تا کہ ہم لوگوں کی عزّت رہ جائے۔''

''جی انکل.........!'' پریتی ڈانسنگ پوز بناتی ہوئی بولی۔

''میں نے پریتی کے چاروں ڈانس دیکھے ہیں آج تو یہ دھوم مچا دے گی۔'' کنول نے 'دھوم' پر زور دیتے ہوئے آہستے سے پریتی کے گال کھینچے۔

''ایم ایل اے سلیم کانے بولے۔'' دھوم تو تم نے بھی خوب مچایا ہے۔ بس اپنی فزک اور بیوٹی کی وجہ سے تھوڑا مار کھا گئی۔ اس کے باوجود تمہاری ممّی نے اپنے دَم پر ایک بڑا کمپٹیشن جیتوایا ہے.........'' پریتی کی طرف دیکھتے ہوئے۔'' لیکن پریتی کا کیریئر اور بھی

برائٹ ہوگا۔ایسی مجھے امّید ہے۔''

''اتنا تو اب میں بھی جان گئی ہوں انکل کہ اِس فیلڈ میں خوبصورتی کے کیا معنیٰ ہیں۔'' کم عمری میں دورِ جدید کی ڈکشنری ان کے سامنے رکھ دیتی ہے جو اسمبلی میں قانون بناتے ہیں۔

''تم اب کافی سمجھ دار ہوگئی ہو کنول..........'' گالوں کو چیونٹی کا مزہ دیتے ہوئے ۔''سمجھ داری سے کچھ اور کام لو، تو ابھی بھی تمہارے لئے بہت سارے راستے کھُلے ہوئے ہیں۔'' پھر اُنہوں نے پرنسپل صاحب کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔اُس وقت وہ کنول کو ہی دیکھ رہے تھے۔مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں پرنسپل صاحب! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا..........؟''

''جی! آپ جنتا کے نمائندے ہیں اس لئے جنتا سے غلط کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' پھر ہنستے ہوئے بات کے ایک سرے کو پکڑ کر دوسری طرف کر دیا۔''منتری جی کے نظرِکرم نے کنول کو اتنی اونچائیوں تک پہنچایا تھا۔لیکن اب کنول کے چہرے پر بلیک اسپوٹ نے اس کی خوبصورتی کو کچھ ماند کر دیا ہے۔جس کی وجہ سے منتری جی..........؟'' وہ کنول کے گالوں کو چھوتے ہوئے ابھی کچھ اور کہنے والے تھے کہ مسیز شرما کا چہرہ اچانک تیزابی ہوگیا ہے۔ ایم ایل اے سلیم کانے نے جب یہ دیکھا تو اپنے لفظوں میں تسلّی بھرے کیمیکل ملانے لگے۔

''ارے گھبرائیے نہیں مسیز شرما! اب ہمارے مانیہ منتری صاحب نے اُسے وہاں تک پہنچایا ہے تو اِس کے لئے کوئی نا کوئی فیوچر پلان بھی بنا رکھا ہوگا۔بس وقت کا انتظار کیجئے۔سب ہو جائے گا۔اور اگر آپ کہیئے گا تو آج ہی اُن سے ہم پروگرام کے بعد پوچھ لیتے ہیں۔''

''پروگرام کے بعد..........''مسیز شرما نے تعجّب بھرا سوال کیا۔

''ہاں ہاں! اِس پروگرام کے چیف گیسٹ ہمارے مانیہ منتری دلدار سنگھ جی ہی ہیں۔'' جملے کی ادائیگی کے ساتھ آنکھوں کی زبان بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

''ارے میں تو سمجھی تھی کہ آپ ہی چیف گیسٹ ہیں۔'' شوبھا کو پہلے سے ہی اِس کی جانکاری تھی لیکن مصلحتاً ایم ایل اے صاحب نے اُسے مسیز شرما سے راز میں رکھنے کے لئے کہا تھا۔اس لئے وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''منتری جی کی جگہ اگر کسی اور کو چیف گیسٹ بنا دوں تو سمجھو دوسرے ہی دن کرسی گئی۔منتری جی کو خوش کرنے کے لئے ہی تو ہر سال اِس طرح کے دو چار پروگرام کرواتا ہوں تاکہ کرسی پر کسی کی بُری نظر نہ پڑے۔''

شوبھا کی خوبصورتی کو نہارتے ہوئے یہ بات اِس طرح سے کہی جیسے خوبصورتی ہاتھ سے نکل گئی تو دوسری آ جائے گی، لیکن کرسی گئی تو پھر دوبارہ ہاتھ نہیں آنے والی۔''

ابھی وہ کرسی اور شوبھا کے کھیل میں جیت ہار کے متعلّق سوچ رہے تھے کہ شوبھا بیچ میں اِٹھلاتے ہوئے بول پڑی۔

''مجھے پوری امّید ہے کہ آپ بھی جلد منتری بنیں گے۔''

''اچھا ....آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا..........؟'' ایم ایل اے سلیم کانے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

شوبھا کے کچھ کہنے سے پہلے پرنسپل صاحب بولے۔

''ہمارے منتری جی بھی پہلے ایم ایل اے تھے۔بعد میں ایم پی بنے۔پھر اسی طرح کی پارٹیوں کا آیوجن کرتے کرتے منتری بن گئے..........کیوں ایم ایل اے صاحب؟۔''

کم لفظوں میں منتری جی کا بائیو ڈاٹا پیش کر کے پرنسپل صاحب نے شوبھا کی باتوں کی روشنی میں مستقبل کا آئینہ سامنے رکھ دیا۔

ایم ایل اے سلیم کانے صاحب اپنی تصویر کو نہارتے ہوئے پہلے مسکرائے۔پھر شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''شوبھا جی! آپ مسیز شرما کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ گئی ہیں۔وہ پہلے منتری جی کے یہاں جاتی تھی۔بہت اچھے انسان ہیں منتری جی! میں آپ کو اُن سے ملوا دوں

گا۔ پھر 'ریئلیٹی شو' کے لئے آپ جیسا چاہیں گی ویسا وہ لائن اپ کر دیں گے۔ نہ کہیں ٹیسٹ دینا ہوگا اور نہ ہی کچھ اور......... بلکہ گھر بیٹھے کمپیٹیشن کا لیٹر آ جائے گا۔''

یہ ساری باتیں ڈانسنگ اسٹیج کے پیچھے بنے ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں چائے اور کافی کے دوران پرائیویسی انداز میں ہو رہی تھیں۔ پریتی بھی اِن لوگوں کے ساتھ رہی۔ پھر اُسے بیوٹی پارلر سے آئی ٹیم اپنے ساتھ لے گئی۔ کنول کو بھی اُس کی ممی نے پریتی کے ساتھ بھیج دیا۔ کچھ دیر تک ''ہاہا ہی ہی'' ہوتی رہی۔ پھر اچانک ایم ایل اے صاحب نے فون کر کے اپنے پی اے اور پرنسپل صاحب سے تیاری کے متعلق جانکاری حاصل کی اور تشفّی بخش جواب موصول ہونے پر اُنہوں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے منتری جی کو فون کیا۔

''سر یہاں ساری تیّاریاں ہو چکی ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر یہاں کے لئے تیّار ہو رہے ہوں گے۔''

''ارے اِس بُڑھاپے میں کتنا کام کرواؤ گے۔ میں نے تمام ڈیپارمینٹ کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ کوئی بھی آج اپنی فائل نہ بھیجے۔ ورنہ تمہارے یہاں جاتے جاتے تھک جاتا۔ پھر کیا خاک انجوائے کرتا۔'' پھر کچھ رک کر بڑے انہماک سے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ وہ لِٹل پھلجھڑی کی ممی کے 'کیس' کا کیا ہوا.........؟''۔

''سر آپ بالکل چِنتا نہ کریں۔ فائل تیّار ہے۔ جاتے وقت اُسے اپنے ساتھ ہوٹل لے جایئے۔ آرام سے اِسٹڈی وسٹڈی اور سائن وائن کے بعد صبح تک اپنے ڈرائیور سے بھجوا دیجئے گا۔''

''تمہیں تو معلوم ہے کہ میں شروع سے انیسیل کا قائل نہیں، جہاں بھی کرتا ہوں فُل سِگنیچر ہی کرتا ہوں۔'' منتری جی نے فُل سِگنیچر کی بات چھیڑ کر بڑھاپے میں کام کرنے کی صلاحیت کو اپنے ہی ہاتھوں سے تھپتھپایا۔

ایم ایل اے صاحب کو منتری جی کی اِن خوبیوں کا علم تھا کہ وہ جب تک فائل کا تھرولی اِسٹڈی نہیں کرتے تب تک مطمئین نہیں ہوتے۔ اِس لئے اُس وقت اُنہوں نے اپنی

طرف سے اُنہیں اطمینان دلانا چاہا۔

''سر اگر ایسی بات ہے تو ایک دو دن کے لئے فائل اپنے پاس رکھ لیں۔ ہمیں منگوانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''تمہیں ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے تو جلدی ہے ....'' منتری جی کی مسکراہٹ سٹیلائٹ کی لہروں میں مدغم ہو کر موبائل کے سرکٹ سے گذرتی ہوئی کانوں کے راستے اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ تک پہنچ رہی تھی۔ ''ٹیبل سے جب تک پرانی فائل آگے نہیں بڑھتی تب تک کوئی نئی فائل نہیں لاتا۔ اِس لئے بر وقت فائل دیکھ لیتا ہوں تاکہ کام پینڈنگ نہ رہ جائے۔'' رُک کر۔'' اِدھر کچھ دنوں سے تمہاری فائلیں اپ ٹو مارک نہیں آ رہی ہیں۔ کہیں کوئی انٹری رہ گئی، تو تمہارے منتری بننے والی فائل ٹیبل پر ہی رہ جائے گی.........''

ایم ایل اے صاحب کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''لیکن سر.......! اِس بار فائل پر....... آپ کو پراپر....... اِنٹری ملے گی۔ میں نے خود سے تیّار کیا ہے۔'' آواز میں لغزش صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''چلو آج وہ بھی دیکھ لیں گے'' .... بولتے بولتے وہ رُکتے ہیں اور پھر کہتے ہیں ۔''ارے فائلوں کے چکّر میں تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ مجھے پروگرام میں کتنے بجے آنا ہے؟''

''سر میں نے اِسی لئے فون کیا تھا۔ بس آپ جتنی جلدی ہو آ جایئے......... یہاں آپ کے انتظار میں ہم سب آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔''

اِس فونی گفتگو کے کچھ ہی دیر بعد منتری جی کی چمچماتی کار منچ سے کچھ ہی فاصلے پر آ کر رُکی۔ پرنسپل صاحب بس کچھ ہی پہلے نیچے سے اُوپر آئے تھے اور مسیز شرما کے ساتھ مل کر اپنی لچھّے دار گفتگو کی ذاتی ڈور کو خوبصورتی سے کھول رہے تھے کہ اُن کی نظر لال بتّی والی گاڑی پر پڑی۔ وہ بولے۔

''لگتا ہے منتری جی آ گئے ....''

ایم ایل اے صاحب نے کہا۔''لال بتّی کے بعد بھی تمہیں لگ رہا ہے؟ چشمے کا

پاور بڑھاؤ اور دوڑو.........‘‘ جب پرنسپل تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر کار کی طرف بڑھنے لگے تو سکنڈ فلور سے جھانکتے ہوئے بولے ۔’’ منتری جی کو سیدھے گولڈن چیئر پر لے جا کر بٹھاؤ۔ تب تک میں پہنچ رہا ہوں۔‘‘

ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ منتری جی کے اُترتے ہی پرنسپل نے اُن کے پیر چھوئے۔

منتری جی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’وہ تمہارا ایم ایل اے کانے کہاں.........؟ کہیں دکھ نہیں رہا؟‘‘

’’بس وہ آ ہی رہے ہیں۔‘‘

’’تمہارا ڈانسنگ اسکول کیسا چل رہا ہے۔؟‘‘ اچانک منتری جی نے رُک کر چشمے کے اُوپر سے آنکھیں باہر کرتے ہوئے پرنسپل کی طرف دیکھا۔

’’آپ کی کرپا ہے سر.........‘‘ پرنسپل نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

’’دیکھو اِس بار میں نے سوچا ہے کہ تمہارے اسکول کا ’’کو۔ڈانسنگ اسٹیٹس‘‘ ختم کر کے صرف ’’گرلس‘‘ کے لئے مانیتہ دلوا دوں......... بولو کیسا رہے گا۔؟‘‘ چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی آنکھوں نے پرنسپل کو پڑھنے کی کوشش کی۔

’’جی اچھا رہے گا۔‘‘ پرنسپل کے چہرے پر ویسی مسکراہٹ بکھر گئی جیسی مسکراہٹ دیکھنے کے لئے منتری مہودے نے یہ اسٹیٹس والی بات چھیڑی تھی۔

’’تو پھر ایسا کرنا کہ ایک اپلیکیشن بنا لینا اور جو بھی اس کا پرفارما ہو اسے ایم ایل اے کانے سے فارورڈ کروا کر ایک ہفتے کے اندر میرے پاس بھجوا دینا۔ اور اب سے ایڈمیشن کے ٹائم اِس بات کا خیال رکھنا کہ ممّیاں بھی خوبصورت ہوں۔ سمجھ رہے ہو نا پرنسپل۔؟‘‘

’’جی.........جی سر.........‘‘

منچ کے سامنے پہنچ کر پرنسپل صاحب نے منتری جی کو گدّے دار صوفے پر بٹھایا اور خود منچ پر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے چلے گئے۔

☆☆☆

17

لٹل ڈانسنگ کوئین، آئٹم سونگ اور پنک ساڑی

قارئین!

مائک پر پرنسپل صاحب کھڑے تھے اور اُن کی آواز گونج رہی تھی۔

’’ہمارے ہر دل عزیز نیتا، ہمارے ایم پی اور مرکزی وزیرِ ویلفیئر، مانیہ دلدار سنگھ جی آپ کے بیچ حاظر ہو چکے ہیں اور اب کچھ ہی دیر میں آپ کو شبھ کامنائیں دینے کے لئے منچ پر موجود ہوں گے۔‘‘

’’خواتین و حضرات! تو اب لیجئے وہ گھڑی بھی آ گئی ہے۔‘‘ اور اِس کے ساتھ ہی ساتھ بھیڑ میں ہلچل سی پیدا ہوتی ہے اور اِس ہلچل کے ساتھ ہی سفید کرتا پاجامہ پر بلیک واسکیٹ ڈالے نیتا جی منچ پر جانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ دو چار باڈی گارڈ اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ ایم ایل اے سلیم کانے صاحب اُن کے ساتھ منچ کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔ منچ پر پہنچتے ہی منتری مہودے ہاتھ جوڑ کر اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے کسی فلمی شوٹنگ کا اوڈیشن دے رہے ہوں ۔

چاروں طرف سے منتری جی کی جئے جئے کار کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اِس بھیڑ میں نئی اور پرانی دونوں نسل کے لوگ موجود ہیں۔ ایک لٹل ڈانسنگ کوئین پریتی کے جلوے دیکھنے آئی ہے اور دوسری اپنے محبوب نیتا کا دیدار کرنے۔ جو دیدار کر کے لوٹ جانے والی ہے اور جلوے دیکھنے والی، آخری وقت تک ڈٹے رہنے کے اِرادے سے پہنچی ہے۔ لیکن لوٹنے والے لوگ کم ہیں۔ اور جو کم ہیں اُن میں سے بھی کچھ بہانے بنا کر رُکنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

منتری جی اِدھر ہاتھ جوڑے ہوئے سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اُدھر پرنسپل صاحب اوڈینس کے موڈ کو بھانپتے ہوئے مائک پر اپنی بات جاری رکھتے ہیں۔

''خواتین وحضرات.......!''

''یہ میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ آپ لوگ یہاں کس سے ملنے آئے ہیں۔ایک منتری جی سے اور دوسرا لِٹل ڈانسنگ کوئین سے .... پہلے منتری جی کا ہم سب آشرواد لے لیں، پھر ساری رات ڈانس کا مزہ اٹھائیں گے۔'' ہاتھ اُٹھا کر اُنہوں نے بھیڑ کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

بھیڑ سے ایک شور اُٹھا.........''لِٹل کوئین........ڈانسنگ کوئین.......'' لیکن نئی نسل کی اس آواز کو سُنی ان سُنی کرتے ہوئے فوراً پرنسپل صاحب ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔

''بس بس میں سمجھ گیا......اس لئے اب میں آپ اور منتری جی کے بیچ میں ذرا بھی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔

''منتری جی ....منتری جی........کی پھر جئے جئے کار ہونے لگی ۔لیکن یہ آواز مائک سے کیسے گونج رہی ہے۔ یہ بات بھیڑ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''تو اب آپ کے ہر دل عزیز نیتا، آپ کے شُبھ چنتک ،منتری مہودے، جناب دلدار سنگھ جی سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ آئیں اور اپنے آشرو چنوں سے نوازیں۔ان کا آشر وچن ہمیشہ سے شہرواسیوں کے لئے مارگ درشن کا کام کرتا رہا ہے۔''

منتری مہودے نے پہلے اپنی ٹوپی سیدھی کی اور پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے مائک کے سامنے آئے۔

'' آپ سب ہمارے بھگوان ہیں ۔'' دو زانو جھُک کر منچ کو چومتے ہوئے بولے۔''اور جب تک میں اپنے بھگوان کے سامنے پورے آدر اور شردھا کے ساتھ سر نہیں جھکا لیتا۔اپنی بات شروع نہیں کرتا۔آپ کے آشرواد سے ہی میں پارلیامنٹ جیسے مندر میں پہنچا۔میں جب بھی وہاں ہوتا ہوں اپنے بھگوان کی پوجا پاٹھ میں ولین رہتا ہوں اور جب آپ کے سمکچھ آنے کا موقع ملتا ہے تو آپ کے چرنوں میں ہی اپنی جگہ تلاش کرتا ہوں۔

''منتری مہودے کی جئے..........''

اور اِس جئے جئے کار کے درمیان منتری مہودے کا بھاشن بھی جاری تھا۔

''میں خود کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا کہ اتنے بڑے سُپر ڈانسنگ شو کا آغاز اپنے کر کملوں سے دیپ جلا کر کروں۔لیکن آپ کے ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کا جو میرے پرتی سنیہہ ہے اس نے مجھے یہاں تک آنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے آج کل کام کا اِتنا دباؤ ہے کہ وقت نکالنا مشکل ہو رہا ہے.........آج میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔بس آپ لوگوں کا دل رکھنا تھا اِس لئے حاضر ہو گیا..........اور اب جب میں اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ کے درمیان ہوں تو آپ کی اجازت سے صرف ایک ڈانس لِٹل کوئین پریتی سنگھ کا دیکھنا چاہتا ہوں۔پھر یہاں سے ہوٹل جاؤں گا اور دوا لے کر آرام کروں گا.........''اس بیچ ایم ایل اے صاحب نے کان میں آکر کچھ کہا۔اِس کے بعد منتری جی چہرے پر اُگ آئے پسینے کی بوندوں کو پونچھتے ہوئے بولے۔''اور اب میں اپنے پریہ اور پوجیہ کاریہ کرتاؤں سے انورودھ کرتا ہوں کہ آپ نہ یہاں اور نہ ہی گیسٹ ہاؤس میں ملنے کی تکلیف کریں۔میں کل خود'پارٹی کانفرنس ہال' میں ٹھیک گیارہ بجے آپ سبھوں سے ملاقات کروں گا۔''

بات ختم ہوتے ہی منتری جی منچ پر رکھے صوفے پر دھنس گئے۔ایم ایل اے سلیم کانے بھی بغل میں آکر بیٹھ گئے۔کان میں کچھ کہا تو منتری جی نے چشمہ اُتار کر اگلی سیٹ میں بیٹھی شوبھا کی طرف آہستے سے دیکھا اور پھر چشمہ پہن لیا.........شوبھا نے بھی اپنے ہونے کا احساس انگڑائی کے ساتھ کروایا تو منتری جی کے اندر بھی بہت کچھ انگڑائیاں لینے لگا۔پہلو بدلتے ہوئے ایم ایل اے سلیم کانے سے کہا۔

''یار جلدی پروگرام شروع کرواؤ۔''

اور پھر ایم ایل اے کے اشارے پر پرنسپل کی آواز ایک بار پھر چاروں طرف گونجنے لگی۔

''خواتین وحضرات.........!''

''اب وہ شُبھ گھڑی آ گئی ہے جس کا ہم سبھوں کو اِنتظار ہے۔اب کچھ ہی دیر میں

ہمارے شہر کی لِٹل ڈانسنگ کوئین پریتی سنگھ، جو اِس وقت صرف سات سال کی ہے۔ آئٹم سانگ پر اُس کے لٹکے جھٹکے دیکھ کر آپ حیران ہو جائیں گے کہ اِس ننھی سی عمر میں اُس کے جسم میں اِتنا لوچ کہاں سے آ گیا کہ بڑے بڑے ڈانسنگ اِسٹار بھی اس کے سامنے پھیکے پڑ گئے ہیں.........لیکن 'شو' شروع کرنے سے پہلے میں اپنے چیف گیسٹ منتری صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ لٹل ڈانسنگ کوئن کو مومینٹو اور ایک لاکھ روپئے کا چیک پیش کر کے اُس کی حوصلہ افزائی کریں۔

منتری جی ٹوپی سنبھالے جلد بازی میں اس طرح کھڑے ہوئے کہ گرتے گرتے بچے۔

''ارے ذرا سنبھل کر منتری جی..........''

''گر کے سنبھلنا ہی تو اصلی سیاست ہے کانے صاحب!''

''یہ گُر مجھے بھی تو سکھا دیجئے۔''

''تم تو سیکھے سکھائے ہو۔ اور پھر اِس طرح کا پروگرام سب کچھ سکھا دیتا ہے۔''

پرنسپل صاحب کی آواز گونج رہی تھی.........

''تو اب میں ننھی پری پریتی سنگھ کو منچ پر آنے کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئے اور منتری جی کے مبارک ہاتھوں سے مومینٹو اور ایک لاکھ روپئے کا چیک قبول کرے۔''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ..........

اور اِن تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ لِٹل کوئین پریتی سنگھ چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے، دونوں ہاتھوں سے لہنگا اُٹھائے، چھوٹے چھوٹے قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی منتری جی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ منتری جی خوشی سے اُسے اپنی گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ اُس کی پیشانی کو چومتے ہیں اور اُسی طرح مائک کے سامنے آ جاتے ہیں۔

''کتنی پیاری بچّی ہے یہ۔''

بھیڑ تالیاں بجانے لگتی ہے۔ جب تالیوں کی گڑگڑاہٹ کچھ کم ہوتی ہے تو وہ پریتی سے کہتے ہیں۔

''بیٹی پہلے تم اپنے ممّی پاپا سے تو ملواؤ۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ خوش نصیب کون ہیں جنہوں نے تمہیں جنم دیا۔''

''جی ممّی تو وہ سامنے پنک ساڑی میں بیٹھی ہیں اور پاپا ایک میٹنگ میں باہر گئے ہوئے ہیں۔'' پریتی نے وہی کہا جو شوبھا نے پروگرام میں آنے سے پہلے گھر پر سمجھایا تھا۔

لیکن اُن کے پاپا ڈاکٹر کپل سنگھ بھیس بدل کر بھیڑ میں شامل تھے اور سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور ایسا صرف اُنہوں نے ڈر سے کیا تھا کہ کہیں سلیم کانے نے نہیں آنے کی وجہ پوچھی تو کم سے کم وہ پروگرام کی آنکھوں دیکھی تفصیل بتا کر نازِل ہونے والے عتاب سے خود کو بچا سکیں گے.........بلائے جانے پر منچ پر کیوں نہیں آئے۔ یہ بعد میں سوچیں گے۔ وہ 'شو' میں قطعی جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اُن کے اندر کے 'پاپا' نے راضی کر لیا کہ 'ماں' اگر گڈھے میں ڈال رہی ہے تو کم سے کم وہ وہاں کھڑا رہے تاکہ پریتی آواز دے تو وہ اُسے نکال سکے۔

پھر اس نے سوچا:

''یہ میرے حق میں اچھا ہوا کہ شوبھا نے پریتی کو پہلے ہی سکھا دیا کہ میں میٹنگ میں باہر ہوں۔ ورنہ اس کے گُرگوں کا کیا ٹھکانا کہ کہیں ڈھونڈنے کلینک یا نرسنگ ہوم پہنچ جاتے تو.........زبردستی اُٹھا کر منچ پر لے جاتے تو......؟

شوبھا خوش تھی کہ اچھا ہوا وہ نہیں آئے۔ آتے تو اُس کی آزادی میں خلل پڑتا۔

اُسی وقت پریتی نے منتری جی کے کہنے پر اُن کی طرف اشارہ کر دیا۔

منتری جی مسکراتے ہوئے بولے۔

''ارے اِس موقعے پر تو آپ کو بیٹی کے ساتھ ہونا چاہئے اور آپ ہیں کہ وہاں بیٹھی ہیں۔ یہاں آیئے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے چیک ریسیو کیجئے۔''

شوبھا چہرے پر مسکراہٹ کا بُرادہ بکھیرے، ایک ہاتھ سے ساڑی کا دامن اُٹھائے، دوسرے ہاتھ سے پلّو سنبھالے، اِٹھلاتی بل کھاتی ہوئی منتری جی کے بالکل قریب پہنچ گئی.........منتری کی ایکسرے جیسی آنکھوں نے منچ تک پہنچتے پہنچتے جب کئی تصویریں

کھینچیں، تو سنہرے نشیب و فراز کے جوڑ سے بنے انوکھے زاویوں نے اُن کے اندر سونامی
پیدا کر دی۔ اب ایک ہی خواہش تھی کہ جلد ڈانس شروع ہو جائے اور وہ ایک دو پروگرام دیکھ
کر ہوٹل 'ھنی مون' پہنچ جائیں تا کہ دن بھر کی بے چینی کو تھکاوٹ اُتارنے والی گلابی نلی کے
راستے بوند بوند اُتار کر روح کو سیراب سکیں۔

ٹرافی پریتی کے ہاتھوں میں دینے کے بعد منتری جی نے شوبھا کے مہندی رچے
ہاتھوں میں ایک لاکھ روپئے کا چیک دیا۔ بڑے سائز کے ڈمی چیک کو دیتے وقت منتری جی
نے ایک ہاتھ کچھ اس طرح سے نیچے رکھا کہ شوبھا کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں آ گیا۔ آنکھوں
میں کاجل کی تحریر دوڑ گئی۔ منتری مہودے نے فوٹو کھینچوانے کے بہانے دیر تک شوبھا کے
مہندی رچے ہاتھوں کو سنبھالے رکھا۔

آپ کا بہت بہت شکریہ منتری جی! کہ آپ اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال
کر ایک اُبھرتی ہوئی کلاکارہ کی ہمّت افزائی کے لئے یہاں آئے ہیں.........اب میں ایم
ایل اے سلیم کانے صاحب سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ منتری جی کو لے کر نیچے جائیں تا کہ
وہاں سے ڈانس کا بھرپور آنند اُٹھا سکیں۔''

منتری جی کے گولڈن چیئر پر بیٹھتے ہی ایک طرف ایم ایل اے سلیم کانے صاحب
بیٹھ گئے اور دوسری طرف شوبھا پنک جالی دار پلّو کو سنبھالے کچھ اِس طرح بیٹھی جیسے وہ ہمیشہ
سے بغل والی کرسی کا حصّہ رہی ہو۔

مائک پر پرنسپل صاحب بھیگی بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھے۔

''خواتین وحضرات! اب انتظار ختم ہو چکا ہے اور وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم سب
لٹل ڈانسر پریتی سنگھ کے ڈانس کا لطف اُٹھائیں۔ اِس لئے بغیر کسی تاخیر کہ میں پریتی سنگھ
سے گُزارش کرتا ہوں کہ وہ آئیں اور اپنے دھماکے دار پرفارمینس سے بھیڑ کا دل جیت کر
سنگیت کی دنیا میں ہنگامہ مچا دیں۔''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ.......

ایک مدُھر شور........

سیٹیوں کی آواز.......

اور اِس کے ساتھ ''مُنّی بدنام ہوئی'' سانگ کا میوزک جیسے ہی شروع ہوا مختلف
رنگوں کے امتزاج سے پیدا ہوئی روشنی، منچ کو خوابوں کی حسین دنیا میں تبدیل کرنے لگی۔ اِس
بیچ پریتی سنگھ وہائٹ سلکی لباس میں لیمینیٹ ہو کر منچ پر اِس طرح تھرکنے لگی کہ مسز سہیل
اگر اس پرفارمینس کو دیکھ لیتیں وہ بھی قائل ہو جاتیں۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ بدستور جاری تھی..........

سیٹیوں کا زور بڑھتا ہی جارہا تھا۔

منتری جی سے بھی رہا نہیں گیا۔ شوبھا کی طرف سر جھکاتے ہوئے بولے۔

''پریتی میں واقعی بہت ٹائلینٹ ہے۔ بڑی ہو کر آگ لگا دے شوبھا جی!۔''

''یہی تو میں بھی چاہتی ہوں منتری صاحب! بس آپ کا آشرواد بنا رہے۔''
شوبھا منتری جی کے کاندھے پر جھک گئی تھی۔

''میرا پورا سہیوگ آپ کے ساتھ رہے گا۔ آنے جانے سے لے کر کھانے پینے کا
سارا خرچ سمجھئے آج سے میرا۔''

پھر اُنہوں نے دوسری طرف جھکتے ہوئے سلیم کانے سے کچھ کہا تو انہوں نے بھی
شوبھا کو یقین دلایا۔

''اگر مجھ پر آپ لوگوں کی اِسی طرح مہربانیاں رہیں تو پھر 'ریئلیٹی کی دنیا' ہماری
ہوگی۔'' اُس نے مُٹّھی اِس طرح بند کی جیسے دنیا اُس میں قید ہو۔

''صرف ریئلیٹی شو ہی کیوں؟ منتری جی کے تو بڑے بڑے ڈائریکٹر پروڈیوسر
سے تعلقات ہیں۔ بس چار پانچ سال کے بعد تو وہ سیدھے ممبئی فلائٹ سے آنا جانا کرے
گی۔ رہنے سہنے کے لئے بھی کچھ سوچنا نہیں ہے۔ وہاں منتری جی کا فارم ہاؤس ہے، بنگلہ ہے
اور اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔'' ایم ایل اے سلیم کانے نے رشتے کے مزائک پر

باتوں کی مشین چلا کر تیزی سے چمکانے کی کوشش کی۔

''میں آپ لوگوں کے اِن احسانوں کا بدلہ کیسے چکاؤں گی ، میں نہیں جانتی۔''

صاف شفّاف چمکتے ہوئے مزائک پر پاؤں پھسل نہ جائے اِس لئے شوبھا نے احسان نُما بیساکھی کا سہارا لیا۔

''ارے اپنوں کا بھی کوئی احسان چُکا تا ہے کیا؟۔''

منتری جی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ہولے سے کومل ہاتھوں کو دبایا تو اُس نے بھی جواب میں دھیرے سے چیونٹی کاٹ لی ۔

ڈانس ختم ہوتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ لوگ تعریفی کلمات'' واہ واہ ....بہت خوب........ایک اور........ونس مور........''چلاّ رہے تھے۔تالی بجانے کے دوران خوشی کے مارے کئی بار منتری جی بھی اپنا توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہے تھے ۔جس کے باعث شوبھا کی طرف وہ جھکے اور''سوری'' بھی کہا۔شوبھا نے بھی جھُوم کر کندھے سے کندھے کی تالی بجائی اور کہا۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔''

''نہیں کوئی بات تو ہے جو آپ دوسری ممّیوں سے الگ ہیں۔'' منتری جی کے ہاتھوں میں اب بھی شوبھا کا ہاتھ تھا جس پر بڑی چالاکی سے آنچل نے سایہ کر رکھا تھا۔'' سات آٹھ سال کی بیٹی ہے لیکن لگتا ہی نہیں کہ آپ شادی شدہ ہیں۔ بہت مینٹین کر کے رکھا ہے آپ نے........کیا کھاتی ہیں.........؟''

''بس وہی جو عام ناری کھاتی ہے۔''

''تو پھر کیوں نہیں آج کا ڈنر ہم دونوں ایک ساتھ کریں۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی آپ جیسی پرسنالیٹی کے ساتھ ڈنر کرنے کا۔''

☆☆☆

18

ہوٹل ہنی مون، ڈنر اور بریک فاسٹ

قارئین!

منچ پر ڈانس جاری تھا۔

لیکن منتری جی دیکھ کم اور شوبھا سے باتیں زیادہ کر رہے تھے۔بات کرتے کرتے منتری جی نے گھوم کر سلیم کانے سے کچھ کہا۔سلیم کانے نے اشارے سے پرنسپل صاحب کو پیچھے مُڑ کر سمجھایا۔

''بیڑی جلائے لے جگر سے پیا''

دوسرے آئٹم سانگ کے ختم ہوتے ہی زوردار تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور سیٹیوں کی آواز کے بیچ پرنسپل صاحب سمجھی ہوئی باتوں کو سمجھانے مائک پر آئے اور بولے۔''اپنی ناساز طبیعت کے باوجود منتری مہودے نے ڈانسنگ شو کی جس طرح شوبھا بڑھائی ہے اِس کے لئے ہم سب اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ اُمیّد کرتے ہیں کہ آپ ہم سبھوں کی ایسی ہی رہنُمائی کرتے رہیں گے........اِس وقت اُنہیں یہاں سے جانے کی خواہش تو نہیں ہے، لیکن چوں کہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اِس لئے مجبوری میں وہ وداع لے رہے ہیں۔

منتری مہودے جانے کے لئے اُٹھتے ہیں۔ایم ایل اے صاحب کے ساتھ شوبھا بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔باڈی گارڈ اپنی اپنی پوزیشن لیتے ہیں۔دو آگے اور دو پیچھے۔

بھیڑ سے کئی ہاتھ منتری جی سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

کئی ہاتھ پاؤں کو چھونے کی مشقت کرتے ہیں۔

کئی ہاتھ مالائیں پہنانے کے لئے اُوپر اُٹھتے ہیں۔

کئی ہاتھ الوداع کے لئے ہوا میں لہراتے ہیں۔

بھیڑ کے پاؤں بھی اُن کے پیچھے پیچھے گاڑی تک پہنچتے ہیں۔

بھیڑ کی زبان بھی جئے جئے کار کرتی ہوئی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

اچانک ایک اور گانے کے بول فضاؤں میں رس گھولنے لگتے ہیں۔بھیڑ کے پاؤں تیزی سے پلٹتے ہیں۔

منتری جی بُلٹ پروف کار کے آئینے میں جاتی ہوئی بھیڑ کو کچھ دیر تک دیکھتے ہیں۔پھر شوبھا کو بیٹھنے کے لئے کہتے ہیں۔اور پھر خود اُس کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔باڈی گارڈ کی ایک جیپ آگے بڑھتی ہے۔اُس کے بعد منتری جی کی گاڑی نکلتی ہے اور پھر اِس کے پیچھے ایک اور جیپ بیک اپ کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

منتری جی کے جاتے ہی ایم ایل اے سلیم کا نے صاحب اُن کی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔اب وہاں کا منظر تھوڑا سا بدل جاتا ہے۔جہاں شوبھا بیٹھی تھی وہاں مسیز شرما کو جگہ مل جاتی ہے اور پرنسپل صاحب اناؤنسنگ کی ذمہ داری کسی اور کو دے کر وہاں جہاں ایم ایل اے صاحب بیٹھے تھے، بیٹھ جاتے ہیں۔پرنسپل کے بیٹھتے ہی کنول ٹین ایج مسکراہٹ بکھیرے اُن کی بغل والی سیٹ سنبھال لیتی ہے۔

ڈانس ماسٹر مس نینا رائے اینکرنگ کی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے اپنی آواز کا جادو بکھیرتی ہے۔

لیڈیز اینڈ جینٹس!

نینا رائے کا آپ سبھوں کی خدمت میں پیار بھرا سلام۔

بھیڑ نے تالیوں اور سیٹیوں سے اُس کے پیار بھرے سلام کا جواب دیا۔

''بہت بہت شکریہ......دھنیہ واد!''

''ناظرین! مانیہ منتری جی کو وداع ہوئے قریب دس منٹ ہو گئے ہیں۔اِس دوران پریتی سنگھ نے اپنا ڈریس تبدیل کر لیا ہے۔جس میں وہ اور بھی قیامت لگ رہی ہے.........تو اب لیجئے ایک بار پھر ڈانس کی لِٹل کوئن پریتی سنگھ! اپنے ایک اور زوردار

پرفارمینس کے لئے آپ کے روبرو تیّار رہے۔مجھے امّید ہے کہ ''منّی جو بدنام ہوئی تھی'' اُس کی ایک بہن کا نام شیلا ہے اور وہ بھی شہر کی بدنام گلیوں میں آتے جاتے جوان ہوئی ہے۔تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اُس پر ''شیلا کی جوانی'' کا کیسا اثر ہوا ہے.........؟ مجھے اُمید ہے کہ پریتی اپنے اِس آئٹم سانگ پر بھی بھیڑ سے خوب تالیاں بٹورے گی۔اور ہاں اِس ڈانس سے پہلے میں آپ لوگوں کو یہ بتا دوں کہ اس کے بعد مشہور آئٹم سانگ جیسے ''چولی کے پیچھے کیا ہے؟'' ''جلیبی بائی'' اور ''چھمّک چھلّو'' جیسے سانگ پر بھی ڈانس پیش کئے جائیں گے۔مجھے امید ہے کہ آپ سب شانتی بنائے رکھیں گے۔اگر آپ نے ہیوگ کیا تو ہمارے پاس ایسے خوبصورت گیتوں کی لمبی فہرست ہے۔صبح ہو جائے گی لیکن گھنگھرو نہیں تھمے گیں۔

تالیاں اب بھی بج رہی تھیں۔

اور سیٹیاں بھی.......

لیکن ہو ہلّہ پر کچھ حد تک نینا رائے کی لچھے دار باتوں نے کنٹرول کر لیا تھا۔

اِس کے بعد ایک ایک کر کے بدنام گانوں پر پریتی اپنے ڈانس کے جلوے بکھیرتی رہی۔بیچ بیچ میں اُسے آرام دینے کے مقصد سے ایک بار کنول کو اور دو تین دوسری لڑکیوں کو موقع دیا گیا۔کنول نے بھی اپنے ڈانس سے سب کو بے حد متاثر کیا۔لیکن ''ایک اور.........ونس مور.........'' کا شور کہیں سے بلند نہیں ہوا۔تالیوں میں کوئی جوش نظر آیا اور نہ ہی سیٹیوں میں ہی وہ سُر لے کی کوئی تان سُنائی دی..........اِس لئے وہ پریتی کے جادو کے سامنے دوسری بار ہمّت جتانے میں ناکام رہی۔

مسیز شرما کی خواہش تھی کہ کنول ایک اور ڈانس کرے۔لیکن ایم ایل اے سلیم کانے کنول کو ڈانس کروانے سے زیادہ بغل میں بٹھائے رکھنے کے خواہش مند تھے۔

ہوٹل ہنی مون پہنچتے ہی شوبھا اُن کے ساتھ ڈنر پر چلی گئی۔چکن لیگس ایسے بھی منتری جی کو بہت پسند تھے۔لیکن آج بیرے نے جس طرح ڈیپ فرائی کر کے ڈنر سیٹ میں سجایا تھا، وہ قابل تعریف تھا۔خوشبو سے اُن کے منہ میں پانی بھر آیا.........اور جب چکھنے کی

باری آئی تو انوکھے سواد نے اُنہیں مسرور کر دیا۔

رات اپنے شبابی لباس پہنے گھڑی کے دائرہ نُما پلیٹ فارم پر دو بجے والی ٹرین پکڑنے کے لئے کھڑی تھی۔ اس وقت پریتی کو اپنے آخری پرفارمینس کے لئے منچ پر آنا تھا۔ اب پروگرام چوں کہ اپنے اختتام پر تھا۔ اِس لئے پرنسپل صاحب نے مائک سنبھال لیا۔ اِس کے دو تین منٹ بعد ہی شوبھا سنگھ مرجھائی سی اپنی فطری چلبلے پن کے برعکس، نظریں جھکائے دھیمی چال چلتی ہوئی آئی اور پرنسپل صاحب والی خالی کرسی پر دھنس گئی جیسے کوئی مزدور اپنی جسمانی ساخت سے کئی گُنا زیادہ مزدوری کر کے تھکا ہارا جب گھر لوٹتا ہے تو آتے ہی جھول دار چارپائی پر جسم کو بے سُدھ ڈال دیتا ہے۔

ایم ایل اے صاحب نے آنکھوں کے معنیٰ خیز لینس سے شوبھا کو اِس طرح دیکھا جیسے اجنتا ایلورا کی گُپھاؤں کی کسی مورت کو دیکھ رہا ہو، جو ابھی ابھی آسن مُدرا سے نکل کر کچھ دیر آرام کرنے کے لئے یہاں پہنچی ہو۔ وہ اُس سے گُپھاؤں مُدراؤں کے قصّے سننا چاہتے تھے۔ لیکن یہ سوچ کر رُک گئے کہ پہلے سانسیں درست ہو جائے تو پھر......... پھر کچھ اور سوچتے ہوئے اُنہوں نے مسیز شرما کی طرف دیکھا۔ مسیز شرما ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے اُس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے سانڈ کے ساتھ ہوئی مُڈبھیڑ کے بعد گائے جان بچا کر گرتی پڑتی ناند کے پاس لوٹی ہو۔ لیکن ایم ایل اے سلیم کا نے صاحب کے اِشارے پر اُس کی ہمدردانہ سوچ، شرارت کی بھٹّی میں جل کر خاکستر ہونے لگی۔ تب اُس نے پوچھا۔

''ڈنر کیسا رہا.........''

''ہاں ٹھیک رہا.........'' اپنی ٹانگوں کو سیدھی کرنے کی کوشش میں شوبھا شرم و حیا سے مسکرائی۔

کنول جو اُس کی بغل میں ہی بیٹھی تھی۔ وہ چہرہ صرف منچ کی طرف کئے ہوئے تھی۔ لیکن کن انکھیوں سے تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھ رہی تھی۔ کان بھی کھڑے

تھے۔ جیسے ہی اس کی ممّی نے ڈنر کی بات چھیڑی۔ وہ اپنی ٹین ایج آنکھیں منچ سے ہٹا کر شوبھا انٹی پر گاڑ دیں۔

''کیا شوبھا انٹی ڈنر سے آ رہی ہیں.......؟''

کنول اپنی ماں کے پاس آئی اور مسکراتی ہوئی کان میں بولی۔

''لیکن ممّی آپ کی ڈنر تو رات بھر چلتی ہے نا........؟''

شوبھا نے اِس کے جواب میں کنول کے کان پکڑے، اپنے پاس بٹھایا اور رازدارانہ انداز میں کہا۔

''وہ کیا ہے بیٹا کہ تمہارے پاپا براڈ مائنڈیڈ ہیں۔ لیکن پریتی کے پاپا اب بھی وہی گھٹیا سوچ رکھتے ہیں۔ اِس لئے ....ورنہ تمہارے پاپا کی طرح وہ بھی انٹی کو 'ہنی مون ہوٹل' چھوڑنے جاتے اور تمہاری شوبھا انٹی بھی میری طرح بریک فاسٹ کر کے لوٹتیں.........لیکن ہر کسی کی قسمت تیری ممّی کی طرح نہیں ہے بیٹا۔ اور تم بھی خوش قسمت ہو کہ تمہیں بھی ایک آزادانہ زندگی جینے کا موقع مل رہا ہے۔''

ماں کی باتوں پر وہ گردن ہلانے کے ساتھ ساتھ ''ہوں، ہوں'' اِس طرح کر رہی تھی جیسے کسی پرانے رکارڈ پلییر کی ڈِسک پر سوئی ایک ہی جگہ گھوم رہی ہو۔

شوبھا یہ تو جان رہی تھی کہ ماں بیٹی کے درمیان کس طرح کی گفتگو ہو رہی ہے اور اِس گفتگو کا مرکز کون ہے؟ لیکن وہ چاہ کر بھی میوزک کی آواز، لوگوں کے شور اور رازدارانہ انداز کے باعث سُننے سے قاصر تھی۔

ایم ایل اے صاحب شوبھا سے کچھ نزدیک تھے۔ اِس لئے اُن کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا۔ اُنہوں نے ایک دو بار کنول کی طرف دیکھا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ پروگرام کے بعد پرنسپل صاحب اور مسیز شرما گیسٹ ہاؤس میں ایک ساتھ ڈنر کریں گے۔ اِس دوران کنول اُس کے پاس رہے گی۔ ڈنر کے لئے تیار کر پانا تو مشکل تھا، لیکن مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے چائے کافی سے کام چلایا جا سکتا تھا۔ ویسے بریک فاسٹ شوبھا کے ساتھ طئے تھا۔

کون کس کے ساتھ کب کہاں ڈنر، بریک فاسٹ کرنے والے ہیں؟ یہ سب کو معلوم تھا.........جب سے ڈانسنگ اسکول کھلا تھا تب سے ایم ایل اے سلیم کانے ،مینیجنگ ڈائریکٹر کے چیمبر میں آتے جاتے کافی پینے لگے تھے۔

اُن کا ماننا تھا کہ بھر پیٹ کھانے کے تین چار گھنٹے کے بعد کبھی بھی ناشتہ کیا جا سکتا ہے۔اِس وقفے میں اتنی جگہ بن ہی جاتی ہے۔اِس سے ہاضمے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اِدھر ذہن کے کمپیوٹر پر مینو ٹائپ ہو کر پرنٹر سے باہر نکل چکا تھا۔

اُدھر اِس بیچ پریتی نے اپنا آخری آئٹم ڈانس پیش کر دیا تھا۔ ہر طرف وہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ.........سیٹیوں کی آواز.........وہی واہ واہ.........وہی ونس مور.........اور ونس مور کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

اِس طرح پروگرام اپنے آخری دور میں پہنچ گیا۔

آخر میں پرنسپل صاحب نے ایم ایل اے سلیم کانے کو ناظرین کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بُلایا۔

وہ اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے جھومتے جھامتے منچ پر پہنچے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے مسکرائے۔

'' خواتین وحضرات.........!''

'' آپ نے نیندیں گنوا کر ہمیں جگائے رکھا.........آپ کی موجودگی نے اِس تاریخی ڈانسنگ شو کو کامیاب بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ لِٹل ڈانسنگ کوئن پریتی سنگھ جنھوں نے اپنے خوبصوت ڈانس سے پبلک کا دل جیتا ہے۔شوبھا سنگھ جی کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ نہ ادا کروں تو ان کے ساتھ یہ ناانصافی ہوگی۔کیوں کہ اُنھوں نے مانیہ منتری جی کے سواگت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔وہ یہاں سے اِتنے خوش ہو کر گئے ہیں کہ دو چار سنگنگ ڈانسنگ اسکول کا پرمیشن ملنا طے ہے ....اور ایک خاص بات: کہ اب چناؤ آنے میں زیادہ وقت نہیں رہا۔سال بھر دیکھتے ہی دیکھتے کٹ جائیں گے۔ ہماری پارٹی

سویدھاؤں کے ساتھ منورنجن کا بھی آیوجن کرتی ہے۔اِس لئے ووٹ کے وقت ہمیں بھولیں گے نہیں۔ ''

پھر پارٹی کے نام پر نعرے لگے۔

خوب جئے جئے کار ہوئی۔

پروگرام ختم ہوتے ہی ایم ایل اے صاحب شوبھا کو لے کر اُوپر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔چوں کہ اُس نے سیاسی ڈنر کر رکھا تھا اِس لئے آرام کی ضرورت تھی۔دو تین گھنٹے کے آرام کے بعد وہ بریک فاسٹ کے لئے تیّار ہو سکتی تھی۔

''بریک فاسٹ.......؟''

''ہاں! بریک فاسٹ.........''

''لیکن میرا پیٹ.........؟

''لیکن ویکن کچھ نہیں یہ دوا کھا لو ہاضمہ ٹھیک ہو جائے گا.........اور پھر یہ سارا 'شو' تو شوبھا جی آپ کے لئے ہی تھا۔اِس لئے صرف 'ڈنر' سے کام نہیں چلے گا.........بغیر 'بریک فاسٹ' کے تو یہ پروگرام ہی ادھورا ہے۔''

پرنسپل صاحب اجازت لے کر مسیز شرما کے ساتھ ڈنر پر چلے گئے تھے۔

ایم ایل اے صاحب نے پریتی کو کچھ مٹھائیاں اور فروٹس کے پیکٹ پکڑا کر ڈانس ماسٹر نینا رائے کے حوالے کر دیا اور خود کنول کے ساتھ کافی ہاؤس پہنچ گئے۔

صبح ہوئی اور بریک فاسٹ بھی ہوا۔

بریک فاسٹ کے بعد شوبھا گاڑی چلانے کی حالت میں نہیں تھی۔اس لئے ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کا ڈرائیور اُسے چھوڑنے گھر تک گیا۔

☆☆☆

19

تماش گاہ، مکھوٹا اور انگریز

قارئین!

ڈاکٹر کپل شو میں موجود تھے۔

شو میں موجود تھے اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی سے ڈرتے تھے۔

وہ ڈرتے تھے اپنے ناموس سے

وہ ڈرتے تھے اپنی عزّت سے

وہ ڈرتے تھے اپنے وقار سے

وہ ڈرتے تھے اپنے آپ سے

اِس لئے پریتی کی پرچھائیں بن کر وہ رات بھر اُس کے ساتھ تھے۔ جاگنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ اِس لئے کئی بار چائے پی تا کہ نیند پر فتح حاصل کر کے شوبھا کی ایکٹی ویٹی پر نظر رکھی جا سکے۔

ڈاکٹر کپل شوبھا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دوسروں کی نظروں سے بچنا چاہتے تھے۔ 'شو' سے ایک روز قبل کلینک جاتے وقت وہ بازار گئے۔ کالے رنگ کا ہیٹ پسند کیا۔ ایسا رنگین چشمہ تلاش کیا جِسے اندھیرے میں پہنا جا سکے۔ جب اِس سے بھی اُنہیں اطمینان نہیں ہوا تو مکھوٹے کی دکان سے داڑھی خرید لائے۔

دوپہر میں لنچ کے ٹائم ان تینوں چیزوں کا خوبصورتی سے استعمال کر کے اپنے ہی موبائل سے تصویریں کھینچیں۔ سائبر کیفے گئے۔ زیادہ پیسہ دے کر جعلی آئی ڈی بنوایا تا کہ بھیس بدل کر گیسٹ ہاؤس میں نظر رکھ سکے۔

پروگرام کے دن اِرادہ یہ تھا کہ ساڑھے سات بجے وہ کسی طرح مریضوں کو دیکھ کر تماش گاہ کی طرف نکل پڑیں گے۔ لیکن چار بجتے بجتے مریضوں کا تانتا لگ گیا اور شام چھ

بجتے بجتے کرسیاں خالی ہو گئیں۔ ایک گھنٹے تک وہ یوں ہی بیٹھے رہے۔ مریضوں کے بارے میں سوچتے رہے کہ رات نو بجے تک یہاں مریضوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ لیکن آج ....اور ایک گھنٹہ یوں ہی گذر گیا۔ اچانک نظر ٹِک ٹِک کرتی گھڑی پر پڑی۔ چھوٹی سوئی انگریزی کے سیون پر قبضہ جما چکی تھی۔ وہ ہڑ بڑا کر کرسی سے اُٹھے۔ پہلے واش بیشن کے پاس آئے۔ اچھّی طرح سے چہرہ دھوئے۔ وہیل چیئر کی پشت پر رکھے تولیے سے مُنہ صاف کیا۔ دوبارہ واش بیشن کے پاس گئے۔ آئینے میں خود کو دیکھا۔ بہروپیے والا سامان نکالا۔ اچانک خیال آیا کہ دروازہ کھُلا ہے۔ وہ دروازہ کی طرف لپکے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ جب تشفّی ہو گئی تب اُنہوں نے دروازہ بند کیا۔ داڑھی لگائی تو کئی فلمی ایکٹرس آنکھوں کے سامنے گھوم گئے جو عام زندگی میں داڑھی نہیں رکھتے تھے لیکن پردے پر ہمیشہ داڑھی میں جلوہ افروز ہوتے۔ اور وہ داڑھی اُنہیں بہُت جچتی تھی۔

وقت شام کی سواری کرتے ہوئے جب بھی محوِ سفر ہوتا سورج احتراماً راستہ دیتا ہوا پہاڑی چوٹی سے نیچے رات کے آنگن میں اُتر جاتا۔

اندھیرا پھیلتے ہی ڈاکٹر کپل نے کچھ اِس کمال ہنر مندی سے داڑھی، ہیٹ اور چشمہ لگایا تھا کہ کسی بھی زاویے سے وہ خود کو پہچان نہیں پا رہے تھے......... اُنہیں جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ جو ہیں، وہ اب نہیں ہیں۔ اور اب جو ہیں، ویسا کوئی نہیں ہے۔ تب کرسی کے سہارے روشن دان تک پہنچے۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ دکانیں بند دکھائی دیں۔ دروازہ کھول کر اسکوٹر اندر کی۔ چائے والا فلاسک گلے میں لٹکایا اور کلینک کا دروازہ بند کر کے چال بدلتے ہوئے سڑک کی دوسری جانب پہنچ گئے .... جتنی بھی گاڑیاں آ رہی تھیں سب کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک اُنہوں نے انتظار کیا۔ اسٹینڈ وہاں سے دو کیلو میٹر دور تھا۔ اور دوسری طرف تماش گاہ چار کیلو میٹر کے فاصلے پر۔ وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کہیں یہاں سے سیٹ نہیں ملی تو اُنہیں دو کیلو میٹر پیدل چل کر آٹو رکشا اسٹینڈ جانا ہو گا۔ دو کیلو میٹر جب وہ پیدل چل ہی لیں گے تو پھر اور دو کیلو میٹر چلنے میں کیا

پریشانی ہے.........؟ اسٹینڈ یا تماش گاہ......کدھر جائے سوچ ہی رہے تھے کہ ایم ایل اے صاحب کی گاڑی اُدھر سے پار ہوئی۔سوچ میں خلل پڑ گیا۔دوبارہ سوچنا شروع کیا تبھی پیچھے سے ایم ایل اے سلیم کانے کے حوالی موالی نے اُنہیں فارنر سمجھ کر ہمدردی میں گاڑی روک دی کہ کہیں گاڑی نہیں ملی تو بے چارہ فارنر ڈانس شو دیکھنے سے محروم رہ جائے گا۔ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے لمبے بھورے بالوں والے نے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکوں سے کہا۔

''یار یہ تو کوئی انگریز لگتا ہے۔''

''چھوڑ یار! سالا یہ ہندی سمجھے گا نہیں اور ہمیں انگریزی آتی نہیں۔''

''ارے تو کیا ہوا یو........می........یس........نو........کر کے پوچھ نا۔ کچھ نا کچھ تو بولے گا ہی..........''

''یو ڈانس پارٹی........'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بھورے بالوں والے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

ڈاکٹر کپل کو اب تک سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا کہ اِن لڑکوں کو صرف ہندی آتی ہے اور میں چوں کہ انگریز ہوں تو مجھے تو صرف انگریزی ہی آتی ہوگی۔اگر مجبوری میں، میں ان لوگوں کے ساتھ چلتا بھی ہوں تو راستے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔اور اگر اُترتے وقت کسی نے بات کرنے کی کوشش کی تو انگریزی کی ایسی ٹانگ توڑوں گا کہ کوئی پکڑ نہیں پائے گا کہ میں کون ہوں........؟

''یس........یس........ڈانس پارٹی..........''

زیادہ بولنے سے بہتر ڈاکٹر کپل نے کم میں ہی کام چلانا چاہا۔

پوری عزّت کے ساتھ پوچھنے والے نے دروازہ کھولا اور اُنہیں بٹھالیا۔

راستے میں بھیڑ تھی۔''تماش گاہ'' تک پہنچنے میں بیس منٹ لگ گئے۔راستہ بھر موالیوں نے شوبھا اور ایم ایل اے سلیم کانے کی باتیں کیں۔ایک نے تو ہنس کر یہاں تک کہہ دیا''آج 'ماں' تو کل 'بیٹی' اُس کی معشوقہ ہوگی۔''

سب زور زور ہنسنے لگے۔

اُس وقت ڈاکٹر کپل کا دل چاہا کہ اُٹھ کر سب کو گھونسہ مارنا شروع کر دے۔لیکن موالیوں سے مُنہ لگنے کا مطلب اپنی زندگی کو داؤں پر لگانا۔وہ خاموشی کا زہر پی کر رہ گئے۔

تماش گاہ میں گاڑی رُکتے ہی وہ بھیڑ کا حصّہ بننے کے لئے تیزی سے ایک طرف بڑھ گئے۔اور وہ سب پیچھے سے چلّاتے رہے۔

''اوفورنر.........اوفورنر.........''

''انگریز.........اوانگریز.........''

''ارے چھوڑ دے چلا گیا ہے تو جانے دے.........''

''سالے کو پکڑا کون ہے.........بس روک اِس لئے رہا تھا کہ اُسے وی آئی پی سیٹ دلوا دیتا۔اپنے ملک کی عزّت کی بات ہے۔''

''عزّت وزّت چھوڑ کہیں کوئی مال وال دیکھ۔اگر کوئی اکیلی دکیلی نظر آ جائے تو اُدھر ہی چپک لینا۔''

لوگ ہزاروں کی تعداد میں پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ڈاکٹر کپل نے سوچا کہ اِس سے پہلے سیٹ فُل ہو جائے وہ کسی کرسی سے چپک جائے۔

ڈاکٹر کپل نے''تماش گاہ'' میں کئی ایسے تماش بینوں کو دیکھا جو اُنہیں جانتے تھے۔لیکن کسی کو شک نہیں ہوا اور غچّا کھا گئے۔

ڈاکٹر کپل کرسی کا حصّہ بننے سے پہلے تھرمس میں ٹی اِسٹال سے چائے لے آئے تھے۔تاکہ نیند آنکھوں سے غائب رہے۔وہ چائے پینے والوں میں نہیں تھے۔نہیں بھی پیتے تو بھی نیند آنکھوں سے غائب ہی رہتی.........کئی بار وہ منچ کے پاس گئے۔منتری جی کا آٹو رکشا سے''ہوٹل ہنی مون'' تک پیچھا کیا۔شوبھا کو جو ڈرائیور چھوڑنے آیا تھا اُس کا ٹائم نوٹ کیا.........چوں کہ مکھوٹے کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔اِس لئے کس نے کس کے ساتھ ڈنر کیا اور کون کافی کا مزہ اُڑایا یہ سب اُن کے علم میں تھا۔

ڈاکٹر کپل حالانکہ بہت دیر گیسٹ ہاؤس میں نہیں رہے۔ لیکن جتنی دیر رہے آنکھیں کھُلی رکھیں۔ بیچ بیچ میں وہ باہر بھی نکلے۔ رات میں اِدھر اُدھر جانے کے لئے اُنہوں نے ٹی اسٹال سے لوٹتے وقت ایک آٹو رکشا پوری رات کے لئے کرائے پر لے لیا تھا۔

رات بھر وہ خون کے آنسو روتے رہے۔

لیکن ان میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ وہ کھُل کر روتے۔

روتے تو بھیڑ لگ جاتی۔

بھیڑ لگتی تو لوگ پوچھتے۔

''کیا بات ہے.........؟''

''کیوں رو رہے ہیں.........؟''

اور وہ کیا جواب دیتے.......؟

پھر شروع ہو جاتی زندگی کی اُلٹی گنتی۔

لیکن وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ جینا چاہتے تھے۔ اپنی کم عمر بچّی کے لئے۔ جو ابھی ناسمجھ تھی۔

گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلتے ہی ایک سنسان جگہ پر داڑھی، ہیٹ اور چشمے کو پھینک کر رکشا سے سیدھے کلینک پہنچے۔

آس پاس کی دکانیں ابھی بند تھیں۔ وہ تالا کھول کر اندر داخل ہوئے اور دروازہ بند کر کے مریض والے بیڈ پر لیٹ گئے۔ آنکھوں سے آنسوں رواں تھے۔ جو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ دیر تک وہ اُسی طرح روتے رہے۔ پھر رات بھر سوئے بھی نہیں تھے اِس لئے چہرہ سوجا ہوا تھا۔

خمار آلود اور سوجی ہوئی آنکھوں میں رات کا سارا منظر بوند بوند پھیل رہا تھا۔ اور ہر ایک منظر کے بعد اُس کی آنکھیں سُرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اِتنا غصّہ آنکھوں میں سما گیا تھا کہ وہ پل میں دنیا کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ یہاں تک کے اپنے آپ کو بھی پھانسی پر لٹکا دینا

چاہیئے.........لیکن وہ ایک لمحہ جس میں منفی سوچ ایک مرکز پر آ کر سمٹ جاتی ہے۔ وہ لمحہ آتے آتے رہ گیا۔ پھندہ بنا بنایا ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ کیوں کہ سوچ کی اِس کڑی میں رشتے کی ایک کڑی ایسی تھی جسے توڑ کر وہ خود کو آزاد نہیں کر سکے تھے۔

خود کو ختم کرنے کا مطلب تھا پریتی کو ختم کرنا۔ دوسروں کو ختم کرنے سے وہ بھی زندہ نہیں بچتے۔ یا تو ایم ایل اے سلیم کانے کے لوگ اُسے مار دیتے۔ یا پولس مار دیتی۔ ہر صورت میں وہ مرتے، یعنی پریتی مرتی۔ اِس لئے وہ جینا چاہتے تھے۔ تا کہ 'باپ' اپنی 'بیٹی' کا 'محافظ' بن سکے۔

کلچر کے نام پر.......

آرٹ کے نام پر.......

رئیلیٹی کے نام پر.......

جو دکان نُما اسکول کھول کر منچ کی شو بھا بڑھا رہے تھے۔

معصوم بچّوں کی کالا بازاری کر رہے تھے۔

ویسے کرمنلوں کے چنگل سے ٹین ایج کو بچانا چاہتے تھے۔

گیٹار اور گھنگھروؤں کے بجائے ہاتھ میں قلم اور کتاب پکڑانا چاہتے تھے۔

اُس وقت تک کے لئے وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

20

سیاسی منچ، ویک اینڈ اور انٹرویو

قارئین!

پروگرام کی پہلی صبح........

شہر کے تمام چھوٹے بڑے اخباروں نے اِسے پہلے صفحے پر اہمیت دی۔ لِٹل ڈانسنگ کوئن پریتی سنگھ کی جہاں ڈانسنگ پوز میں بڑی بڑی تصویریں تھیں، وہیں منتری جی سے چیک ریسیو کرتے ہوئے شوبھا سنگھ کی ادائیں بھی کم جلوہ نہیں بکھیر رہی تھیں۔ بھیڑ کی ایک تصویر ایسی بھی تھی، جس میں ایک شخص کو ہیلمٹ، چشمہ اور داڑھی میں صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اِن تصویروں اور رپورٹنگ سے اخبار بینوں کے ذہن میں جو خاکہ بن رہا تھا اُس کے مطابق پریتی سنگھ شہر کی ایسی لِٹل ڈانسر تھی جس پر کل ملک کو ناز ہوگا۔

اِس ناز کی ناز برداری اُٹھانے کے لئے ابھی سے ہی ایم ایل اے اور منتری کمر کس چکے تھے۔ اُسے کس طرح ملک گیر پیمانے پر پرموٹ کرنا ہے اُس کا بلو پرنٹ بھی پرنسپل کے ساتھ مل کر تیّار کر لیا تھا۔

پروگرام کے بعد تو جیسے پورا شہر پریتی کو جاننے لگا تھا۔ اب تو سبھی اپنے پروگرام میں پریتی کو کم سے کم ایک ڈانس کے لئے بُلانا چاہتے تھے۔ ہر جگہ پریتی کا ڈانس آکسیجن کا کام کرتا۔ اگر کسی وجہ سے پریتی شامل نہیں ہو پاتی تو پروگرام کی سانسیں رکنے لگتیں۔ منتظمین کو وینٹی لیشن کا سہارا لینا پڑتا........ اب پریتی کی موجودگی بھیڑ اکٹھا کرنے کی ضمانت تھی۔ اور یہ ضمانت پہلے ہی چیف گیسٹ منتظمین سے لینا چاہتے تھے۔ اب تو ایم ایل اے، ایم پی، اور منتری جی سے بعد میں بات ہوتی۔ پہلے پریتی یعنی شوبھا سے منظوری لی جاتی۔ چیک دیا جاتا۔

ایسے میں منتظمین کی بھی مجبوری ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے ٹھیکیدار اور کمپنیوں کے

منیجر اپنے سیاسی فائدے کے لئے جب نیتاؤں کو بُلاتے تو اُنہیں خوش کرنے کے لئے پریتی کا ڈانس ضرور رکھواتے۔

ہر 'شو' کے بعد اخباروں میں تصویریں شائع ہوتیں۔ پریتی ماں کی گود میں نظر آتی۔ لوگ پریتی کو کم شوبھا کے فیشن ایبل کپڑے کو زیادہ دیکھتے.......... اب تو لوگ دکانوں میں، گھروں میں، دفتروں میں اُس کی تصویریں لگا کر رکھتے۔ کچھ کمپیوٹر کے ڈیسک ٹاپ پر، موبائل کے اسکرین پر تصویریں سیو کر کے رکھتے.......... ہر کسی کی زبان پر پریتی کا نام تھا۔ کئی ماؤں نے تو اپنی نومولود بیٹیوں کے نام پریتی رکھ دیا تھا اور کئی تو اُنہیں پریتی جیسا بنانے کے سپنے بھی دیکھنے لگی تھیں۔ کچھ نے تو پہلی ہی رات یہ طئے کر لیا تھا کہ اگر لڑکی ہوئی تو اُس کا نام 'پریتی' رکھا جائے گا۔ یعنی شہر میں کئی 'پریتیاں' ہوگئی تھیں۔ جو آنے والے دنوں میں ''پریتی ون'' اور ''پریتی ٹو'' کے نام سے منچ کی رونق بننے والی تھیں۔

اب ہر روز تصویر کھینچنے یا اِنٹرویو لینے کے بہانے کوئی نا کوئی پریتی کے گھر ضرور آتا۔ ایک دن مشہور اخبار ''نمبر ون'' کے رپورٹر نے معصوم پریتی سے اُس کی عمر سے بڑا سوال کر دیا۔

''بیٹا سات سال کی عمر میں آپ اتنا بہترین پرفارمینس کیسے کر پاتی ہیں........؟''

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اُس کی طرف سے میں جواب دیتی ہوں۔'' پریتی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شوبھا نے مائک اپنی طرف گھما لیا۔ ''وہ کیا ہے کہ یہ جب تین سال کی تھی تب سے ہی اِس کے پاؤں میوزک کی تھاپ پر تھرکنے لگے تھے۔ میں تو اِسے پڑھانا چاہتی تھی۔ لیکن بھگوان نے بچپن سے ڈانسر کے سارے گن بھر دئے تھے۔ ڈانس سے بے انتہا پیار کی وجہ سے میں نے اسکول چھڑوا کر اِسے ڈانس کلب جوائن کرا دیا۔ اب تو اِس کے انگ انگ میں ڈانس رچ بس گیا ہے۔ ڈانس ہی اِس کا عشق ہے۔ ڈانس ہی اِس کا پیار۔ اور ڈانس ہی اِس کا بھگوان بھی۔''

''بھگوان.......'' پریس رپورٹر نے بس یوں ہی اُس کے ساتھ یہ لفظ دہرا دیا

تھا۔

''.......کیا بیٹی میں سچ کہہ رہی ہوں نا.........؟'' آنکھ مٹکاتے ہوئے شوبھا نے پریتی کی طرف دیکھا۔

''جی.........جی ممّا.........'' اُس وقت پریتی کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ ویسے تو اُس کے دل میں آیا کہ وہ کہہ دے کہ پیسے کے لالچ میں میری ماں دن رات ڈانس کرواتی ہیں۔ نہیں کروں تو مارتی پیٹتی ہیں۔ کھانا بند کر دیتی ہیں۔ اِس ڈر سے کہ کہیں پریکٹس نہیں کی تو ایلمنیٹ ہو جاؤں گی اور لاکھوں روپئے اُن کے ہاتھ سے نکل جائیں گے........میں بھی دوسرے بچّوں کی طرح آزادانہ زندگی جینا چاہتی ہوں۔ میں بھی گڈّے گُڑیوں سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ شادی رچانا چاہتی ہوں۔ لیکن زبان کھولتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ کہیں گھر سے نکال نہ دیں۔ جان سے نہ مار ڈالیں۔

پریتی کا مختصر سا جواب ''جی'' نے پریس رپورٹر کو اندر سے بے چین کر دیا تھا کہ منچ پر خوبصورتی سے ڈانس کرنے والی لٹل ڈانسنگ کوئین کی ٹانگیں کیوں کپکپا رہی ہیں۔ اِس لئے اُس نے سوال کو ذرا گھما دیا۔

''چلئے جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اگر اُسے سچ مان بھی لیں تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ''ریئلیٹی شو'' میں جو کروڑوں روپئے نظر آرہے ہیں اُس کے لالچ میں آپ نے اِسے ڈانسر بننے پر مجبور کیا ہے۔''

شوبھا سمجھ گئی کہ پریس رپورٹر اُس سے کیا اُگلوانا چاہتا ہے۔ اِس لئے اُس نے ذرا سا وقت لیا اور پھر مسکراتے ہوئے سنبھل کر بولنا شروع کیا۔

''دیکھئے! جہاں تک بننا اور بنانا، یہ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی جو ہم بننا چاہتے ہیں وہ نہیں بن پاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ بن جاتے ہیں وہ سوچتے نہیں ہیں۔ بس ہم نے اِس کے ٹیلینٹ کو دیکھ کر ڈانسر بنانا چاہا........'' پریس رپورٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے۔'' اب میں آپ کے دوسرے سوال کا جواب دیتی ہوں۔'' پریس رپورٹر

کی ایک عزّت ہوتی ہے۔ لیکن اگر میں کسی چھوٹے موٹے کام کے لئے تین چار گُنا پیمینٹ کا آفر کر دوں تو مجھے یقین ہے کہ آپ قبول کر لیں گے۔ پیسے کا لالچ تھوڑا بہت تو ہر انسان میں ہوتا ہے.........آج شہرت کی چاہت کسے نہیں ہے.........؟ پیسے کی بھوک کون نہیں رکھتا........؟ اگر میرے اندر بھی ہے تو مجھے اِس میں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی۔ آپ کو اگر دکھائی دیتی ہے تو بتائیں۔''

پریس رپورٹر طرح طرح کا سوال کرتا ہے۔ شوبھا گول مول جواب میں چالاکی کی اِتنی دھار رکھتی کہ سوال کا سر قلم ہو جاتا ہے۔

لیکن پریس رپورٹر کی ہمّت نہیں ہارتا ہے۔ قلم ہوئے سر کو اُٹھا کر دھڑ کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

''شوبھا جی آپ نے اب تک جواب بہت صفائی سے دیئے ہیں اِس لئے چلتے چلتے یہ پوچھنا ضروری ہے۔ اور مجھے امیّد ہے کہ آپ اِس کا جواب سوچ سمجھ کر دیں گی۔ اِس کا تعلق بچّوں کے 'بچپنا' سے ہے۔ کھیل کود سے جُڑا ہوا ہے۔ کچھ قانونی پیچیدگیاں بھی ہیں کہ جہاں حکومت کسی دوسری جگہ کام کرنے والوں کو بال مزدوری کی شرینی میں رکھتی ہے وہیں چینلوں میں کام کرنے والے بچّوں کے والدین کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتی ہے.........؟''

''ان باتوں کو سامنے رکھ کر آپ سے ایک سیدھا سا سوال۔''

''اب آپ یہ بتائیں کہ جب بچّوں کی عمر کھلونے کھیلنے کی ہوتی ہے تب ماں باپ قانون کی آنکھوں میں آرٹ کلچر اور انٹرٹینمنٹ کی پٹّی باندھ کر ''ریئلیٹی شو'' کے نام پر معصوم بچّوں سے شفٹوں میں کام کرواتے ہیں۔ اس میں کتنی سچائی ہے۔ اور کیا یہ بال مزدوری نہیں ہے۔ اور اگر بال مزدور ایکٹ کے دائرے میں یہ آتا ہے تو اُن گارجین کو کیا سزا ملنی چاہئے جو بچّوں سے اِس طرح کی مزدوری کرواتے ہیں........؟ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے........؟''

اِس سوال پر شوبھا مسکراتی ہے۔ ''پریس رپورٹر صاحب آپ نے تو ایسا تلخ سوال پوچھ لیا ہے کہ اِس پر تو کئی لوگوں سے جواب ہی نہیں بن پڑے گا۔ آپ نے ''رئیلیٹی شو'' کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی ہے۔ اِنٹرٹینمینٹ کے نام پر سرکار بھی لاچار ہے۔ 'بال مزدور' ہوتے ہوئے بھی اُسے 'بال مزدور' نہیں کہتے۔ پھر دوسرا معاملہ ٹیکس کا بھی ہے۔'' اِس کے بعد وہ چند ثانیے کے لئے رُکتی ہے اور پھر کہتی ہے۔ ''ہاں اس میں سچائی ہے۔ میں ایسی کئی ماؤں کو جانتی ہوں جنہوں نے آرٹ اور کلچر کے نام پر کلا کو بدنام کیا ہے.........''

اصل سوال کو ہضم کرتے ہوئے بات کا رُخ دوسری طرف کچھ اِس صفائی سے موڑ دیتی ہے کہ رپورٹر بے چارہ شوبھا کا مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

''میں نے پریتی کے فیوچر کی خاطر اپنے پتی کو چھوڑا ہے۔ وہ اِسے بھی ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔'' تھوڑے وقفے کے بعد۔ ''کیا رکھا ہے آج کل کے ڈاکٹر میں ....؟ میں نے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔''

''نہیں ماننے کی کوئی خاص وجہ..........؟''

بس وہی گھِسی پٹی ذہنیت کہ بیٹی گھر کی عزّت ہوتی ہے........ارے میں پوچھتی ہوں کہ جب ایسا ہی ہے تو باپ اپنی بیٹی کی شادی ہی کیوں کرتا ہے.........؟ اُس وقت عزّت کہاں چلی جاتی ہے.........؟''

''لیکن شادی تو ایک الگ بات ہے۔''

''واہ! آپ بھی الگ کہہ رہے ہیں۔'' تیور تو اُس وقت ایسے تھے جیسے وہ اس بات پر پریس رپورٹر سے لڑ پڑے گی۔ ''اگر الگ ہے تو شادی کے سال بھر کے اندر دُلہنوں کے پیٹ کیسے پھول جاتے ہیں........بتائیے بتائیے.........؟''

اس موضوع پر زیادہ بات نہ کرتے ہوئے رپورٹر نے اپنا پنڈ چھڑانا چاہا۔

''دیکھئے اِن باتوں کو چھوڑیے اور اب یہ بتائیے کہ ابھی آپ کے اور ڈاکٹر کپل

کے بیچ کیسا چل رہا ہے۔؟''

''کیسا چلے گا.........؟'' آنکھوں کی گولیوں کو نچاتے ہوئے۔

''میرا مطلب ہے کہ پریتی کو لے کر آپ دونوں کے بیچ کوئی سمجھوتہ ہوا یا نہیں........؟'' پریس رپورٹر نے جاتے جاتے رشتوں کے بیچ کی گہرائی کو قلم کی لمبائی سے ناپنا چاہا تو شوبھا نے بغیر کسی تناؤ کے کہنا شروع کیا۔

''دیکھئے قریب میں ایک سالوں سے الگ ہوں۔ اور اب جب کہ اپنی بیٹی کو لائن اپ کر دیا ہے اور کچھ ہی دنوں میں وہ کروڑوں میں کھیلنے جا رہی ہے تو ڈاکٹر کپل سمجھوتہ کے لئے تیار ہیں۔''

مسکرانے کا انداز بتا رہا تھا کہ اُس نے بیٹی کو ڈانسر بنا کر ڈاکٹر کپل سے شروعاتی جنگ جیت لی ہے

☆☆☆

21

سمجھوتہ چینل اور نیم عریاں نچنیا جج

قارئین!

ڈاکٹر کپل یہ جانتے ہوئے بھی کہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' جل کر خاک ہوگئی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔لیکن اِس کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ رہنُما آپس میں سمجھوتہ کریں تا کہ ایک بار پھر وقت کی پٹری پر تعلقات کی ٹرین دوڑنے لگے........لیکن ایسا ہونا مشکل تھا۔کیوں کہ دونوں پہل کرنے میں اپنی شکست سمجھ رہے تھے۔لیکن سچّائی یہ ہے کہ ایسے حالات میں جو پہل کرنے کی ہمّت کرتا ہے''جیت''اُسی کی ہوتی ہے۔افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ''دنیاوی لغت'' میں پہل کرنے والے کو''شکست خوردہ''تسلیم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کپل کو یہ گوارا نہیں تھا کہ برسوں کے تعلقات ایک پل میں شیشہ ہوجائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ گھر کے دو چار لوگ آپس میں مل بیٹھ کر بات کریں اور کوئی راستہ نکلے۔

راستہ جب کہیں سے نکلتا ہے تو اُس کا دوسرا سرا منزل پر ہی جا کر ختم ہوتا ہے۔

اُن کی منزل تو پریتی تھی۔وہ شارٹ، لانگ کسی بھی راستے پر چلنے کے لئے تیّار تھے۔بس اُن کی خواہش تھی کہ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ بیچ میں یوٹرن نہ لے لے۔

لیکن شوبھا کو یوٹرن لیتے راستے اچھے لگتے تھے۔اور اب تو وہ دُنیا کو میڈیا کی نظروں سے دیکھنے بھی لگی تھی۔اس لئے ایک دن اُس نے ڈاکٹر کپل سے کہا۔

''ویسے زندگی میں مجھے اب آپ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔لیکن پھر بھی بات کرنا ہی چاہتے ہیں تو میں تیّار ہوں۔لیکن فیصلہ کون کرے گا یہ میں بتاؤں گی۔''

''کون کرے گا مطلب........؟''چونکتے ہوئے۔''دو لوگ تمہارے گھر سے ہوں گے اور دو کو میں اپنے یہاں سے بُلا لوں گا۔سب کے سامنے جو بھی فیصلہ ہوگا وہ دونوں

کو ماننا ہوگا۔''

''لیکن میں اِس طرح کے فیصلے کو نہیں مانتی۔''

''کیوں........؟''

''اس لئے کہ آج کل فیصلے گھر کی چہار دیواری میں نہیں بلکہ ٹی وی چینل کے سیٹ پر لائٹس، کیمرے اور اوڈیئنس کو سامنے ہوتے ہیں، جسے لائیو پوری دنیا دیکھتی ہے۔وہیں سچ کا سچ اور جھوٹ کا جھوٹ سامنے آجاتا ہے''۔

''تمہارا مطلب ہے کہ کون 'غلط' ہے اور کون 'صحیح' ہے اِس کا پتہ چل جاتا ہے۔لیکن اِس سے نقصان بھی ہوتا ہے۔''ڈاکٹر کپل نے نفی اور مثبت پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔''کیوں کہ کسی بھی معاملے میں دونوں گناہ گار یا پھر دونوں بےقصور نہیں ہوتے۔اکثر ایک غلط ہوتا ہے یا ایک کی زیادہ غلطی ہوتی ہے۔ایسی جگہوں میں جانے سے رسوائی ہاتھ آسکتی ہے........میرے خیال سے میاں بیوی کو اِس طرح کے جھگڑے لے کر وہاں جانا ہی نہیں چاہئے۔وہاں لائیو رُسوائی کسی اور کی نہیں ہماری یا تمہاری ہوگی۔پھر اِس کے بعد سماج کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔''سمجھانے کے انداز میں۔''دیکھو ابھی بھی ایک موقع ہے۔ہم لوگ آپس میں بیٹھ کر معاملات کو سُلجھا لیں۔''

''نہیں اب یہ نہیں ہوسکتا۔''اتنی جلدی میں شوبھا نے کہا جیسے زبان پر پہلے سے ہی ریکارڈیڈ ہو۔''مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے۔اب جو بھی فیصلہ ہوگا وہ چینل کے ذریعہ ہوگا.......منظور ہے تو ٹھیک ہے اور نہیں تو پھر ہمارے تمہارے راستے الگ الگ ہی ٹھیک ہیں۔''

شوبھا کے اِس فیصلے نے ڈاکٹر کپل کو اندر سے دہلا کر رکھ دیا۔لیکن معاملہ چوں کہ پریتی کا تھا اس لئے ہاں کرنا پڑا۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی.........''

اور پھر شوبھا نے اپنی مرضی کے مطابق اُس''پاپولر چینل'' کا انتخاب کیا جہاں ایک نچنیا نیم عریاں لباس زیب کئے فحاشی کی زبان میں چٹخارے لے لے کر اُلٹے سیدھے سوال

کرتی ہے اور فیصلے بھی اُسی انداز میں سناتی ہے۔ عزّت دار آدمی اِس طرح کے چینلوں میں جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن ڈاکٹر کپل مجبوراً وہاں جانے کے لئے تیّار ہو گئے۔

☆

''پاپولر چینل'' کا سب سے اہم پروگرام ''آپ کا فیصلہ'' کا سیٹ پوری طرح سے فیصلے کے لئے تیّار تھا۔

ڈبل مننگ گانوں پر ناچنے والی وہ نچنیا جس کی اِنٹری فلموں میں پائل ادا کے نام سے ہوئی تھی، بطور ہیروئن جب ناکام ہوئی تو ٹی وی سیریلس میں چھوٹے موٹے کام کرنے لگی۔ لیکن یہاں جب پیک اپ کا وقت آیا تو اُس نے جسم کی نمائش کے ساتھ کچھ ایسے بولڈ اِسٹیٹمنٹ دیئے، جیسے ''میرا بس چلے تو میں تو اُس کے ساتھ بھی سو سکتی ہوں جس نے مجھے پیدا کیا۔ آخر وہ بھی تو ایک مرد ہے اور عورت کو کیا چاہئے.........؟'' ایسے واہیات اسٹیٹمنٹ کے بعد اُسے تو زمیں دوز ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن داد دینے کو جی چاہتا ہے آج کے اِس میڈیا کو جہاں برائی کا پرچار بھی اِس طرح ہوتا ہے کہ اُس کی پاپولریٹی بڑھ جاتی ہے۔ راتوں رات وہ گٹر سے نکل کر ایورسٹ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے کوئی پاپولریٹی کی خاطر ''انڈین کرکٹ ٹیم کے ولڈ کپ جیتنے پر اپنے کپڑے اُتارنے کی بات کرتی ہے۔'' میڈیا کو چاہئے کہ ایسی شرم ناک خبروں کو چھپالے تاکہ شرم کے آبگینے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن یہی خبریں ٹی وی چینلس اور اخبارات میں ہفتوں موضوعِ بحث بنتی ہیں۔ جیسے کوئی 'انمول رتن' برسوں بعد ہاتھ آیا ہو۔

لیکن کچھ ایسے بھی رتن ہیں جو دن رات خون جگر جلا کر کاغذ پر انمول رتن بکھیرتے ہیں۔ اُن کے موتی جیسے دانوں سے گُتھے خوبصورت جملوں کو کوئی ہائی لائٹ نہیں کرتا۔

ہائی لائٹ کون ہوتا ہے؟

جو اپنے حُسن کے جلوے دکھانے کے لئے کپڑے اُتارتی ہے۔ جو پاپولریٹی گین کرنے کے لئے چمبن دیتی ہے۔ جو آداب کو بالائے طاق رکھ کر فحش گفتگو کرتی ہے۔ یہ ہے اسٹینڈرڈ ہمارے اِس میڈیا کا جو یہ کہتی ہے۔

''سب سے آگے اور تیز ہیں ہم''

تیز، آگے اور پہلے ہونے سے کیا ہوتا ہے........؟

اصل چیز یہ ہے کہ ہم کیا دکھا رہے ہیں؟ ہم کیوں دکھا رہے ہیں؟ اور کس کے لئے دکھا رہے ہیں؟

ننگی فلموں میں کام کرنے والی کنیڈین پورن اِسٹار کو سب سے بڑے رئیلیٹی شو میں شامل کر کے ہم اپنے ملک کی بہو بیٹیوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں........؟

میڈیا والوں یہ سوچنے کا مقام ہے۔

کیوں کہ تمہارے گھروں میں بھی بہو بیٹیاں ہیں۔

☆

دیکھنے اور دکھانے کا سلسلہ پاپولر چینل کے سیٹ پر بھی جاری تھا۔ مشہور نچنیا پائل ا پاؤں میں گھنگھرو باندھے چھم چھم کرتی ہوئی نمودار ہوتی ہے اور، مسکراتی، اِٹھلاتی، آنکھوں کی گولیاں نچاتی ہوئی اوڈینس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی نوٹنکی باز کی طرح ہاتھ جوڑ لیتی ہے۔

''شو کے قدردان، مہربان، صاحبہ و صاحبان.......! ہم ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ کے سامنے ایک ایسے پتی پتنی کا کیس لے کر آئے ہیں جو بہت دلچسپ ہے ....پتنی روشن خیال ہے بالکل میری طرح۔ اور میاں پڑھا لکھا ڈاکٹر ہونے کے بعد بھی ذہنیت وہی گھسی پٹی پُرانی ہے۔ عورت کو جاگیر سمجھتا ہے۔ اُسے گھر کے اندر ہی رکھنا چاہتا ہے......چھوٹے اور موڈرن کپڑے نہیں پہنے، ڈانس نہیں کرے۔ کسی کے ساتھ بات نہیں کرے۔ اور حد تو تب ہو گئی جب اُس نے اپنی سات سالہ بیٹی کے اُوپر ابھی سے اس طرح کی گھٹیا پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں۔ لیکن یہ سب مجھ جیسی روشن خیال بیوی بھلا کیسے برداشت کرے گی.......؟''

چھم چھم ....چھم چھم کرتی ہوئی وہ اوڈینس کے قریب آتی ہے اور پھر ایک ٹھمکا لگاتے ہوئے بولی۔

''تو اب میں بنا کسی تاخیر کے اُن دونوں کو یہاں بُلاتی ہوں۔'' ہمیشہ کی طرح

پھوہڑ ہنسی ہنستے ہوئے۔''اور اب آپ سب بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھیں تا کہ ایک اہم فیصلے
کے گواہ بن سکیں۔''

میوزک اور پھر گانے کی آواز اُبھرتی ہے........

''سات سہیلیاں کھڑی کھڑی، انجیکشن لگائے گھڑی گھڑی، ایک سہیلی کا میاں تھا
ڈاکٹر........میاں تھا ڈاکٹر.........''

گانے کی آواز کے ساتھ ہی الگ الگ دروازوں سے شوبھا اور ڈاکٹر کپل آتے
دکھائی دیتے ہیں۔شوبھا پورے جوش وخروش کے ساتھ ڈانس کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔
ڈاکٹر کپل سہج پاؤں رکھتے ہوئے گمبھیر دکھائی دیتے ہیں۔جج صاحبہ دونوں کے استقبال میں
ڈانس کرنا شروع کرتی ہے۔جیسے ہی دونوں قریب پہنچتے ہیں وہ باری باری سے کمر سٹا کر ٹھمکے
مارتی ہے۔شوبھا ٹھمکے کا جواب ٹھمکے سے دیتی ہے۔لیکن بے چارہ ڈاکٹر ٹھمکے کے زور سے
گرتے گرتے بچتے ہیں۔

ٹھہا کہ مارتے ہوئے نچنیا جج کہتی ہے۔

''شوبھا نے جو کچھ تمہارے بارے میں لکھا تھا اُس سے تو لگا کہ تم واقعی بہت
مضبوط قسم کے آدمی ہو گے۔لیکن تمہیں گرانے کے لئے تو میرا ایک ٹھمکا ہی کافی ہے۔''

پھر اُس نے دونوں کو دائیں اور بائیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔جب دونوں
بیٹھ گئے تو اوڈینس سے پوچھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کیسا لگا میرا ٹھمکا........؟''اِٹھلاتے ہوئے اُس نے کمر کو ایک
طرف جھکایا۔

''بہت خوب.........بہت اچھا.........''اوڈینس کا شور ہال میں گونجنے لگا۔

''کیا اور ماروں ٹھمکا.......؟''اِس بار اُس نے کمر کو دوسری طرف لوچ دیا۔

''ہاں ہاں.........ایک اور.........ونس مور.........''شور بدستور جاری تھا۔

''ارے ایک میں تو بے چارے کا بُرا حال ہو رہا ہے۔کیا جان لو گے شریف آدمی

کا۔''کمر اِس بار اُس نے سیدھی کر لی تھی۔

''شریف آدمی........میڈم آپ کسے شریف آدمی کہہ رہی ہیں۔میرے پتی کو
.........؟''شوبھا نے حیرت کا اِظہار کرتے ہوئے چلّانے کے انداز میں کہا۔''میرا تو
اُنہوں نے جینا محال کر رکھا ہے۔یہ کپڑا اتنا ٹائٹ کیوں ہے؟۔گلا اتنا بڑا کیوں ہے؟۔تم
اتنے چھوٹے کپڑے کیوں پہنتی ہو جس سے تمہاری جانگھیں تک دِکھ جاتی ہیں؟۔''

شوبھا نے روئیں سے آزاد اپنی ادھ کھلی جانگھوں کو لوگوں کے سامنے کر دیا جسے
پروگرام کے مدِّنظر ایک دن قبل بیوٹی پارلر کے حوالے کیا تھا۔

''ارے یہ مرد ہے یا نامرد..........؟''نچنیا جج نے اپنی ایک انگلی کو سیدھی کر کے
اسے نیچے جھکاتے ہوئے ٹھہا کا لگایا۔''مردوں کو تو یہی اچھے لگتے ہیں نا.........؟''

اوڈینس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آنکھ مارتی ہے اور اوڈینس بھی ''ہاں'' میں''
ہاں......''ملانے لگتے ہیں۔

پھر اِس کے بعد وہ ڈاکٹر کپل سے نوٹنکی کے انداز میں کہتی ہے۔

''تم مرد تو ہو نا.......؟ تمہاری بیوی کی باتوں سے تو مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔اگر
تم مرد ہو تو تمہیں عورتوں کے ٹائٹ کپڑے..........میری طرف دیکھو.........اب ہاں
میرے کپڑے میں دیکھو.........تمہیں کیا برائی نظر آ رہی ہے.........؟ بس یہی نا..........''
اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے''کہ یہ ٹائٹ ہیں۔ارے بھئی جو جیسا ہے اگر ویسا
دکھائی دیتا ہے تمہارا کیا جاتا ہے۔''

ٹھمکا لگا کر وہ ایک ٹھہا کا لگاتی ہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر کپل کی نظریں اس کے سینے کی طرف اُٹھ جاتی
ہیں۔نچنیا جج کچھ اور جھک جاتی ہے۔اس ادائے بے حیائی پر ڈاکٹر کپل کو گھِن سی آ جاتی ہے
۔وہ شرم سے اپنی نظریں نیچی کر لیتے ہیں کہ کہیں بنا بنایا معاملہ بگڑ نہ جائے۔

لیکن شوبھا کو معاملہ بگڑنے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔شاید اِسی لئے وہ تن

کر نچنیا جج کے ہی اسٹائل میں بیٹھی تھی۔اور نچنیا جج، ڈاکٹر کپل سے پوچھ بھی اِس طرح رہی تھی جیسے ساری غلطی ان کی ہو۔اس لئے فیصلے کی آخری کیل بھی وہ اُسی کے سینے میں پیوست کرتی ہے۔

''ہاں تو جناب! اب یاد آپ کو بیٹی آرہی ہے جب وہ کمانے لگی ہے۔'' نچنیا جج نے طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔''بیٹی کو ڈانسر تو آپ کی پتنی نے بنایا ہے۔ اِس لئے اُس کے پیسے پر پورا ادھیکار........'' اوڈینس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔''کیوں بھائیو اور بہنو! اُن کی پتنی کا ہونا چاہئے کہ نہیں؟'' اوڈیئنس کی طرف سے''ہاں ہاں'' کا شور اور اِس کے ساتھ ہی ساتھ تالیوں کی گڑگڑاہٹ۔

اس وقت تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ڈاکٹر کپل کے کان پھٹنے لگے تھے۔نچنیا جج کندھے سے ہاتھ ہٹا کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کمر لہرا کر زوردار ٹھمکے لگاتی ہے اور پھر پھوہڑ ہنسی ہنستے ہوئے اپنی جگہ آجاتی ہے۔پھر کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے۔''اگر یہ سب منظور ہے ڈاکٹر! تو پھر میں آپ کی شوبھا شری کو سمجھاؤں گی کہ وہ آپ کو اپنے گھر بلا لے۔لیکن اِتنا یاد رکھنا کہ جب تک وہ خود سے یہ نا کہے کہ میں بیمار ہوں تب تک انجیکشن لگانے کی غلطی نہیں کرنا۔سمجھے.....؟''

''جی........'' ڈاکٹر کی زبان پر سہا ہوا یہ لفظ آکر ٹھہر گیا۔

نچنیا جج اِٹھلاتی ہوئی اُٹھی اور دونوں کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ایک زوردار ٹھمکا لگائی۔پھر اوڈینس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میاں بیوی کے درمیان کسی بھی طرح کا کوئی مسئلہ ہو تو آپ قدردان مہربان مجھ سے ملیں۔ہر مسئلہ کا حل ہے میرے ٹھمکے میں۔''

اور پھر کئی ٹھمکے لگتے ہیں.........

اس کے بعد شوبھا اور ڈاکٹر کپل ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیٹ سے باہر جاتے دکھائی دیتے ہیں۔پورا سیٹ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اُٹھتا ہے۔

☆☆☆

22

زندگی کا منچ، گیسٹ ہاؤس اور چھتری

قارئین!

اب ڈاکٹر کپل کی زندگی کے سیٹ پر تالیوں کی کوئی گڑگڑاہٹ نہیں تھی۔ پریتی کے مستقبل سے جڑے کئی پینچ ایسے تھے جو دل میں صحیح جگہ ڈرِل نہیں ہونے کی وجہ سے اندر جاتے جاتے رہ گئے تھے۔اِس لئے وہ پائیداری نہیں آسکی تھی جو دونوں کے بوجھ کو جھیل سکتے۔

ایک نہ ایک دن اس سیٹ کو گرنا تھا۔

ڈاکٹر کپل نے اسکرو ڈرائیور سے دوبارا پینچ کو ٹائٹ کرنا چاہا۔لیکن ٹائٹ کرنے سے پہلے ہی شوبھا نے اُسی جگہ ڈرِل مشین چلا دی۔سوراخ بڑا ہو گیا اور پینچ نیچے گر گیا۔زندگی کا سیٹ ڈاکٹر کپل کے سر پر آ گیا۔

چوٹ لگی تو وہ بے ہوش ہو گئے۔

اور جب ہوش میں آئے تب تک شوبھا پریتی کو لے کر اِس گھر سے جا چکی تھی۔اُس فلیٹ میں جسے اُس نے پریتی کے ڈانس شوز میں ملے نذرانے سے خریدا تھا۔

نچنیا کم جج پائل ادا کے فیصلے کے مطابق اب ڈاکٹر کپل کو اپنے گھر چھوڑ کر شوبھا کے اُس فلیٹ میں جا کر رہنا تھا۔ویسے ڈاکٹر کپل کسی بھی قیمت پر وہاں جانا نہیں چاہتے تھے۔لیکن عمر کی بارہویں سیڑھی میں قدم رکھتے ہی بیٹی کی فکر ستانے لگی تھی۔وہ جانتے تھے کہ شوبھا ریئلیٹی شو کے آسمان سے برستے پیسے جیسی بوندوں سے پریتی کو قبل از وقت اِتنا شرابور کر دے گی کہ اُس کے چھوٹے اور جسم سے چپکے کپڑے خود بخود ٹرانسپرنٹ ہو جائیں گے۔وہ بھاگنے کی کوشش بھی کرے تو بھی کسی چھت تک پہنچتے پہنچتے بھیگ جائے گی۔اِس لئے وہ چھتری بن کر شوبھا کے اُس فلیٹ میں رہنا چاہتے تھے۔

تین کمرے کے اِس فلیٹ میں اُسے سب سے آخر کا کمرہ ملا تھا۔ اِس کمرے کی خاص بات یہ تھی کہ یہ ٹوائلیٹ باتھ روم کے بغل میں تھا۔ بیچ والے کمرے میں شوبھا، پریتی کے ساتھ رہتی تھی۔ اور ہال کے ساتھ جو کمرہ تھا اُس نے وی آئی پی گیسٹ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر کپل چاہتے تھے کہ ہال کے ساتھ والے کمرے میں رہیں۔

''نہیں وہ کمرہ نہیں مل سکتا۔ کیوں کہ میں نے وہ پریتی کے ڈانس پریکٹس کے لئے رکھا ہے۔ پھر اکثر وی آئی پیز آتے رہتے ہیں۔ وہ کہاں رُکیں گے.........؟'' طنزیہ انداز۔ ''اگر تمہیں وہ اندر والا کمرہ پسند نہیں ہے تو تمہاری مرضی ....ویسے میں تمہیں یہاں سے جانے کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں۔ پھر بھی تم رہنا چاہو تو اِس گھر کے قاعدے قانون کا پالن تو کرنا ہی ہوگا۔''

'' کیسے قاعدے قانون.........؟'' ڈاکٹر کپل کو اپنی ہی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئے سنائی دی۔

آواز کی اِس گہرائی کو ناپتے ہوئے شوبھا کو اطمینان ہوا کہ اب اگر خالی کمرے کا راز فاش بھی ہو گیا تو بھی وہ بیٹی کی خاطر بے شرم بن کر رہیں گے۔ اگر اُس نے اُن کے اندر بے شرمی پیدا کر دی پھر تو سمجھو دلال کے تھوڑے بہت گُن بھی اُن کے اندر آنے لگیں گے۔ اور پھر ایک دن تمہارے لئے یہی آدمی مسٹر شرما کی طرح آگے پیچھے دُم ہلائے گا۔ اِن ساری باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے شوبھا نے اُنہیں سمجھایا۔

''دیکھو اب تمہاری بیٹی مشہور ڈانسر بن چکی ہے۔ جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں۔ اب شہر میں کوئی بھی پروگرام اِس کے بغیر کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔ اِس لئے شوز کے سلسلے میں بات کرنے، ڈیٹس لینے، ریہرسل دیکھنے اور ایڈوانس وغیرہ کے لئے اِسی کمرے کا استعمال ہوتا ہے۔ اور وی آئی پی گیسٹ کے آرام کے لئے بھی یہی کمرہ کام میں آتا ہے۔''

''لیکن وی آئی پی گیسٹ کو تو گیسٹ روم میں آرام کرنا چاہئے نا.........؟''

''دیکھو اب پریتی کی وجہ سے ہمارا اِسٹیٹس بھی وی آئی پی ہو گیا ہے۔ میں کہیں بھی

جاتی ہوں تو میرا آؤ بھگت جس طرح سے ہوتا ہے اُسی طرح سے مجھے بھی وی آئی پیز کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔'' بات میں نرمی پیدا کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

''لیکن اپنے اِسٹیٹس اور وی آئی پیز کے خیال میں اِتنا ضرور خیال رکھنا کہ اب ہماری بیٹی بڑی ہو رہی ہے۔'' ڈاکٹر کپل کی آواز کنویں کے اور اندر سے آتی ہوئی سنائی دی۔

''بس اب اِس کے بڑے ہونے کا ہی تو ہمیں انتظار ہے۔'' شوبھا یہ سوچ رہی تھی جب کسی کو بے شرم بنانا ہو تو اُس کے ساتھ پہل بے شرمی بھری باتوں سے ہونی چاہئے۔ اِس لئے وہ آگے کہتی ہے۔ ''ویسے ایک بات یاد رکھنا کہ بیٹی دوسرے کے لئے ہی بڑی ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر کپل بے شرمی بھری باتیں مجبوری میں سُن تو سکتے تھے، لیکن ایسی باتیں وہ کبھی سوچ نہیں سکتے تھے۔ اِس لئے وہ صرف سنتے رہے۔ بے عزّتی برداشت کرتے رہے۔ کیوں کہ اُنہیں اپنی عزّت کا پاس تھا۔

ڈاکٹر کپل نے اِس بے شرمی اور بے عزتی کے باوجود خود کو سنبھال لیا۔ یہ سوچ کر کہ اگر وہ اُس کی باتوں کا معقول جواب دیا تو پھر وہ کہے گی کہ ''یہاں سے جاؤ۔'' اِس لئے مصلحتاً خاموش رہتے ہیں۔ شوبھا کو ڈاکٹر کپل کی یہ خاموشی اچھّی لگتی ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ اُس میں دھیرے دھیرے دلال کی خوبیاں سرایت کر رہی ہیں اور ایک نہ ایک دن وہ اس کے کہنے پر عزّت کی چھتری کو بند کر کے کسی کونے میں رکھ دیں گے۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ بھرم بھی ٹوٹ گیا۔ وہ آئے ہی تھے دھوپ اور بارش سے پریتی کو بچانے کے لئے۔ اِس لئے چھتری رکھنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔

کچھ دنوں سے شوبھا اب یہ دیکھنے لگی تھی کہ ڈاکٹر کپل کلینک سے آنے کے بعد چھتری کو دیوار پر ٹانگنے کے بجائے دروازے کے سامنے ہی کھلی چھوڑ دیتے تھے۔ شوبھا کو یہ بات ناگوار گذرتی تھی۔

ایک دن کلینک سے لوٹتے وقت ڈاکٹر کپل نے پریتی کے لئے ریڈی میڈ سوٹ

خریدا۔ جب وہ گھر پہنچے تو شوبھا باتھ روم میں تھی۔ اُنہوں نے سوٹ پریتی کو دکھایا اور پہننے کے لئے کہا۔ اِدھر پریتی نے سوٹ پہنا اور اُدھر شوبھا باتھ روم سے باہر نکلی۔ شلوار کرتا اور کام کئے ہوئے دوپٹے میں جب ڈاکٹر کپل نے دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں مسکراہٹ کے جگنو چمکنے لگے۔ لیکن وہیں شوبھا بھڑک گئی۔ اِتنا واویلا مچایا کہ ڈاکٹر کپل حیران رہ گئے۔

''تم نے یہ سوٹ خریدا کیوں........؟'' دوپٹہ پریتی کے کندھے سے کھینچتے ہوئے۔ ''ایسے کپڑے پہنا کر تم میرے خلاف اِسے بھڑکانا چاہتے ہو۔''

''نہیں نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر کپل نے بات کو بگڑتے دیکھ کر نرمی سے کہا۔ ''دراصل میں ایک دکان کے پاس سے گذر رہا تھا۔ شوکیس میں لگا یہ سوٹ اچھا لگا اور میں نے خرید لیا کہ ایک ہفتے کے بعد پریتی کا برتھ ڈے ہے۔''

''ایڈیئٹ .... برتھ ڈے میں میری بیٹی ایسے کپڑے پہنے گی۔'' اُس نے غصّے میں دوپٹے کو دو ٹکڑا کر دیا۔ ''منتری جی نے ایک مہینہ پہلے ہی ممبئ کے مشہور ڈریس ڈیزائنر سے اسپیشل ڈیزائن کروا کر ڈریس بھیجوایا ہے ....اپنا نہیں تو کم سے کم بیٹی کے اسٹیٹس کا تو خیال رکھا ہوتا۔''

ڈاکٹر کپل جب کھانے پینے کی چیزیں بیٹی کو لا کر دیتے تو وہ بھی شوبھا کو پسند نہیں آتی۔ منع کرتی۔ ڈانٹتی تو پریتی کو بھی غُصہ آتا کہ وہ کسی اور سے تو نہیں لے رہی ہے۔ وہ اُس کے پتا ہیں۔ لیکن اِس عمر میں اتنا کہنے کی جرأت اُس میں نہیں تھی.........اکثر جب بھی کوئی اَنہونی ہوتی وہ سوچتی کہ جسے ممّا! رات دن اُلٹا سیدھا کہتی ہیں، گالیاں دیتی ہیں۔ وہ یہ سب سننے کے بعد بھی یہاں کیوں رہتے ہیں؟ چلے کیوں نہیں جاتے۔؟ اُن کی وجہ سے ہی ہمیشہ اُسے ڈانٹ پڑتی ہے.......لیکن وہ اب اتنا جاننے لگی تھی کہ پاپا کے چلے جانے کے بعد اُس پر ممّا کا شکنجہ اور کس جائے گا۔ تنہائی کچھ اور بڑھ جائے گی۔ اس لئے وہ خوف زدہ رہتی۔

کچھ ہی دنوں میں شوبھا کو بیٹی کے اُوپر تنی باپ کی چھتری پسند نہیں آئی۔ یوں تو

چھتری دھیرے دھیرے پُرانی ہونے لگی تھی۔ جگہ جگہ سے سلائی کُھل رہی تھی۔ ایک دن سوئی دھاگا لے کر ہال میں مرمّت کرنے بیٹھے تو وہ بوکھلا گئی۔ آنکھوں میں سُرخ رنگت گھُل گئی۔ غصّے میں اُس نے چھتری چھیننے کی کوشش کی۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہو تم........؟'' اُنہوں نے ہینڈل پکڑ لیا۔

''وہی جو مجھے بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔'' اُس نے زور لگانے کی کوشش کی۔

''کیا........؟'' چھتری اپنی طرف کھینچتے ہوئے۔

''چھتری اب بہت پرانی ہوگئی ہے ڈاکٹر! اور اب اس کے کپڑے بھی سڑ چکے ہیں۔ کتنی بدبو آ رہی ہے اِس سے۔'' ناک سکوڑتے ہوئے جیسے مرا ہوا چوہا سامنے ہو۔

''نہیں نہیں میں اِسے تمہیں پھینکنے نہیں دوں گا۔ پریتی کی پیدائش کے دن جب خوب بارش ہو رہی تھی تو میں نے اِسے خریدا تھا اور اِسے ہی لے کر اسپتال پہنچا تھا۔ یہ تو پریتی کی پیدائش کی نشانی ہے۔''

''نشانی ہے تو سنبھال کر اپنے کمرے میں رکھو۔ ورنہ جس دن بدبو سے میرا دم گھُٹنے لگے گا اُس دن میں یہ نہیں دیکھوں گی کہ یہ کس کی نشانی ہے۔'' آواز میں تیزابیت گھُلی ہوئی تھی۔

جب کوئی اپنے عظمت و وقار کی نشانی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو اُس سے اُس نشانی کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بلکہ وقت کا پیامبر ویسے بےقدروں کی پیشانی پر 'ابنارمل' کا لیبل چپکا دیتا ہے۔

اب ڈاکٹر کپل اپنی اِس نشانی کو دروازے کے کونے میں چھپا کر رکھنے لگے تھے۔

اِدھر کچھ دنوں سے خوب بارش ہوئی تھی۔ اِس لئے چھتری بھیگی ہوئی تھی۔ ایک دن اچھّی دھوپ نکلی تو ڈاکٹر کپل نے سوچا کہ چھتری کو بالکونی میں دھوپ دکھا دی جائے۔ بالکونی بیچ والے کمرے کے ساتھ تھی، اس لئے پریتی کو رکھنے کے لئے کہہ دیا۔ پھر کیا تھا

۔شوبھا نے وہ ہنگامہ کیا کہ سڑک پر چلتے لوگ باگ رُک رُک کر بالکونی کی طرف دیکھنے لگے۔آخر کار شوبھا چھتری پھینکنے میں کامیاب رہی۔

''اے سی کار میں بیٹھنے والوں کو بارش میں کسی چھتری کی ضرورت نہیں پڑتی۔اِس لئے مہربانی کر کے آپ نیچے سے اپنی بدبودار چھتری اُٹھائیں اور یہاں سے جائیں۔'' شوبھا نے سڑے انڈے جیسے لفظوں کی ٹوکری اُن کے سر پر پٹک دی۔اِس سڑاندھ میں رہنا اب ڈاکٹر کپل کے لئے بھی مشکل ہو گیا تھا۔

اُس وقت ڈاکٹر کپل کو ایسا لگا جیسے شوبھا نے چھتری نہیں پھینکی ہے۔بلکہ پریتی کو ہی بالکونی سے پھینک دیا ہے۔چھتری اُٹھانے وہ نیچے اُترے۔تو دیکھا کہ چھتری کے نیچے پریتی کراہ رہی ہے۔وہ اُسے اُٹھا کر دوبارہ بے شرم کی طرح سیڑھیاں چڑھنے کے لئے پیچھے مُڑے تب تک اُوپر جانے والا دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔

خون کے آنسو لئے ایک بار پھر چھتری کی گرد جھاڑا۔پریتی کو گود میں سنبھالا اور چھتری کھول کر اُس کے نیچے چلنے لگے۔

لیکن جب چلتے چلتے اُنہوں نے ایک نظر بالکونی پر ڈالی تو حیرت زدہ رہ گئے کہ ڈری سہمی سی پریتی بالکونی میں ہی رہ گئی ہے۔پھر وہ اپنی گود میں کسے لے کر چل رہے ہیں ....؟ اُنہوں نے اپنی گود کی طرف دیکھا۔جہاں اب کوئی نہیں تھا۔اُنہوں نے ایک بار پھر بالکونی کی طرف دیکھا۔لیکن اِس بار ڈری سہمی سی پریتی بھی وہاں نہیں تھی۔اُسے شوبھا کھینچتے ہوئے اندر لے جا چکی تھی۔اب وہ چاہ کر بھی اُس فلیٹ کی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے تھے۔کیوں کہ وہاں تالا لگ چکا تھا۔

پریتی بالکونی میں ہی چھوٹ گئی تھی۔چھتری کھُلا رکھنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ بند کر کے ہاتھوں میں اُسے اِس طرح سنبھال لیا جیسے وہ نیم مردہ حالت میں اپنی بچّی کو لے کر ہسپتال جا رہا ہو۔

اِس حالت میں ڈاکٹر کپل اپنے گھر پہنچے۔جیب سے چابھی نکالی۔دروازہ کھولا۔

اندر گئے۔چاروں طرف گرد ہی گرد تھی۔لیکن وہ اِس کی پرواہ کئے بغیر وہ صوفے پر بیٹھے اور اپنے بغل میں چھتری کو اس طرح رکھا جیسے پریتی کو سلا رہے ہوں۔پھر وہ سوئی دھاگا، پلیئر اور تار لے آئے۔بہت دیر تک چھتری کو درست کرتے رہے۔بڑی مشکل سے وہ اِس لائق ہوئی کہ ضرورت پڑنے پر اُس کا استعمال کیا جا سکے۔پھر اُس چھتری کو گھر کے اُسی مخصوص جگہ پر رکھ دیا جہاں برسوں سے سنبھال کر رکھتے آئے تھے۔

☆☆☆

23

ریئلیٹی شوز،جہیز اور فرض شناسی

قارئین!

پریتی کا ڈانسنگ سفر جاری تھا۔

بارہ سے چودہ کی عمر تک آتے آتے جہاں پریتی کے ڈانس میں پختگی آنے لگی تھی، وہیں اُس کے جسمانی ساخت میں بھی بہت ساری تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھی۔ اِن بدلتے حالات میں کس طرح خود کو تبدیل کرتے رہنا ہے یہ ہُنر تو شوبھا نے وقت سے پہلے ہی اُسے سکھا دیا تھا۔ اِس لئے پل پل واضح ہونے والی تبدیلیوں سے وہ کبھی پریشان نہیں ہوئی۔ ایک دوست کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

ٹی وی پر اشتہار آنے شروع ہو گئے تھے۔

پریتی ریاض میں جُٹ گئی تھی۔

ملک گیر پیمانے پر پندرہ بیس میں جگہ بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

لیکن یہاں بھی اُسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

''انڈر سکسٹین سپر ڈانسنگ ریئلیٹی شو'' میں ایم ایل اے سلیم کانے نے منتری جی سے کہہ کر اُس کی بیک ڈور اِنٹری کروادی۔ ویسے پریتی اپنے شہر کی ڈانسنگ کوئین تو تھی ہی لیکن شہر سے باہر نکل کر ملک گیر سطح پر اپنی پہچان قائم کرنے میں کچھ دشواریاں تھیں، لیکن پریتی نے اِن دشواریوں پر آہستہ آہستہ قابو پانا شروع کر دیا تھا۔ ہر ہفتے جیسے جیسے کنٹسٹینٹ ایلیمینیٹ ہوتے رہے اُس کے لئے ٹائٹلینٹیڈ کنٹسٹینٹ کے درمیان خود کو محفوظ رکھ پانا مشکل ہونے لگا۔ اِن حالات میں شوبھا نے اُس کا پورا ساتھ دیا۔ یہاں تک کے اُس نے تین ججوں کی جماعت کے برگزیدہ جج سے مل کر اپنا منشاء ظاہر کر دیا تھا۔

''اِس شوز میں بنے رہنے کے لئے جو بھی قیمت ہوگی میں چکانے کے لئے تیّار

ہوں۔ بس تھوڑی سی نظرِ کرم کی ضرورت ہے۔'' چائے کی پہلی شپ کا لُطف اُٹھاتے ہوئے وقفے کے دوران شوبھا نے کہا۔

''دیکھئے ہم لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کی بیٹی کچھ شرمیلی ہے۔ تھوڑا آپ اُسے سمجھائیں کہ اِس لائن میں جس نے بھی شرم کا دامن تھاما وہ دوسرے ہی دن ایلیمینیٹ ہو کر گھر گیا........'' برگزیدہ جج کی آنکھیں شوبھا کے چہرے سے اُتر کر گلے کے نیچے کچھ تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔'' آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات.........؟''

''جی بہت اچھے سے ....'' تھوڑا سا جسم کا زاویہ بدلتے ہوئے شوبھا نے، برگزیدہ جج کے سامنے فردوس کا نظارہ رکھ دیا۔'' کیا میں بات کرتے ہوئے شرما رہی ہوں ....؟ تو پھر اتنی دور صوفے پر کیوں بیٹھے ہیں۔ ذرا نزدیک آئیے تا کہ اِس مسئلے پر کھل کر باتیں ہو سکیں''؟ مسکراتی ہوئی وہ کچھ سرک کر آگے بڑھ گئی تھی۔

اخلاقاً برگزیدہ جج کو بھی اُس کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھنا ہی تھا۔

''اب جب آپ کا ساتھ مل گیا ہے تو مجھے اُمیّد ہے کہ پریتی اِس شوز کو جیتنے میں کامیاب ہوگی۔'' اُنہوں نے اپنے ہاتھوں میں شوبھا کا ہاتھ تھام کر اُسے یقین دلانا چاہا۔

''مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔'' شوبھا نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی برگزیدہ جج کے مضبوط ہاتھوں میں دے دیا۔

''دیکھئے میں تو اپنی طرف سے کوشش کروں گا ہی۔ لیکن کبھی کبھی آپ دوسرے جج صاحبان کو بھی خوش کر لیا کیجئے گا تا کہ کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔؟''

''جی! اگر آپ یہ نہیں بھی کہتے تو بھی میں اِسے اپنے 'فرض' میں شامل رکھتی۔''

اس نے یہ بات اِس طرح کی جیسے زندگی گذارنے کے بنیادی فرائض میں اِسے اوّلیت حاصل ہو۔

''انڈر سکسٹین سُپر ڈانسنگ ریئلیٹی شو'' کے فائنل پانچ کنٹسٹینٹ میں پریتی کے

لئے جگہ بنانے میں شو بھا فرض نبھاتی رہی۔ ڈانس کے پہلے پائیدان تک پہنچنے کے لئے اپنے فرض کی قربانی دیتی رہی۔ اور اِس قربانی کے بدلے ہر ہفتے ایک ایک زینہ وہ اُوپر اُٹھتی رہی۔ اور جیسے جیسے وہ اُوپر اُٹھ رہی تھی ویسے ویسے جمیز کی نظرِ کرم بھی پریتی پر بڑھتی جا رہی تھی۔

اور اب تمام جمیز پریتی کو ڈانسنگ اسٹیپ سکھانے میں لگے ہوئے تھے جسے کر پانا بہت مشکل تھا۔ لیکن اُسے سیکھ جانے کا مطلب تھا کہ فتح بس قدم چومنے والی ہے۔ اب تو ریہرسل کے نام پر وقت بے وقت بھی پریتی کو پریکٹس کے لئے بُلا لیا جاتا۔ اِس طرح کی اسپیشل پریکٹس کے بعد کئی بار پریتی نے ماں کے کان میں کچھ کہا......... شو بھا پہلے تو اِن باتوں کو سُنی اَن سُنی کرتی رہی۔ لیکن ایک دن پریتی نے اسپیشل پریکٹس میں جانے سے ہی انکار کر دیا۔

''نہیں ممی! اب میں صرف روٹین پریکٹس ہی کروں گی۔''

''کیوں.........؟''

''بس ایسے ہی.......... مجھے اسپیشل پریکٹس پسند نہیں ہے۔ کوئی بھی وہاں نہیں ہوتا اور میں اکیلی..........'' پریتی کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھی۔

''ارے یہ کتنی اچھی بات ہے کہ تمہیں اکیلے میں وہ سب کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے جو دوسروں کو نہیں مل سکتا۔'' شو بھا نے 'اکیلی' والی بات کی روشنی میں موقعے کا فائدہ اُٹھانے کی بات کہہ کر اُس کے معصوم ذہن کو قصداً بھٹکانا چاہا۔

''لیکن ممّا آپ سمجھنے کی کوشش کریں......... کہ میں اکیلے میں ریہرسل کیوں نہیں کرنا چاہتی۔''

لیکن پریتی کے لاکھ سمجھانے کے بعد بھی شو بھا نے سمجھداری دکھاتے ہوئے اپنے تجربات کی روشنی میں ڈانس کی لُغت سے اسپیشل پریکٹس یا ریہرسل کا ایک نیا ہی مفہوم نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

''میں سب سمجھتی ہوں بیٹا۔ میں سیدھے اتنی بڑی نہیں ہو گئی۔ لیکن کیا کرو

گی.......؟ یہی آج کی دنیا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے کہ سیکھنے کے عمل میں سکھانے والے کے قول و فعل کا احترام کرو۔''

ہر اسپیشل پریکٹس کے بعد پریتی احتجاجاً ماں کے سامنے کچھ نہ کچھ مسئلہ رکھتی........ اور ہر بار اِس طرح کے مسئلے کو مستقبل سازی کے فارمولے میں فٹ کر کے اُسے شو بھا حل کرنے کی کوشش کرتی۔

''بیٹی جس اونچائی پر تمہیں پہنچنا ہے۔ اِس میں سے سمجھو یہ ایک سیڑھی ہے۔ لیکن ذرا سوچو کہ اگر کسی نے اِس وجہ سے سیڑھی کھینچ لی تو.......... سارے خواب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ بیٹا سکھانے والوں کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔ اِس لئے جتنا اُن کا حق ہے وہ لیتے ہیں تو لینے دو۔ چھونے چھانے سے کیا ہوتا ہے.........؟''

اِس کے بعد پھر پریتی نے ماں کے 'کان' میں کبھی کچھ نہیں کہا......... کہا تو باپ کے کان میں بھی کچھ نہیں۔ لیکن آسمان میں گھرتے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر ڈاکٹر کپل کو اکثر یہ ڈر ستانے لگتا کہ اگر یہ برسنے کے لئے بے تاب ہو گئے تو پھر تو پریتی کا کیا ہوگا؟ کیوں کہ چھتری تو اُس کے پاس ہے۔ بھیگنے سے وہ خود کو کیسے بچائے گی؟........ یہی وہ سوال تھا جو ہمیشہ اُن کا پیچھا کرتا۔

اِن سوالوں سے جب وہ بھاگ نہیں پاتے، تو بے چین ہو جاتے۔ کام میں دل نہیں لگتا۔ بس ہر وقت اُن کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی رہتیں۔ آتے جاتے بادلوں کو گھورتی رہتیں.......... اور جیسے ہی بارش، امکانات کی بوندوں میں ڈھل کر نیچے آنے کے لئے بے تاب نظر آتی، وہ اپنی بوسیدہ سی چھتری لئے سڑکوں پر نکل آتے۔ آتے جاتے لوگوں سے پوچھتے۔

''آپ نے کہیں میری پریتی کو دیکھا ہے۔ وہ ابھی بچّی ہے اور بغیر چھتری کے باہر نکل آئی ہے۔ اگر کہیں دکھائی پڑ جائے تو اُسے میرے پاس لے آیئے گا تا کہ یہ چھتری دے سکوں۔''

ایسے میں کچھ لوگ اُنہیں پاگل سمجھتے ۔ کچھ ڈھونڈنے نکل پڑتے اور کچھ جو اِس حقیقت سے آشنا تھے وہ اُن کی اِس حالت پر ہنستے ۔ کچھ لوگوں کو اُن پر رحم آجاتا ۔ اکثر اُن کے دوست واحباب اُنہیں سمجھا کر گھر واپس لوٹ جانے کے لئے کہتے ۔ لیکن جب تک بارش ہورہی ہوتی وہ گھر نہیں لوٹتے ۔ اِس امیّد پر کہ کہیں پریتی نظر آگئی تو وہ اُس کے سر پر چھتری تان سکیں گے ۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔اور ہر بار وہ مایوس قدموں کے ساتھ گھر لوٹتے رہے۔

گھر لوٹنے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ چھتری کھُلی رکھتے ۔ ہاتھ میں تھامے رہتے ۔اُس وقت وہ پسینے میں شرابور ہوتے ۔اُن کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہوتا۔ٹانگیں کپکپارہی ہوتیں ۔ زبان میں لغزش ہوتی ۔ وہ کبھی آسمان کو دیکھتے تو کبھی زمین کو........کبھی بادل کو تو کبھی پانی کو.......لیکن ایسے میں وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتے ۔ کیوں کہ وہ تو پریتی کو دیکھنا چاہتے تھے۔لیکن پریتی تھی کہ شوبھا کی ڈور سے بندھی ہوئی تھی ۔ جسے کھولنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ کیوں کہ اُس ڈور پر ایم ایل اے اور منتری جی نے بھی ایک پر ایک گانٹھ مضبوطی سے باندھ دی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ جہاں یہ گانٹھیں مضبوط ہورہی تھیں وہیں اُن کی چھتری اور بھی بوسیدہ ہوتی جارہی تھی ۔جگہ جگہ سوراخ بننے لگے تھے ۔اب بارش میں اِس چھتری کا استعمال بے معنی ہوگیا تھا۔اِس لئے اُنہوں نے چھتری کو اسٹور روم کی قبرگاہ میں ہمیشہ کے لئے دفن کردینا چاہا۔لیکن وہ ایسا نہیں کرسکے۔ پیوند لگا کر کام چلاتے رہے۔لیکن اِس پیوند کا کیا فائدہ؟ جہاں لگائے تھے، وہاں کے کپڑے بھی مسکنے لگے تھے۔ پھر بھی ایک امیّد تھی کہ اگر یہ چھتری پریتی تک پہنچ جائے تو وہ بھیگنے سے بچ جائے گی۔

☆☆☆

24

موسم، بارش اور بھیگے بدن کا لمس

قارئین!

موسم یوں ہی خراب ہوتے رہے۔

بارش ہوتی رہی۔

لوگ بھیگتے رہے۔

اور بھیگے بدن کا لمس آلود پانی،سوچ کی ٹیڑھی میڑھی نالیوں سے ہوکر ڈاکٹر کپل کی زندگی کے تالاب میں جمع ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔تالاب کا پانی وہیں سڑتا رہا ۔جس کی وجہ سے پرت در پرت کائی جمنے لگی۔ جمتے جمتے جب پانی کی اُوپری سطح پر ہرے بھرے میدان آباد ہوگئے تو اُن کی زندگی اُس الگی کے پودے کی طرح ہوگئی جو ہوا کے زور اور برساتی پانی کے بہاؤ میں اپنے وجود کو بچانے کی جدوجہد کرتے ہیں ۔ایسے میں اُنہوں نے اندر کی کائی کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی ۔لیکن جتنا وہ کوشش کرتے کائی اور بھی جمتی چلی جاتی۔لیکن اِس کائی کو کم کرنے کی چاہت کبھی اُن کے اندر کم نہیں ہوئی۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی توانا ہوتی رہی۔

اب زندگی سے کائی نکال پانا اُن کے بس میں نہیں تھا۔لیکن جیسے جیسے نوکرانی کے بیٹے سے قربت بڑھتی گئی اُن کے سرد حوصلے کے اندر کی چنگاری جواں ہوتی چلی گئی۔

شوبھا جب گھر چھوڑ کر جارہی تھی تو وہ اپنے ساتھ نوکرانی کو نئے فلیٹ میں لے جانا چاہتی تھی۔لیکن نوکرانی اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیّار نہیں ہوئی۔ وہ اُس کی اوچھی حرکتوں سے واقف تھی ۔ اِس لئے گھر دور ہونے کا بہانہ بنا کر جانے سے انکار کردیا۔ شوبھا نے محنتانہ کا کھُلا آفر بھی دیا۔لیکن وہ لالچ میں نہیں پھنسی۔اور پھر وہ جانتی تھی کہ یہ کھُلا آفر اُس کے لئے نہیں ہے۔شیام سندر عرف شامو کے لئے ہے۔ جسے وہ اُس سے دور رکھنا

چاہتی تھی۔اس لئے اُسے کچھ دنوں کے لئے ماما کے یہاں بھیج دیا۔وہ سات آٹھ سال سے ماما کے یہاں رہ کر پڑھ رہا تھا۔بیچ بیچ میں وہ دو چار دن کے لئے گھر آ جایا کرتا۔کبھی کبھی وہ اپنی ماں کا بھی ہاتھ بٹایا کرتا۔گرمی اور جاڑے کی چھٹّی میں وہ ماں کے پاس رہتا۔دو چار بار وہ شوقیہ ماں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔لیکن شوبھا نے نوکرانی سے یہ کہہ کر کہ ''جب تک چھٹّی ہے یہاں دو چار گھنٹے کے لئے آ جائے۔اِس طرح وہ تمہارے کام میں ہاتھ بھی بٹائے گا اور اس کے بدلے اُسے پاکٹ خرچ بھی ملتا رہے گا۔''

لیکن وہ کب آتا تھا اور کب جاتا تھا اِس کا علم ڈاکٹر کپل کو نہیں تھا۔اور نہ ہی وہ یہ جانتے تھے کہ نوکرانی کا کوئی بیٹا بھی ہے۔یہ تو اُنہیں تب معلوم ہوا جب شوبھا اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔اُس کے جانے کے کچھ ہی دن بعد نوکرانی بیمار پڑ گئی۔اُس نے یہ سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کو کھانا بنانے میں پریشانی ہوگی اس لئے اس نے شامو کو اپنے بھائی کے یہاں سے بلا لیا۔

اُس دن پہلی بار شیام سندر عرف شامو نے گھر کی صاف صفائی کی تھی۔اِس سے قبل شوبھا اُسے اپنے کمرے کی صفائی میں لگا کر رکھتی تھی۔شروع شروع میں بڑے چاؤ سے صفائی کیا کرتا تھا۔لیکن آہستہ آہستہ بیزار رہنے لگا۔کبھی کبھی وہ ماں سے کہتا۔''مالکن کے کمرے کی صفائی تم کر دیا کرو۔''لیکن شوبھا کی اجازت کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔شوبھا سے پوچھنے کی ہمّت بھی نہیں تھی۔آج ڈاکٹر کپل کے کمرے میں وہ پہلی بار صفائی کے لئے پہنچا تھا۔

میٹرک پاس نوکرانی کے بیٹے نے جب الماری میں بے ترتیب رکھی کتابوں کو صاف کرنے کے دوران اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا تو ڈاکٹر کپل کی کائی زدہ آنکھوں میں سوالوں کے انگنت کنول کھِل گئے۔

''کیا تم پڑھنا جانتے ہو۔؟''

''جی میں آئی ایس سی کر رہا ہوں۔''

''میٹرک میں کیا پرسینٹیج تھا۔؟''

''ایٹی ون پرسینٹ۔''

''آئی ایس سی کے بعد کیا کرنا چاہتے ہو۔؟''ڈاکٹر کپل نے غور سے لڑکے کی طرف دیکھا۔

''جی میڈیکل کرنا چاہتا ہوں۔''شامو نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''کیوں کرنا چاہتے ہو ....؟''ایک ایسا سوال جو میڈیکل انٹرینس پاس کرنے کے بعد کونسلنگ کے دوران اُن سے پوچھا گیا تھا۔

''تاکہ سماج کی خدمت کر سکوں۔جن کے پاس پیسے نہ ہوں اُن کا علاج کر سکوں ۔زندگی بھگوان کی دی ہوئی حسین نعمت ہے۔اُس کی حفاظت کر سکوں۔''

شامو کی ان باتوں میں سماج کے لئے،غریبوں کے لئے جو اپنائیت کی گرماہٹ تھی اُسے ڈاکٹر کپل کی کائی زدہ آنکھوں نے محسوس کر لیا تھا۔

''بیٹا کیا نام ہے تمہارا.........؟''

''شیام سندر..........لیکن ماں مجھے پیار سے 'شامو' کہتی ہے۔''

''اگر اُتنا ہی 'پیار' میں تم سے کرنے لگوں تو کیا میں بھی تمہیں 'شامو' کہہ سکتا ہوں ....؟''ڈاکٹر کپل نے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبّت آمیز لہجے میں پوچھا۔

لڑکے کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کپل کے سوال کا کیا جواب دے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر کپل ''شامو'' کہہ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔جیسے وہ اُن کے وجود کا حصّہ ہو۔جو کسی ''رئیلیٹی شو'' کی بھول بھلیّاں میں برسوں پہلے کھو گیا تھا۔ اُس وقت اُن کی آنکھیں پوری طرح بھیگ گئی تھیں۔وہ جذباتی ہو گئے تھے۔

''بیٹا شامو! الماری صاف کرتے دیکھ کر ہی مجھے انداہ ہو گیا تھا کہ تمہیں کتابوں سے بے انتہا لگاؤ ہے.........جو بھی تم پڑھنا چاہتے ہو، لے جا سکتے ہو۔یوں سمجھو! آج سے یہ ساری کتابیں تمہاری ہو گئیں۔''

اب شام سندر عرف شامو کے روز کا یہ معمول ہو گیا تھا۔کالج جانے سے پہلے

ڈاکٹر کپل کے یہاں آجاتا۔ گھر کی صفائی کرتا۔ ناشتہ بناتا۔ برتن دھوتا........دوپہر کو ڈاکٹر کپل ڈسپنسری کے پاس ہی کسی ہوٹل میں کھا لیا کرتے۔لیکن رات میں گھر پر ہی کھانا پسند کرتے۔شامو نے ماں سے کھانا بنانا سیکھا۔ پھر رات کا کھانا بھی وہ خود بنانے لگا۔ ڈاکٹر کپل رات نو بجتے بجتے گھر لوٹ آتے تھے۔ شامو بھی کالج سے سیدھے وہاں پہنچ جاتا اور ڈاکٹر کپل کے ساتھ پڑھائی کے متعلّق رائے مشورے کیا کرتا۔

شامو نے جب نائینٹی پرسینٹ مارکس کے ساتھ انٹرمیڈیٹ پاس کیا تو خود نیٹ سے ڈاکٹر کپل نے اُس کا ریزلٹ نکالا تھا۔ اُس دن وہ بہت خوش تھے۔

''بیٹا تم نے آج مجھے ایک ایسی خوشی دی ہے جسے میں لفظوں میں چاہوں بھی تو بیان نہیں کرسکتا۔''

''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔'' شامو نے صاف دلی کا مظاہرہ کیا۔

''دیکھو! خوشی کے اِس موقعے پر میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں........ویسے تمہیں پہلے یہ بتادوں کہ میں پریتی کو ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا'' اُن کے اِس جملے میں پریتی کو ڈاکٹر نہیں بنا پانے کا غم صاف جھلک رہا تھا۔

''جی وہ مجھے معلوم ہے۔؟''

ماں اکثر اُس سے اِس طرح کی باتوں کا ذکر کیا کرتی تھی۔ اِس لئے ڈاکٹر کپل اور شوبھا کے تنازعات کی بنیادی وجہ کا علم شامو کو پہلے سے تھا۔

''تو پھر تُمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں پریتی کو کوچنگ کے لئے کوٹہ بھیجنا چاہتا تھا........؟لیکن بیٹا میں تمہیں وہاں بھیج کر خود کو اکیلا نہیں کرنا چاہتا۔ اِس لئے کوچنگ کا سارا مٹیریئل تمہیں گھر پر لاکر میں دوں گا۔ تم محنت کرو۔ باقی اُوپر والا ہے۔''

پریتی کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر کپل احساسِ تنہائی کا شکار ہوگئے تھے۔لیکن شیام سندر نے کچھ حد تک اپنی موجودگی سے اِس تنہائی کو کم کردیا تھا۔ اِس لئے ڈاکٹر کپل کہیں

بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔

''جی یہاں........؟'' شیام سندر نے جاننا چاہا۔

''ہاں! یہاں........اور اِسی گھر میں........اور اب تم رات میں بھی یہیں رہو گے۔ میرے پاس۔ میرے ساتھ........تمہیں کوئی اعتراض........؟'' ڈاکٹر کپل نے اپنے فیصلے کا عکس اُس کے چہرے پر دیکھنا چاہا۔

''جی نہیں........لیکن میں........سوچ رہا ہوں کہ........''

شیام سندر کچھ گڑبڑا گیا تھا۔ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اُسے اِس طرح سے کسی ڈاکٹر کا ساتھ ملے گا اور وہ اُن کے ہی گھر میں رہ کر تیاّری کرے گا۔

''تم آج سے اپنی 'سوچ' مجھے دے دو اور میری 'سوچ' کو تم اپنی زندگی بنالو۔بس میری یہی خواہش ہے۔ اِسے ٹھکرانا نہیں........ورنہ میرے خواب ادھورے رہ جائیں گے........'' ڈاکٹر کپل کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''آپ نے میڈیکل کا خوبصورت تحفہ جو مجھے دیا ہے اگر اُسے میں پورا نہیں کر پایا تو........؟ تو آپ کے ان خوابوں کا کیا ہوگا........؟ شیام سندر خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے تیاّر تھا، لیکن فکر مند بھی تھا کہ کہیں محنت بے اثر ہوگئی تو مُنہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا کیا ہوگا؟

''شامو بیٹے! تم خوابوں کو بند آنکھوں میں رہنے دو اور کھلی آنکھوں سے سوچ کے رنگ بھرو........بعد میں دیکھا جائے گا کہ جیت کس کی ہوتی ہے۔'' فلسفیانہ انداز میں ڈاکٹر کپل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

ریئلیٹی کی رنگین دنیا میں کُھلی اور بند آنکھوں کی یہ لڑائی منصوبہ بند طریقے سے جاری تھی۔

ڈاکٹر کپل کے ڈسپنسری جاتے ہی شیام سندر عرف شامو تیاّری میں جُٹ جاتا اور لوٹنے تک مصروف رہتا۔ اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لاتے۔ چائے کا لُطف ساتھ

ساتھ اُٹھاتے۔ رات کا کھانا بناتے وقت ڈاکٹر کپل اُس کے ساتھ کچن میں ہوتے۔ اِدھر کھانا بنتا اور اُدھر پڑھائی چلتی رہتی۔ بستر پر جاتے جاتے ڈاکٹر کپل اُسے کبھی جنرل نالج کے کیپسول کھلاتے تو کبھی وٹامن کے انجیکشن لگاتے۔ اور کبھی بات ہی بات میں تجربے کا سیرپ پلا دیتے........اُس وقت اُنہیں ایسا لگتا جیسے رئیلیٹی کے زخموں پر سکون کے مرہم لگا رہے ہوں۔

لیکن جب اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے پٹّی ڈھیلی پڑنے لگتی تو زخم ٹیس بن کر اُن کی یادوں کو تازہ کر دیتا۔ ایسے میں پریتی یا شوبھا کو بھول پانا مشکل ہو جاتا۔ کیوں کہ ہمیشہ نظروں کے سامنے وہی گھر، وہی دیواریں، وہی دروازے، وہی کھڑکیاں، وہی گیٹ وہی لان گھومتے رہتے ....ویسے بیوی کی یادوں کو مندمل کرنے کے لئے اُنہوں نے گھر کی دیواروں پر نئے رنگ و روغن کا لیپ چڑھا دیا تھا۔ پردوں کو بدل دیا تھا۔ کرسی ٹیبل صوفے اور الماریوں کی جگہ بھی بدلی گئی تھی۔ جن چیزوں کے ساتھ شوبھا کا سیدھا رِشتہ تھا اُسے اِسٹور روم کی نذر کر دیا گیا تھا........لیکن اِس کے باوجود وہ خود کو نہیں بدل سکے۔ بیوی کو نہیں بھول سکے۔

رئیلیٹی شو کی آمد نے جب سے ہندوستانی چینلوں کو متاثر کرنا شروع کیا تب سے ڈاکٹر کپل اِسے ایک بیماری کی طرح دیکھ رہے تھے جو راتوں رات گھر کا گھر تباہ کر سکتی تھی۔ اُنہوں نے 'رئیلیٹی شوز' جیسے خوبصورت لفظ کی گہرائی میں اُتر کر اُس کے معنیٰ و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آخر اِس نتیجے پر پہنچے کہ 'رئیلیٹی' کے نام پر جو کچھ دکھایا جا رہا ہے اُس میں 'رئیلیٹی' کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جو 'رئیلیٹی' ہے اُسے دکھانے کی ہمّت چینل والوں میں نہیں ہے۔

سیاست کے رئیلیٹی شوز میں امریکہ نے دہشت گردی کا جو منچ استعمال کیا اور جس طرح کی دادا گری اُس نے ویت نام، عراق اور فلسطین پر کی ہے۔ کیا آج ویسی ہی غنڈہ گردی یورینیم کی آبزودکاری کو لے کر ایران کے ساتھ نہیں ہو رہی ہے۔ اِس رئیلیٹی کو

دنیا کا کوئی چینل ایمان داری سے دکھانے کے لئے تیّار کیوں نہیں ہے.........؟ امن کے نام پر دنیا میں جس نے سب سے زیادہ دہشت پھیلا رکھی ہے اُس ملک کو تمام چینل والے دنیا کا امن پرست ملک بتانے میں شرمندگی کیوں نہیں محسوس کرتے؟

کیا آپ کو حیرت نہیں ہوتی؟

کیا سبھی ڈر سے اُس کی پیروی کرتے ہیں؟

جہاں ہر کسی کے خون میں شراب اور شباب کے پلیٹلیٹس موجود ہیں۔

جہاں رئیلیٹی کے منچ پر سب سے زیادہ ریپ ہوتے ہیں۔

جہاں سب سے زیادہ ٹین ایجر لڑکیاں پرگنینٹ ہوتی ہیں۔

جہاں سب سے زیادہ ابارشن کرائے جاتے ہیں۔

جہاں اسکولوں اور کالجوں میں سیکس ایجوکیشن کے نام پر موڈرنیٹی کے کنڈوم بانٹ کر بیٹیوں کے محفوظ ہونے کا ڈنکا پیٹتے ہیں۔

جہاں کے کلچر میں پورنوگرافی کو قبولیت کا درجہ حاصل ہے۔

اُسی کلچر کے پروردہ ''رئیلیٹی شو' کے نام پر ہماری گنگا جمنی تہذیب میں پلی بڑھی عورتوں کو آج عظمت اور برابری کا سبق سکھا رہے ہیں۔

☆

رئیلیٹی اور رئیلیٹی سے متعلّق جب اِس طرح کی گفتگو ڈاکٹر کپل اور شیام سندر کے درمیان ہو رہی تھی تو اُن کا دوست ڈاکٹر حامد عالم اُن کی تنہائی بانٹنے آ پہنچے۔ اکثر اتوار کے دن وہ یہاں آ جایا کرتے یا پھر ڈاکٹر کپل کو اپنے یہاں بلا لیا کرتے۔ کبھی لنچ تو کبھی ڈنر ساتھ ساتھ لیتے۔

اُن کے پہنچتے پہنچتے رئیلیٹی کی اِس جنگ میں ایک نیا موڑ آ گیا تھا۔

''سب ڈرتے ہیں سالے اِس سیاسی رئیلیٹی کو دکھانے سے۔'' ڈاکٹر کپل کی آواز میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو ڈاکٹر کپل ! ساری دنیا اِس سچ کو جانتی ہے ۔لیکن دنیا کا ہر چینل ڈرتا ہے ڈراگون کے حملے سے ۔ رپورٹر تک کو غائب کر دیا جاتا ہے ۔ بیوی بچّوں کو دہشت گرد کی فہرست میں ڈال دیا جاتا ہے ۔‘‘ ڈاکٹر حامد عالم نے یہ کہتے ہوئے بین الاقوامی سطح کی سیاسی ریئلیٹی سے پردہ اُٹھا دیا۔

’’حامد ! رپورٹر بھی ہماری تُمہاری طرح ہی ہوتے ہیں ۔ ایک ریئلیٹی کو سامنے لانے کے لئے اپنے ساتھ بیوی بچّوں کو داؤں پر کیوں لگائے گا ؟ ۔‘‘

گفتگو کے اِس موڑ تک آتے آتے ڈاکٹر کپل کی سوچ میں کچھ بدلاؤ سا آ گیا تھا، جیسے گرمی میں یکا یک تیز بارش ہو جائے اور موسم کے مزاج میں یکا یک خوشگواریت گھُل جائے ....لیکن پھر اُن کی حالت اُس رپورٹر جیسی ہو گئی جو چاہ کر بھی شوبھا کی ریئلیٹی شو کا کچّا چِٹّھا سامنے نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کے سر پر ایم ایل اے اور منتری کے ڈراگون کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔

☆☆☆

25

سوشل نیٹورکنگ چینل اور ٹی آر پی کی جنگ

قارئین !

یہ ریئلیٹی شو کیا ہے........؟

ریئلیٹی شو کی ضرورت کیوں پڑی........؟

کیا آج سے پہلے جو کچھ ہو رہا تھا وہ ریئلیٹی نہیں تھا.........؟

اگر وہ ریئلیٹی تھا تو پھر یہ کیا ہے.........؟

اور یہ ریئلیٹی ہے تو پھر کسی ڈھونگ کی ضرورت کیا ہے.........؟

ضرورت ہو یا نہ ہو، لیکن آج یہ سوچنے کا مقام ہے کہ جو ریئلیٹی ہے کیا وہی ریئل میں ریئلیٹی ہے........؟

باتیں فضاؤں میں گردش کرنے لگیں ۔

گردش کے نتیجے میں کائنات کی از سرِ نو تشکیل ہوئی۔

اور از سرِ نو تشکیل کے بعد کائنات کی گردش میں ایک طرف جہاں ڈاکٹر کپل کی زندگی کا ستارا آیا وہیں ’’پاپولر چینل‘‘ نے اپنے خاص پروگرام ’’انڈر سکسٹین سپر ڈانسنگ چمپین شپ‘‘ کے لئے رات نو سے دس بجے کا وقت مقرّر کر کے اِس پروگرام کو اولیّت بخشی ۔ یہ وہ وقت ہے جب ناظرین اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ٹی وی کے سامنے وقت گذاری کرتے ہیں ۔جس پروگرام کو ناظرین زیادہ پسند کرتے ہیں ۔اُس کی اہمیّت لِسٹنگ کے بعد خود بخود بڑھ جاتی ہے ۔ اِس پروگرام کو TRP (ٹیلی ویژن ریٹنگ پوائنٹ)اور INTAM (انڈین ٹیلی ویژن آڈینس میزرمنٹ) کے مطابق نمبر ون کی پوزیشن بھی حاصل تھی ۔ جب کہ دوسرے چینلس تہذیب وتمدُّن پر بنائی گئی سیریلس دکھا رہے تھے ۔لیکن وہاں اِن چینلوں کو نہ اشتہار مل رہا تھا اور نہ ہی ناظرین.........ایسے میں ٹی آر پی اور اِنٹم کی

دوڑ میں وہ سارے چینل پیچھے دکھائی دے رہے تھے۔جس کی وجہ سے آنے والے دنوں میں اِن چینلوں کا کیا ہوگا ؟ یہ ان کے مالک سوچ رہے تھے۔اور یہ بھی سوچ رہے تھے کہ TRP کی اِس دوڑ میں اگر ابھی ریئلیٹی شوز سے نہیں جڑیں گے، تو انہیں INTAM کا سہارا نہیں مل سکتا۔اور جب تک اُنہیں اس کا سہارا نہیں ملے گا تب تک کروڑوں کا نقصان ہوتا رہے گا۔

اِس لئے ایک دن مشہور ''سوشل نیٹ ورکنگ چینل'' نے اپنے ایکزیکیوٹیو باڈی کی میٹنگ طلب کی تاکہ آج کے سیناریو میں اپنے نقصان کو کم کر سکیں۔اپنے ٹی آر پی میں اضافہ کر سکیں۔جب سبھی ممبران آ گئے تو چینل کے مالک نے اپنا منشاء ظاہر کیا۔

''کیا آپ لوگوں کو ایسا نہیں لگتا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے چینل کو پروموٹ کرنے کے لئے کچھ ایسا کریں کہ ہمارا ٹی آر پی بڑھ جائے اور نقصان فائدے میں بدل جائے۔''

''سر آپ نے تو ہم لوگوں کے دل کی بات چھین لی۔'' منیجنگ ڈائریکٹر نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے اُنہیں یقین دلایا۔''ہم سب جُڑے تو اِس چینل سے ہیں لیکن ہمارے گھروں میں بھی وہی چینل دیکھے جاتے ہیں جس میں مصالحہ زیادہ ہوتا ہے۔

''اور آپ تو جانتے ہی ہیں سر کہ آج کل مصالحہ کس میں ہے۔؟'' پروگرامنگ کو آرڈی نیٹر نے کچھ اِس طرح سے کہا جیسے سب کچھ اُن کے علم ہے۔

''ہاں سر یہ زمانہ ہی ریئلیٹی شو کا ہے۔'' پروگرامنگ ڈیزائنر نے یہ بات یقین سے کہی تو سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اور ریئلیٹی شو کے اِس زمانے میں ہم اُنہیں کیا دکھا رہے ہے۔سوشل ویلوز پر آدھارت سیریلس۔سر آج کل یہ سب اوڈینس کو نہیں چاہئے۔'' پروگرامنگ براڈ کاسٹر نے ناظرین کی پسند اور ناپسند پر اپنی کھُل کر رائے پیش کر دی۔

''ہاں سر! آج کل اوڈینس کا نظریہ ہی بدل گیا ہے۔'' ایڈوائزنگ منیجر نے اپنے

تجربے کی بنیاد پر کہا۔

''ہاں تم سب صحیح کہتے ہو۔'' سوشل نیٹ ورکنگ چینل کے مالک خان پرتمی نے سب کی باتوں پر صداقت کی مہر لگاتے ہوئے کہا۔''میں نے بھی اپنے گھروں میں محسوس کیا ہے کہ لوگ کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔کلاسیکل تو آج کل کچھ رہا ہی نہیں ......لوگوں کو تو صرف ناچ گانا اور وہ بھی ڈِسکو چاہئے۔میوزک اِس طرح بجتا ہے جیسے سب بہرے ہو گئے ہوں۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں!'' ایکسکیوٹیو باڈی میں شامل کلاسکل اسٹار پرمود ڈیسائی نے کہا۔''آج کے ناظرین بہرے ہی نہیں اندھے بھی ہیں۔کیا دیکھنا ہے اور کیا نہیں، یہ اُن کے بس میں ہی نہیں ہے۔تو پھر وہ مستقبل کے لئے اچھا اور بُرا کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں.........؟''

دیکھئے ڈیسائی صاحب! یہ فیصلہ تو وقت کرے گا۔اِس وقت چنوتی ہمارے سامنے یہ ہے کہ چینل کا اسٹیٹس 'سوشل' ہے۔اس لئے ہم آج کے بہترین رائٹروں سے اِسکرپٹ لکھوائیں اور خوبصورتی سے پکچرائز کریں۔بالکل نئے ڈھنگ سے۔ایک الگ انداز سے۔ پھر دیکھئے اوڈینس کیسے پسند کرتے ہیں۔''

''سر آپ بہترین سیریل رائٹر کس کو سمجھتے ہیں ؟'' منیجنگ ڈائریکٹر نے اپنی جانکاری کے لئے پوچھا۔

''سریش ملکانی، پیار جاودانی، اندرا رانی، عظیم ربّانی وغیرہ وغیرہ..........'' مشہور رائٹروں میں سے جو نام ذہن میں آئے اُنہوں نے گنوا دئے۔

'' سر ہم نے پچھلے سال اِن ہی ٹاپ رائٹروں سے اسکرپٹس لکھوائے ہیں ۔'' پروڈیوسر نے اُنہیں یاددہانی کروانے کے انداز میں کہا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ پیسہ جو بھی لگے۔ٹی وی کے اُن جانے مانے آرٹسٹوں کو اپنے پروگرام میں سائن کرو جن کی دھوم رہی ہے۔'' پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اُنہوں

نے آرٹسٹوں کے انتخاب کو ایک کڑی کے طور پر دیکھا۔

"سر ٹی وی جگت کے جتنے مشہور کلاکار ہیں وہ سب کے سب تو اِس وقت ہمارے لئے ہی کام کر رہے ہیں۔" پروگرامنگ کوآرڈینیٹر نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا اچھا.........تو پھر ہم پاپولرٹی میں پچھڑ کیوں رہے ہیں۔اشتہارات ہمیں کم کیوں مل رہے ہیں۔؟" اُنہوں نے ایڈورٹائزنگ منیجر سے پوچھا۔

"سر اِس کی ایک ہی وجہ ہے۔اور وہ وجہ ہے رئیلیٹی شو.........جس نے نئی نسل کو دیوانہ بنا دیا ہے۔جس چینل نے مغرب کی نقالی میں رئیلیٹی شو کو فروغ دیا، وہاں نہ اچھے رائٹر ہیں اور نہ ہی کلاکار.........پھر بھی اُن کا ٹی آر پی ہمارے چینل سے کئی گُنا زیادہ ہے۔اس لئے کارپوریٹ گھرانے اِشتہار دینے سے پہلے سو بار سوچتے ہیں کہ کس چینل کے ناظرین زیادہ ہیں۔" رئیلیٹی کی دنیا سے اشتہار بازار تک نظر رکھنے والے ایڈورٹائزنگ منیجر نے حیرت کا ملا جُلا اظہار کچھ ان لفظوں میں کیا۔

"لیکن رئیلیٹی شو کے نام پر آج کیا ہو رہا ہے۔وہی ناچ گانا، وہی ڈانس، وہی پھوہڑ ہنسی......... اِس سے تو ہمارے بچّوں پر خراب اثر پڑے گا۔اور مستقبل تاریکی میں ڈوب جائے گا۔"

"لیکن ایک دن چینل بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور ساتھ میں ہماری روزی روٹی بھی۔اس لئے کچھ سوچئے سر! ورنہ.........؟" بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ایک نے اُمیّد بھری نظروں خان پریمی کی طرف دیکھا۔

" میرا چینل بند ہوتا ہے تو بند ہو جائے۔لیکن میں بچّوں کے فیوچر کے ساتھ کھلواڑ نہیں کر سکتا۔آپ کہیں اور جانا چاہیں تو خوشی سے جا سکتے ہیں۔" خان پریمی کے دو ٹوک جواب سے کئی اسٹاف کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"سر اگر چینل بند ہوتا ہے تو اِتنے سارے اسٹاف کا کیا ہوگا.........؟" نوکری چھوٹ جانے کا خوف ایک کی آنکھوں میں صاف نظر آ رہا تھا۔

"اگر چینل بند ہوا تو میں اپنی پراپرٹی بیچ کر تم لوگوں کا پیمنٹ کروں گا۔لیکن رئیلیٹی کے نام پر ٹین ایجر سیکس کی دُکان چلا کر کروڑوں کی کمائی نہیں کر سکتا۔"

چینل کے مالک خان پریمی نے انکار کر کے سب کی اُمیّدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔امّید تھی کہ میٹنگ میں جب نقصان سے باہر نکلنے کے لئے اندھیرے میں اُنہیں "رئیلیٹی کی روشن راہ" دکھائی دے گی، تب وہ تیزی سے اُس راستے پر آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے روپئے اِکٹّھا کرنے لگیں گے۔

"سوشل نیٹ ورکنگ چینل" کسی طرح چل رہا تھا۔یا یہ کہیں کہ خان پریمی کسی طرح چلا رہے تھے۔لیکن اِس جنون نے اُنہیں کروڑوں کی دلدل میں دھنسا دیا تھا۔بہت کوشش کے بعد بھی اُس دلدل تک سانس کی نلی نہیں پہنچ سکی اور ایک دن ہاٹ اٹیک سے اُن کی موت ہو گئی۔

موت کے بعد اُن کا اکلوتا بیٹا عاشق خان انگلینڈ سے ماس میڈیا میں پی جی کر رہا، وطن لوٹا اور "سوشل نیٹ ورکنگ چینل" کا چارج سنبھال لیا۔پہلی پریس کانفرنس میں میڈیا والوں نے حالاتِ حاضرہ کے مدِّ نظر گُفتگو کی۔

"آپ کے پتا نے اپنی سوشل ایکٹی ویٹی کی وجہ سے اپنے چینل کا اسٹیٹس نامساعد حالات میں بھی بدلنے سے انکار کر دیا تھا، جس کا نقصان صرف آپ کے پاپا کو ہی نہیں چینل سے جڑے تمام لوگوں کو ہوا.........اب آپ جب چارج سنبھال چکے ہیں تو ظاہر سی بات ہے کہ آپ کا تعلق نئی نسل سے ہے، تو سوچ بھی کچھ نئی ہوگی.........تو ایسے میں کیا چینل کا اسٹیٹس آپ بدلنا چاہیں گے.........؟" ایک رپورٹر نے یہ سوال پوچھ کر اُس کی سوچ کی رفتار کو جاننے کی کوشش کی۔

تیزی سے اپنی سوچ پر بریک لگاتے ہوئے مُسکرا کر اُس نے جواب دیا۔"جی ہاں........."

"اس کی کوئی خاص وجہ.........؟" ایک دوسرے رپورٹر نے پوچھا۔

''مارکیٹنگ۔'' مسکراہٹ میں ٹی آر پی کا گراف صاف نیچے سے اُوپر اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

''مارکیٹنگ سے مطلب........'' خاتون صحافی نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اُس کی زبان سے سننا چاہا۔

''میرا مطلب ہے کہ مارکیٹ میں وہی پروڈکٹ سب سے زیادہ بکتا ہے جو لیٹیسٹ ہوتا ہے۔ آج کے ٹی وی مارکیٹ میں 'ریئلیٹی شو' سے بڑا کوئی پروڈکٹ نہیں ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے چینل کا اسٹیٹس 'سوشل' سے بدل کر 'ٹین ایج انٹرٹینمینٹ' کر دیا جائے۔ جو آج کی ضرورت بھی ہے اور ہمارے اسٹاف کی خواہش بھی۔'' وقت کے پیشِ نظر اُس نے مارکیٹ، پروڈکٹ اور ٹین ایجر کو ایک لائن میں رکھ کر سوچ کی نئی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی۔

عرضی داخل کی گئی۔

بلینک چیک کا نذرانہ پیش کیا گیا۔

پھر کیا تھا: راتوں رات ''سوشل نیٹ ورکنگ چینل'' کا اسٹیٹس بدل کر ''ٹین ایج انٹرٹینمینٹ چینل'' ہوگیا۔ نئے نام کا آفسیل اعلان ہوتے ہی اِسٹاف کے چہرے پرخوشیوں کی لہر دوڑ گئی کہ اب اُن کے یہاں بھی 'وہ' دکھایا جائے گا، جس کا آج سب سے زیادہ ڈیمانڈ ہے۔ جسے گھر گھر دیکھا رہا ہے۔ اُس سے اُن کی بھی عزّت بڑھ جائے گی۔

اِس طرح سے ''سوشل نیٹ ورکنگ چینل'' جس نے تین دہائی تک لاکھوں کروڑوں ناظرین کے دلوں پر راز کیا تھا۔ اُس کے سنہرے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ نئے چینل کے اِستقبال میں جو پارٹی دی گئی۔ اُس کے شور وغُل میں ''سوشل نیٹ ورکنگ چینل'' کی سنہری تاریخ رقم کرنے والے، تہذیب وتمدُّن کے پروردہ خان پریمی کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے متعلّق کچھ کہنے کا وقت آیا تو ڈاکٹر کپل اور اُن کی طرح کی ذہنیت رکھنے والے کھڑے ہوئے۔ لیکن اُن کی باتیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ سب کے سب انجوائے کرنے

کے موڈ میں تھے۔ اس طرح خراجِ عقیدت جیسے خوبصورت بول نئی نسل کے شور وغُل میں دب کر رہ گیا۔

اب ایک بھی چینل ایسا نہیں تھا جسے ''سوشل'' کہا جا سکے۔ ایک دوسرکاری چینلس نے پالیسی کی وجہ سے 'سوشل اسٹیٹس' کو برقرار رکھا، لیکن اُس کی حیثیت بھی نئی نسل کے لئے ویسی ہی تھی جیسے اُس کا ہونا نہ ہونا کوئی مطلب نہ ہو۔ پُرانی نسل میں کچھ ہی لوگ ایسے تھے جنہیں اپنی تہذیب اور شناخت کی فکر تھی۔ بس اُنہیں کبھی کبھار ہی دیکھنے کا موقع ملتا۔ وہ بھی دوسروں کے رحم وکرم پر منحصر ہوتے۔ ان کے علاوہ سب وہی دیکھتے۔ اور جب سب 'ریئلیٹی شو' دیکھ رہے ہوتے تو گھر بھر میں ٹی وی کا شور اپنے شباب پر ہوتا۔

☆☆☆

26

ریئلیٹی کا تڑکا، ناظرین اور سیکس کی دکان

قارئین!

ڈاکٹر کپل ٹی وی کے شوقین نہیں تھے۔

بچپن سے ہی اُن کا ذہن پڑھنے کی طرف تھا۔ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد جب کبھی موقع ملتا تو وہ نیوز دیکھنے لگتے یا پھر کرکٹ میچ۔ سیریلس میں اُنہیں دلچسپی نہیں تھی۔لیکن اِدھر شوبھا کچھ اور بھی اِنٹریسٹ اُن کے اندر پیدا کرنا چاہتی تھی.........رات یہی کوئی نو بجے ڈاکٹر کپل گھر لوٹتے تھے۔ ہاتھ منہ دھوتے۔ چائے پیتے۔ آدھا ایک گھنٹہ نیوز دیکھتے۔ پریتی کے ساتھ کھیل کود کے بعد ساڑھے دس بجے تک کھانا کھاتے۔ پھر کہیں گیارہ سوا گیارہ بجتے بجتے وہ خود کو بستر کے حوالے کرتے تھے........چائے اور سونے کا وقت تو اُن کا اب بھی وہی تھا،لیکن نیوز دیکھنے کا وقت بدل گیا تھا۔ اب وہ نیوز کھانا کھانے کے بعد دیکھتے تھے، یا یہ کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ شوبھا اُسے اپنے ساتھ پہلے 'ریئلیٹی شو' دیکھنے پر مجبور کرتی تھی اور ڈائننگ روم کی جگہ ساڑھے دس بجے ڈرائنگ روم میں ہی اُن کے کھانے کا انتظام کردیتی تھی۔

''اب نیوز ویوز جو دیکھنا ہے دیکھئے۔''

''ریئلیٹی شوز'' میں پہلے سماجی اقدار پر بھی زور دیا جاتا تھا اور اُس وقت بچّوں کی شمولیت اِس طرح نہیں ہوتی تھی۔ اُس کی پڑھائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اِس لئے اُس وقت ڈاکٹر کپل کچھ حد تک شوبھا کے پہلو میں سر رکھ کر ''ریئلیٹی شوز'' کا مزا اُٹھا لیتے تھے۔لیکن سال دو سال گذرتے ہی ٹی وی کی دنیا میں ریئلیٹی کے معنیٰ بدل گئے۔ پروگرام کی نوعیت کچھ بھی ہو۔لیکن ریئلیٹی کا تڑکا ضروری ہوگیا تھا۔ ہر پروگرام کو ریئلیٹی کے فارمیٹ میں فٹ کر کے دیکھنے کے اِس نظریے نے اِنٹرٹینمنٹ کی دنیا میں 'ریئلیٹی' کو ایک نئے معنیٰ

سے ہمکنار کردیا۔ جس کی وجہ سے ناظرین کی تعداد میں بھی روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ ناظرین کی ایسی فہرست میں ڈاکٹر کپل کا نام آہستہ آہستہ شامل ہونے لگا تھا۔

لیکن جیسے ہی تمام چینلس پر بچّے ناچتے گاتے ڈانس کرتے، ہنستے ہنساتے، اور سیکس کی زبان میں ذو معنیٰ الفاظ ادا کرتے دکھائی دینے لگے، ویسے ویسے اُنہیں اِس بات کا احساس ہونے لگا کہ جس 'ریئلیٹی شو' کو ہم آج اپنی زندگی کا جُز بنا رہے ہیں، بستر پر جانے سے پہلے وٹامن کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔کل وہی ہماری آنکھوں سے نیندیں اُڑا دے گا۔

اور ایسا ہوا بھی:

اور ایسا بھی ہوا کہ جب ڈاکٹر کپل کو چھوڑ کر شوبھا چلی گئی تو اُنہیں اِس طرح کے 'شو' سے نفرت سی ہوگئی اور یہی نفرت جب حد سے تجاوز کر گئی تو ایک دن، محبّت میں بدل کر 'شو' دیکھنے ٹی وی کے سامنے آگئی۔ مقصد 'شو' دیکھنا نہیں تھا بلکہ اِس بہانے وہ اسکرین پر پریتی کو دیکھنا چاہتے تھے۔

شو کا پہلا دن.........

ڈاکٹر کپل کے اندر پریتی کو دیکھنے کی بے چینی تھی۔لیکن اِس بے چینی کو وہ کسی پر آشکار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ شیام سندر پر بھی نہیں۔اس لئے ماں سے ملنے کے بہانے اُسے گھر بھیج دیا تھا۔تا کہ تنہائی میں وہ بیٹی سے مل سکیں۔اُس کے ساتھ باتیں کر سکیں۔اُس کے آنسو پونچھ سکے۔اُسے مٹھائیاں کھلا سکیں۔اُسے کندھے پر گھُما سکیں۔

اِس پروگرام کو دیکھنے کا اُن پر اِتنا دباؤ تھا کہ وہ دن بھر گھر سے نہیں نکلے۔صبح گھر جانے سے پہلے شیام سندر کے منع کرنے پر بھی دن کا کھانا بنا دیا تھا____ رات کے لئے اُنہیں بس سامنے کی دکان تک جانا پڑا۔ بسکٹ، بریڈ اور کیک خریدا تا کہ پروگرام کے بعد جب بھوک لگے تو دودھ کے ساتھ کھا سکیں........وہ اُس دن کلینک بھی نہیں گئے۔نرس رینو کا داس کو ہٹانے کے بعد اُنہوں نے کسی کو بھی نہیں رکھا تھا۔سارا کام وہ خود کرتے تھے۔

اس لئے بغل والے دکان دار کو فون کر کے بتا دیا کہ کوئی مریض آئے تو کہہ دیجئے گا کہ ڈاکٹر صاحب آؤٹ آف اسٹیشن ہیں۔

شو کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

اُن کے ہاتھ میں پریتی کی تصویر اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ بہُت مشکل سے اُنھوں نے خود کو سنبھالا۔ آنسوؤں کو پوچھا۔ بیڈ سے اُٹھے۔ ٹی وی آن کیا۔ ریموٹ سے مطلوبہ چینل سرچ کیا۔ تو یہ دیکھ کر بھیگی آنکھوں کے کنارے خوشیوں سے جھلملانے لگے کہ اب کچھ ہی دیر میں شو آنے والا ہے جسے دیکھنے کے لئے وہ صبح سے بیتاب ہیں۔

سیکس کو بڑھانے والی دوائیوں کا اشتہار ختم ہوتے ہی اسکرین پر ایک بار پھر پروگرام کا ٹائٹل ''انڈر سکسٹین سُپر ڈانسنگ چمپین شپ'' جگمگانے لگا اور اس کے فوراً بعد روشنی میں نہایا سیٹ آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے روشنی میں شرابور ایک حسینہ نیم عریاں لباس میں بن ٹھن کر جوان اداؤں کے ساتھ ناظرین کے سامنے حاضر ہوئی اور مسکراتے ہوئے اپنی آواز کا جادو بکھیرنے لگی۔

کچھ دیر تک ڈاکٹر کپل آواز کے سحر میں خود کو ڈوبا ہوا محسوس کرتے رہے۔ باریک کپڑوں سے جھانکتا سنہرا جسم باہر آنے کے لئے بے تاب دکھائی دے رہا تھا۔ سلیولیس ٹاپ اور میڈی کے باعث ننگے بازو اور روئیں سے بے نیاز ننگی ٹانگیں اور گلے سے باہر پھڑ پھڑانے کے لئے بیتاب کبوتروں کا سفید جوڑا بھی اُنھیں متوجہ کرنے میں ناکام رہا۔

وہ اپنی اداؤں کے لٹکے جھٹکے جب دِکھا چکی تو مرکز پر موجود سرخ رنگ کے دائرے کے بیچوں بیچ آ کر کھڑی ہوگئی۔ روشنی کا ایک جھما کا ہوا اور ٹائٹل سانگ بجنا شروع ہوگیا۔

جیسے ہی میوزک کی آواز دھیمی پڑی۔ نازک اندام الہڑ حسینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'' پنکھڑی کی طرف سے ''انڈر سکسٹین سُپر ڈانسنگ چیمپین شپ'' کے تمام ناظرین کو پیار بھرا سلام......''

''ناظرین! یہ آپ کی محبت ہے کہ آج قریب دس سالوں سے ہمارا یہ شو نمبر ون کی پوزیشن پر قابض ہے۔ اور اُمیّد ہے کہ آنے دنوں میں بھی ہم سب سے آگے ہوں گے۔ بس آپ کا سہوگ اِسی طرح بنا رہے تو بہتر سے بہتر پروگرام آپ کے لئے ہم لاتے رہیں گے۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ..........

ڈاکٹر کپل کو پروگرام شروع ہونے کا انتظار.........

اور اِس انتظار کے بیچ اینکرنگ کرنے والی حسینہ پنکھڑی کی دلکش آواز گونجتی رہی۔

''تو آیئے! سب سے پہلے میں آج کے راک اسٹار سلیم انور سے ملواتی ہوں، جس نے اپنے ڈانسنگ اِسٹائل سے پورے ملک میں دھاک جما رکھی ہے۔''

ڈاکٹر کپل نے اُس لڑکے کے ڈانسنگ ڈریس اور اس کے ڈانس کو دیکھا تو اُنھیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بریک ڈانس کیا ہے.........؟ اور اگر یہ واقعی ڈانس ہے تو پھر اِس میں بریک کیوں........؟ اُن کی سوچ سے تو ایسا ہی لگتا تھا کہ انہیں ڈانس کے بارے میں جانکاری کم ہے، ورنہ وہ ڈانس کے اس نئے فن سے ضرور آگاہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں ذرا بھی مزا نہیں آرہا تھا۔ وہ کچھ دیر چینل بدل کر نیوز دیکھنے لگے۔ پھر پری چینل والا بٹن دبا کر دوبارہ ڈانس کی دنیا میں لوٹ آئے۔

اب اُن کی بیٹی کی عمر کی ایک لڑکی نہایت ہی فحش گانے پر ڈانس کر رہی تھی۔ اُس کے کپڑے بھی ایسے تھے کہ اُس نے کیا پہنا ہے اور کیا نہیں۔ سمجھنا مشکل تھا.........اُس وقت بھی وہ نیوز چینل کی چھاؤں میں جا کر کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔

ایک بے چینی سی اِن کے اندر تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ حالاں کہ کیمرہ ایک دو بار اُس طرف گیا بھی۔ لیکن یہ اُن کی بد قسمتی تھی کہ اُس وقت وہ نیوز کی گود میں تھے۔ چینل بار بار بدلنے کے بعد بھی اُن کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ کہ دل تو پریتی میں اٹکا ہوا تھا۔ کیسی لگتی ہوگی........؟ کتنی بڑی ہوئی ہوگی........؟

کئی سالوں سے ڈاکٹر کپل نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔اِس لئے اُن کی آنکھیں بے چین تھیں۔پروگرام ختم ہونے کا وقت قریب آرہا تھا۔اِس لئے اُن کی بے چین آنکھیں بار بار آنکھوں کی کٹوری سے نکل کر ٹی وی اسکرین سے چپک رہی تھیں۔بیٹی کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

نیم عریاں لباس میں ناظرین پر قیامت ڈھانے والی اینکر پنکھڑی ایک بار پھر اپنی ٹانگوں کی نمائش کرنے سرخ دائرے میں موجود تھی۔اُس کی آنکھوں کی چمکیلی گولیاں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ناظرین کے چہرے کو پڑھ رہی تھیں۔امتحان لے رہی تھیں۔امتحان کی اِس گھڑی میں ہر کوئی فیل ہونے کے لئے تیّار تھا۔اس لئے ہر کوئی ''پریتی .... پریتی'' چلاّ رہا تھا۔پنکھڑی بھی خود کو روک نہیں پائی۔عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگی۔مائک کو ہونٹوں سے چومنے لگی۔

''ناظرین! یوں تو آپ لوگوں کو لگ رہا ہوگا کہ میں مائک چوم رہی ہوں۔لیکن دراصل میں اِس نو خیز ڈانسنگ کوئین کو چوم رہی ہوں جس نے ڈانس کی دنیا میں اپنے پرفارمینس سے آگ لگا دی ہے۔لاکھوں دیوانے اُس کے ابھی سے پیدا ہو گئے ہیں۔تو لیجئے! اب منچ پر آرہی ہیں سب کی چہیتی سیکس سمبل ڈانسنگ کوئن پریتی سنگھ.......اُن کی اداؤں کو دیکھئے اور زندگی کا بھرپور لُطف اُٹھائیے۔''

پنکھڑی کی باتوں سے ڈاکٹر کپل کے دل میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔لیکن یہ 'آگ' وہ 'آگ' نہیں جس کا ذکر پنکھڑی کر رہی تھی بلکہ نفرت کی یہ آگ اُس پنکھڑی کے لئے تھی جس نے پریتی کو سیکس سمبل کہہ کر لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کی تھی۔

تالیوں کے شور کے ساتھ منچ پر رنگ برنگی روشنیوں کا جال سا پھیل گیا۔جلتے بجھتے رنگین قمقمے کی سانسیں رُکتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔پھر یکایک جھماکے کے ساتھ روشنی کا کھیل شروع کیا۔چھم چھم کرتی ہوئی پریتی سرخ دائرے کا چکّر کے بعد کیمرے کی طرف پشت کر کے ڈانسنگ پوز میں کھڑی ہوگئی۔سر سے پیر تک ٹرانسپرنٹ گولڈن ڈوپٹے میں وہ

خود کو ڈھکی ہوئی تھی۔میوزک کے ساتھ ہی وہ دوپٹہ ایک طرف پھینک کر کیمرے کی طرف مڑتی ہے۔ڈاکٹر کپل جو بہت دیر سے اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔وہ مبہوت رہ جاتے ہیں۔اُنہیں آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جس بیٹی سے قریب تین سال قبل ملے تھے وہ ٹائٹ فیٹنگ بلاؤز اور اسکرٹ میں منچ تک آتے آتے اتنی بڑی ہوگئی ہوگی ....؟ اسکرٹ ناف کے نیچے کولہے پر پھنسا ہوا تھا۔اور نیچے کا گھیرا ٹخنے سے بہت اُوپر تھا۔بہ مشکل اُس کی لمبائی سات آٹھ اِنچ سے زیادہ نہیں تھی۔اور اُس کا گھیرا اتنا تھا کہ جب بھی وہ راؤنڈ راؤنڈ گھومتی اسکرٹ جانگھوں سے اُوپر اُٹھ جاتا اور اُس کا نچلا سرا کمر کے بیچوں بیچ ایک دائرہ بناتا ہوا اپنے محور کے چاروں طرف گھومتا رہتا۔اُس وقت سب سے زیادہ تالی بجتی........اور سیٹی تب بجنا شروع ہوتی۔جب مکمّل دائرہ بناتے وقت منی اسکرٹ کے نیچے سے جھانکتی پینٹی جسے دیکھنے کا حق کسی بھی حال میں یہاں موجود لوگوں کو نہیں تھا، لیکن ٹکٹ خرید کر دیکھنے کے حق دار ہو گئے تھے۔

اُس وقت ڈاکٹر کپل نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔لیکن کونپل کی طرح پھوٹتی خواہشات نے اُنہیں آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ صرف ایک بار پریتی کو اچھّے سے دیکھ لے۔لیکن اِسکرین کے بجائے اُن کی آنکھیں شرم وحیا کے باعث ٹی وی اسٹینڈ کے پائے سے اُلجھی ہوئی تھیں۔آنسوؤں کے بوجھ سے اُوپر نہیں اُٹھ رہی تھیں۔

بہت کوشش کے بعد بھی آنکھیں جب اُوپر نہیں اُٹھ پائیں تو وہ خود کو سہارا دیتے ہوئے اُٹھے اور دروازے کے کونے میں رکھی چھتری کے پاس آکر رُک گئے ....بھیگی آنکھوں کے اِس موسم میں اب چھتری اُن کے ہاتھوں میں تھی۔وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔اب پلکیں کم بھیگ رہی تھیں۔اس لئے دل سخت کر کے اپنی بوجھل پلکوں کو چھتری کے سائے تلے دھیرے دھیرے اُوپر اُٹھانا شروع کیا تاکہ جیسے ہی چھم چھم کی دھیمی پڑتی آواز کے ساتھ منی اسکرٹ کا دائرہ جانگھوں سے لپٹ جائے،اور ایک ہی جگہ کھڑی ہو کر بغیر گھومے ڈانس کرنے لگے تب وہ جلدی سے اپنی پلکیں اُوپر اُٹھائیں گے اور پریتی کے

چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

جیسے ہی دائرہ نما سرکل والا میوزک ختم ہوا اور سامنے چہرہ کر کے ڈانس کرنے کا وقت آیا تو اُنہوں نے پلکیں اُوپر اُٹھائیں۔لیکن لاکھ کوشش کے باوجود سوچ کے اسکیل کو سامنے رکھ کر پیمائش کرتے وقت نظروں کا زاویہ تھوڑا سا نیچے ہو گیا۔آنکھوں کے کیمرے نے جو تصویریں کھینچی، اُس میں پریتی کے سینے تک کا حصّہ قید ہو گیا۔ٹاپ کے فرسٹ ڈے مون کٹ گلے سے جھانکتے اُبھار نے اُن کی سوچ کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔بہت دیر تک اُن کے اندر ٹوٹنے بکھرنے کا عمل جاری رہا کہ جس بیٹی کو وہ تین سال قبل گود میں اُٹھا کر پیار کرتے تھے، سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیتے تھے، اُس بیٹی کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی کہ اچانک ایک باپ، بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے جھجھک محسوس کرے.......گود میں اٹھاتے ہوئے سوچے.........اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرے.........

اُس وقت ڈاکٹر کپل کی جھُکی آنکھیں، جس کے اندر شرم پانی پانی ہو رہی تھی، اُن میں اب دیکھنے کی ہمّت نہیں رہی تھی........بیٹیاں جب بھی کسی کی بڑھتی ہیں تو باپ کے اندر ایک چور پیدا ہو جاتا ہے۔عمر کے ایک خاص حصّے میں جب وہ پہنچتی ہیں اور جسمانی ساخت میں اچانک تبدیلیاں رونُما ہونے لگتی ہیں تو باپ، بیٹی کے اندر کی اِس ہلچل کو اپنے سینے میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

☆☆☆

27

پردے کی قواعد، ڈانسنگ فلور اور فُل مارکس

قارئین!

یہیں سے شروع ہوتی ہے سات پردوں میں چھُپا کر رکھنے کی قواعد۔
یہیں سے شروع ہوتی تعاقب خیز نظروں سے بچانے کی جدوجہد
یہیں سے شروع ہوتا ہے راستوں کا انتخاب۔
یہیں سے شروع ہوتی ہے ایک باپ کے ناموس کی جنگ۔
یہیں سے شروع ہوتا ہے ناک کٹنے کا خوف۔
یہیں سے شروع ہوتی ہے عزّت کی لڑائی۔
یہیں سے شروع ہوتی ہے..........؟
اور پھر ذہن کے لاشعور میں شروع ہوتی ہے یہیں اُس کے لئے کسی اچّھے لڑکے کی تلاش۔

لیکن اُس وقت اُن کے لاشعور کے کسی حصّے میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔کیوں کہ اُس وقت پریتی نے ’’چولی کے پیچھے کیا ہے۔‘‘ جیسے ری مکس گانوں پر ڈانس کر رہی تھی۔لیکن چوں کہ ’چُنر ی‘ کے بجائے ڈانس ماسٹر نے اُسے ’منی اسکرٹ‘ پہنایا تھا اس لئے گانے میں ’چنر ی‘ کو ’منی اسکرٹ‘ سے بدل کر کنٹروسی کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ اُس کا سیدھا فائدہ پریتی کے کھاتے میں جائے۔بلیو پرنٹ شوبھا نے مل کر تیّار کیا تھا۔اور وہ لاسٹ پوز جس میں پریتی نے اپنے فراز کے ساتھ ساتھ نشیب کی انوکھی نمائش کی تھی وہ شوبھا کے ذہن کی اختراع تھی۔جو ڈانس کا سین کم اور اجنتا ایلورا کی گُپھاؤں کا زیادہ لگ رہا تھا۔

پریتی اِس سیکسی پوز میں ابھی ناظرین کی تالیاں اور سیٹیاں بٹور رہی تھی کہ تبھی اپنے نیم عریاں لباس سے بے نیاز پنکھڑی نشیلی چال چلتی ہوئی آئی اور پریتی کے رس بھرے

ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کرتے ہوئے مائک سنبھال لی۔

''آئی لو یو پریتی۔ یو آر وری وری سیکسی ڈانسر۔ یور فیوچر از برائٹ۔''

پھر وہ جج صاحبان سے مخاطب ہوئی۔

''سوری ججیز! پریتی جب بھی ڈانس کرتی ہے تو مجھے پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ میں خود کو سنبھال نہیں پاتی ہوں......... ویسے تو اِس کے فیوچر کا فیصلہ آپ جج صاحبان کے ہاتھوں میں ہے۔ اِس سے پہلے کے جج صاحبان اپنا فیصلہ سُنائیں ہمیں لینا پڑے گا ایک چھوٹا سا بریک۔

بریک میں پوشیدہ جنسی امراض، حکیموں کے نُسخے اور اُس کے فوائد کے چار پانچ اِشتہار یکے بعد دیگرے اِس طرح دکھائے گئے جیسے دنیا کا ہر شخص خواہ وہ جتنا بھی تندرست کیوں نہ ہو، اُنہیں اِس کا استعمال کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ناشتے سے قبل منہ ہاتھ دھونا۔

بریک کے فوراً بعد پنکھڑی کی سُریلی آواز گونجتی ہے۔

ناظرین سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر کپل کسمسا کر اپنی جگہ پر رہ جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں اب بھی جھکی ہوئی ہیں۔ لیکن کان آواز کے زیروبم سے اُلجھنے کے لئے کچھ حد تک تیار ہیں۔

''ہمارے پرانے ناظرین کو جج صاحبان کے نمبر دینے کا طریقہ معلوم ہے۔ چوں کہ ہر پل نئے ناظرین جُڑتے ہیں اس لئے اُنہیں یہ بتا دوں کہ ہمارے یہاں اِس کا طریقہء کار کیا ہے.........''

''نمبر ون.........کسی جج کا ہاتھ پکڑ کر ڈانس کرنے کا مطلب ہوگا کہ پریتی کے حصّے میں دس پوائنٹس آئے ہیں۔''

''نمبر ٹو.........اگر کسی جج نے ہاتھ پکڑنے کے بجائے کمر میں ہاتھ رکھ کر ڈانس کیا تو سمجھ جایئے کہ اُنہوں نے اُسے بیس مارکس دیئے ہیں۔''

''نمبر تھری.........اور اگر کسی جج نے ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں اور دوسرا کمر

پر رکھ کر ڈانس کیا تو سمجھ جایئے کہ اُس کی ڈانسنگ جھولی میں تیس مارکس گرے ہیں۔''

''نمبر فور.........اگر کوئی جج جھومتے ہوئے اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیتا ہے تو سمجھئے کہ جج اُن پر مہربان ہیں اور اُس کے حصّے میں چالیس مارکس آئے ہیں۔''

''اور نمبر فائیو.........یعنی کہ اگر کوئی جج کسی کے پرفارمینس کو سُپر ڈوپر یا مائنڈ بلوئینگ سمجھ کر ڈانس کرتے ہوئے گرم جوشی سے اُس کے ہونٹوں پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھتا ہے تو سمجھ جایئے کہ اُس کے ڈانسنگ اکاؤنٹ میں پورے پچاس مارکس ٹرانسفر ہو ہوئے ہیں۔''

''اور جس کسی کے ہونٹوں پر تینوں ججیز نے نمبر فائیو کی مہر لگا دی وہ اِس ہفتے الیمینیٹ ہونے سے بچ جائے گا۔ اِس پورے ہفتے میں ججیز نے یہ اعزاز کسی کے ہونٹوں کو نہیں بخشا ہے.........لیکن پریتی کے اِس ڈانسنگ پرفارمینس کو دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ منچ پر کچھ ہی دیر میں وہ ہونے والا ہے جو کئی ہفتوں سے نہیں ہوا۔''

''سب سے پہلے میں ماسٹر ہیم بھاردواج سے گزارش کرتی ہوں کہ وہ آئیں اور اِس سیکسی ڈانسنگ کوئن کا ہاتھ پکڑ کر ڈانس کریں یا ہونٹوں کا چمبن لے کر پرفُل مارکس لُٹائیں۔ ہم سب اپنی آنکھیں بند رکھیں گے۔''

ڈاکٹر کپل نے اُس وقت اپنی آنکھیں زور سے موند لی تھیں اور کانوں پر بھی ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اِس لئے اُنہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوا کہ پہلے جج نے نمبر دینے کے لئے ون ٹو فائیو میں سے کس کا استعمال کیا۔

''تو اب میں ایک اور جج شان کانچ والا سے آگرہ کرتی ہوں کہ وہ آئیں اور راؤنڈ ڈانسنگ فلور پر اپنے ڈانس کے جلوے دکھاتے ہوئے پریتی کے ڈانسنگ بینک اکاؤنٹس میں اپنے مارکس کی اِنٹری کروائیں۔

ڈاکٹر کپل کی آنکھیں اُس وقت بھی بند تھیں اور کان پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ مسلسل بنا ہوا تھا۔

اور اب میں آخر میں نہایت ہی عزّت اور احترام کے ساتھ اِس پروگرام کے سب سے سینیئر جج رونق افروز صاحب سے گزارش کرتی ہوں کہ وہ ڈانسنگ فلور پر آئیں اور اپنے نرالے انداز میں پریتی کے سیکسی ڈانس کے عِوض اپنی محبّت کا نذرانہ بطور چیک پیش کریں تاکہ شو ختم ہوتے ہوتے پریتی کے ڈانسنگ بینک اکاؤنٹس میں وہ پہنچ سکے۔

اِس بار بھی اُنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اِس طرح سے تینوں جج صاحبان نے اپنے اپنے ڈانسنگ مارکس کے چیک پریتی کے بینک کھاتے میں جمع کروا دیئے۔ اور اب باری تھی آج کے اِس پروگرام کا ریزلٹ ڈکلیئر کرنے کا۔

ایک بار پھر پھولوں کو پہلے سے زیادہ نیم عریاں کرتی پنکھڑی نے تمام کنٹسٹینٹ کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا——''ناظرین! آپ نے تو دیکھا ہی ہے۔ پھر بھی یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ آج سب سے خوش قسمت ڈانسر کون ہے اور کسے تینوں ججیز کا فل مارکس چُمبن ملا ہے۔ تو ناظرین وہ سیکسی گرل ہے پریتی سنگھ! جو آئندہ ہفتے کی ایلیمنیشن سے باہر ہو گئی ہے۔ تو اِس طرح کم سے کم اُس کا جادو آنے والے دو ہفتوں تک ڈانسنگ پریمیوں کے دلوں پر چلتا ہی رہے گا۔''

اوڈینس نے اِس طرح تالیاں بجائیں جیسے دل سے اِس فیصلے کا استقبال کیا ہو۔

اپنے کان کو بار بار دبانے کی وجہ سے اُن کے ہاتھ کی باریک نسوں میں کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ جس کے باعث دباؤ کمزوری کا شکار ہو گیا۔ اِس لئے اُس وقت پنکھڑی کی آواز دھیرے دھیرے اُن کی سماعت سے ٹکرانے لگی تھی۔

''پریتی آپ کچھ کہنا چاہیں گی خوشی کے اِس موقع پر کہ آپ کو اِس ہفتے تینوں ججوں کا پیار بھرا فُل مارکس چمبن ملا ہے۔''

نیم عریاں پنکھڑی نے بھی ججیز کی نقّالی کرتے ہوئے پریتی کا ایک زوردار کس لے لیا۔

''جی مجھے تو.........'' پریتی اِس سے آگے کچھ کہتی کہ شوبھا جو وی آئی پی گیلری کی شوبھا بڑھانے میں مشغول تھی، مائک لے کر کھڑی ہو گئی۔

''میں اپنی طرف سے خوشی کے اِس موقع پر تمام ججیز کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اُنہوں نے میری بچّی کے خوبصورت ڈانس پر جو چُمبن بھرا مارکس دیا ہے وہ موقع بار بار آئے۔ کیوں کہ ہماری بیٹی کے لئے تو یہی تینوں بھگوان ہیں۔''

اس کے بعد ایلیمنیٹ کا مرحلہ آیا۔

منچ پر آنسوؤں کا ڈانس شروع ہوا۔

اور پھر آخر میں ایک ساتھ سبھی پارٹی سپینٹس سُپر ڈانسنگ شو کے ٹائٹل سانگ جس کا مفہوم تھا:

دنیا میں بہت سارے غم ہیں۔
ہر انسان کسی نہ کسی غم کا شکار ہے۔
ہم سب ڈانس اور گانے کے ذریعہ
سنگنگ اور ڈانسنگ کی ایک ایسی دنیا آباد کریں
کہ آنے والی نسل کے پاؤں
ماں کی کوکھ میں ہی تھرکنے لگیں۔

☆

پروگرام اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔

ڈاکٹر کپل نے اُٹھ کر جلدی سے سوئچ آف کیا۔ جیسے ٹی وی اگر آن رہ گیا تو لائیو ٹیلی کاسٹ کے بعد جس طرح میچ کے ہائی لائٹس دکھائے جاتے ہیں، اُسی طرح پروگرام دوبارہ شروع ہو جائے گا اور تیسری آنکھ بار بار کچھ سین کو ریپیٹ کر کے، اُس کے ڈانسنگ اسٹیپس کو سیکس کے ساتھ کو ریلیٹ کر کے، پریتی کی ٹین ایج بیوٹی کو نئے طریقے سے سمجھانے کی پہل کریں گے۔

ڈاکٹر کپل نے ڈانس کے دوران اپنی آنکھیں بند رکھی تھیں۔لیکن کانوں کے راستے آوازوں کا جلوس '' پریتی ونس مور............ونس مور.........'' کے نعرے لگاتے ہوئے اُن کے دماغ کے چاروں طرف گردش کررہا تھا۔اُس بیچ اُنہوں نے نیم عریاں اینکر پنکھڑی کی بھی باتیں سُنی تھیں اور شوبھا کی بھی۔

فی الحال اُنہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُن آوازوں کا کیا کریں.........؟ کیوں کہ وہ آوازیں اب اُن کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ آوازوں سے بھاگنے کی جتنی کوشش کرتے ،آوازیں اتنی ہی تیزی سے قُربت حاصل کرنے کے لئے اُن کے قریب آجاتیں۔

اب تو روز کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ آوازیں پیچھا کرتیں۔اور وہ اُن آوازوں سے بچنے کے لئے بھاگتے رہتے۔لیکن جیسے جیسے شام کی سلطنت پر رات کی حکمرانی قائم ہونے لگتی، وہ ڈرائنگ روم کے ارد گرد منڈلانے لگتے..........اور رات نو بجتے بجتے ٹی وی کے سامنے والے صوفے پر خود کو دھنسا ہوا پاتے۔

ہر روز وہ اِس اُمید میں ٹی وی کھولتے کہ آج پریتی اُسے چھوٹی نظر آئے گی۔وہ پورے کپڑے میں ہوگی۔ایک باپ اُسے جی بھر کر دیکھ سکے گا ....لیکن اب اُن کی قسمت ایسی کہاں تھی کہ وہ خواہش کے آئینے میں معصومیت سے بھرا پُرا پریتی کا چہرہ دیکھ پاتے؟

ہر روز ڈانس شروع ہوتے ہی وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔لیکن ڈانس ختم ہونے کے بعد پریتی کی آواز ''تھینک یو سر.........تھینک یو میم ....'' سننے کے لئے وہ بے تاب ہو جاتے۔بس اِس 'شو' میں اگر کوئی خاص بات تھی تو یہی وہ 'آواز' تھی جس نے اُنہیں اِس شو کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

☆☆☆

28

گوشت پوشت کی گڑیا اور ٹرانسپرنٹ کپڑے

قارئین!

ڈاکٹر کپل پریتی کو دیکھنے کے لئے جب بھی ٹی وی آن کرتے تو وی آئی پی باکس میں بن سنور کی بیٹھی بیوی کے گہرے گلے سے جھانکتی شوبھا اُسے نظر آجاتی۔اُسے اِس حالت میں دیکھ کر اُن کا غصّہ آسمان میں چڑھ جاتا۔ٹی وی آف کر دیتے اور کبھی بیٹی نظر آتی تو اُسے ایسا لگتا جیسے کسی نے گوشت پوشت کی گڑیا کو ٹرانسپرنٹ کپڑے سے 'لیمینیٹ' کر کے ریموٹ کا بٹن دبا دیا ہو۔وہ فوراً چِلّا اُٹھتے۔ٹی وی کنکشن کھینچ دیتے۔ایسا کرنے میں اُن کی سانسیں تیز تیز چلنے لگتیں۔وہ پسینے میں شرابور ہو جاتے۔دوا تک لینے کی نوبت آجاتی۔شیام سندر عرف شامو بلڈ پریشر کی دوا فوراً اُن کے سامنے کر دیتا۔

''پہلے دوا کھائیے اور پھر آرام کیجئے۔'' ٹی وی کا بٹن آف کرتے ہوئے شامو کہتا۔''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ جب یہ پروگرام آپ کو پسند نہیں ہے تو پھر مت دیکھئے۔''

شیام سندر کہنے کے لئے تو یہ سب کچھ اپنائیت میں کہہ دیتا ہے۔لیکن وہ جانتا ہے کہ پروگرام دیکھنے کے پیچھے مقصد کیا ہے؟ لیکن اِس صورت میں وہ اُسے جی بھر کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔اور بغیر دیکھے اُن سے رہا بھی نہیں جاتا۔دونوں صورت میں زیاں بہر حال ڈاکٹر کا ہی تھا۔

پہلے پہل ڈاکٹر کپل کو شیام سندر کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں ۔ وہ اُسے شام ہوتے ہی گھر بھیج دینا چاہتے تھے۔ایک دو ہفتے اُنہوں نے ایسا کیا بھی۔لیکن جب اُنہیں لگا کہ کہیں پروگرام دیکھنے کے دوران وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائے اور ان کا پریشر ہائی ہو گیا تو ....؟ ایسے میں خطرہ بڑھ جائے گا۔ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔یا پھر غصّے میں وہ خود ہی کوئی غلط قدم اُٹھا لیں۔اس لئے شیام سندر کی موجودگی اِس بات کی ضمانت ہوگی کہ زندگی کی رفتار

گھٹ سکتی ہے۔لیکن رُک نہیں سکتی.........اوراب تو شیام سندرقدم قدم پراُن کے ساتھ رہتا ہے۔گھر کے فرد کی طرح۔اولاد کی طرح۔.........اوراولاد ہےتو پھرسب کچھ اُس کے علم میں رہنا چاہیئے۔ کیوں کہ اب وہی اُن کے دُکھ سُکھ کا ساتھی ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہی کام آسکتا ہے۔اِس لئے وہ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں۔

’’شامومیرے بیٹے !اب تم ہی بتاؤمیں کیا کروں ؟‘‘ آواز میں بیٹی سے دور ہونے کا دردصاف جھلک رہا تھا۔’’تم تو جانتے ہو کہ میں پریتی سے کتنا پیارکرتا ہوں۔لیکن پریتی کواُس کی ماں نے ڈانسنگ کے بہانے بےراہ روی پرڈال دیا ہے.........لیکن اُس کی ماں کوکس نے خراب کیا؟‘‘انہوں نے رُک کرشیام سندر سے سوال کیا۔پھر جواب کا انتظار کئے بغیرآگےخود ہی کہا۔

’’رئیلیٹی شومیں جس طرح کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔وہ واقعی مجھے پسند نہیں ہیں۔لیکن کیا کروں.......؟ مجھے اپنی بیٹی سے پیار ہے۔میں پروگرام کے لئے ٹی وی آن نہیں کرتا۔ بلکہ پریتی کو دیکھنا ہوتا ہے.........اب تُم ہی بتاؤ کہ ایک بیٹی باپ کے سامنے اسکرین پر جس طرح کے کپڑے پہن کر آتی ہے،اُسے دیکھنا کون عزت دار باپ گوارہ کرے گا.........؟‘‘

روہانسی آواز میں جب ڈاکٹر کپل نے دل کی بات سامنے رکھی تو شیام سندر بھی جذباتی ہوگیا تھا۔آنکھوں کے کنارےکوصاف کرتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’نہیں!میں نے یہ کب کہا کہ آپ ٹی وی نہیں دیکھیں.........لیکن اگر اِس طرح کے پروگرام دیکھنے سےآپ کی طبیعت پربُرااثر پڑتا ہےتو پھر.........‘‘ کہتے کہتے کچھ وقفے کے لئے وہ رُکتا ہے۔’’لیکن جہاں تک پریتی کی بات ہےتو میں اِس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔کیوں کہ ایسے معاملات کے جذباتی تاردل کی دھڑکنوں سے سیدھے جُڑے ہوتے ہیں۔‘‘

ڈاکٹر کپل، اُس کی فکر آمیز گفتگو سُننے کے بعد کچھ حیران ہوئے ۔لیکن

اُنہیں شاموکا یہ انداز اچھا لگا کہ کوئی تو ہے جو اُس کی صحت کی فکر کررہا ہے۔

فکر سے جب فکر ٹکراتی ہے تو فلسفی کے اندر ہلچل پیدا ہوتی ہے تب کہیں جا کر منتشر ذہن ایک مرکز پر سمٹتا ہےاور فلسفے کا جنم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کپل کے اندر بھی فکری ٹکراؤ کا عمل جاری تھا۔

اِس ٹکراؤ کے باعث اُن کے اندر بھی ایک فلاسفر کا جنم ہو چکا تھا۔فلاسفر کے جنم ہوتے ہی اُنہوں نے کہنا شروع کیا۔

’’شامو یہی تو وہ بات ہے کہ انسان جس کو زیادہ پیار کرتا ہے اگر وہ اُس سے دور ہوجائے تو کسی کسی کے لئے یہ دوری موت کا سبب بن جاتی ہے.........‘‘ آنکھیں اُس کے چہرے پر رکھتے ہوئے۔’’لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ اس روپ میں کوئی بیٹی کو دیکھ لے تو دھڑکنیں تو بے قابو ہوں گی ہی۔ہوسکتا ہے کہ بروقت دوا بھی کام نہ کرے۔‘‘ یہ کہتے کہتے اُن کے دل کی دھڑکنیں واقعی تیز ہوگئیں تھیں۔رُک کر لمبی سانس لی اور پھر کہا۔’’لیکن اب جب کہ میں نے بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ دوستی کر لی ہے تو موت بھی میرے قریب آتے ہوئے خوف زدہ ہے کہ کہیں اُس کے گلے زندگی نہ پڑ جائے ۔ جب تک دھڑکنیں اعتدال پسندی کی راہ پر نہ لگ جائیں، میں دھڑکنوں کی دھڑکنیں بڑھاتا رہوں گا۔

شیام سندر نے جب فلسفیانہ گفتگو کے لفظی تاروں میں دوڑتے کرنٹ کو اپنے اندر صاف محسوس کیا تو اُنہیں ایک طرح کا جھٹکا لگا۔اُس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوگئیں۔ دھڑکنوں پر قابو رکھنے کے لئے اُسے ہر حال میں ڈاکٹر کپل کے دل پر قابض ہونا تھا۔اور یہ سب تب ممکن تھا جب اُن کے دماغ کی نسوں کو کولنگ سسٹم سے جوڑ دیا جائے۔

پھر تو روز کا معمول ہوگیا۔

اِدھر دھڑکنیں بڑھیں اور اُدھر کولنگ سسٹم آن ہوگیا۔

ایسے میں اکثر شیام سندر ٹھنڈے تیل کی شیشی لئے سامنے آجاتا۔منع کرنے کے

باوجود سر میں ڈال دیتا۔ گود میں رکھ کر دیر تک مالش کرتا۔ اُن کا بدن ہاتھ دباتا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی تھکاوٹ کو دور کرنے کی حتّی الامکان کوشش کرتا تا کہ نیند آجائے۔

اِس طرح کے حالات جب بھی پیدا ہوتے وہ بغیر کھانا کھائے سوجاتے۔ حالاں کہ شیام سندر کی کوشش یہی رہتی کہ سونے سے پہلے کسی طرح سے اُنہیں کھانا کھلا دیں۔ لیکن جب وہ زیادہ پریشان ہوتے تو اُنہیں کھانا سے زیادہ سُلانے کی فکر ہوتی۔ جس رات وہ بغیر کھانا کھائے سوجاتے اُس رات شیام سندر بھی کھانا نہیں کھاتا۔ دوسرے دن دونوں ناشتے میں اُسی کھانا کو گرم کر کے ٹیبل پر سجاتے۔ شیام سندر ناشتہ بنانا بھی چاہتا تو ڈاکٹر کپل منع کر دیتے۔ ''غلطی میری ہے تو اِس کا ازالہ مجھے ہی کرنا ہے۔ کھانا پھینکنے سے اناج کی بے حرمتی ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر کپل جب باسی کھانا لے کر بیٹھتے تو شیام سندر کو حیرانی ہوتی۔ کیوں کہ ایسے کھانے تو اُن جیسے لوگوں کا مقدّر رہوا کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کپل کچھ اِس اطمینان سے کھا رہے ہوتے ہیں جیسے بٹر پنیر کا مزا لے اُڑا رہے ہوں۔ یہ گھر جب سے شیام سندر کے لئے قیام گاہ بنا تھا تب سے روکھی سوکھی روٹی اُس کے حلق سے دور ہوگئی تھی اور اب رات کی وہ روٹی جو کچھ حد تک سخت ہوگئی تھی اُس کے گلے میں گڑ رہی تھی۔ اِس کے باوجود پہلا نوالہ مُنہ میں رکھتے ہی کچھ یادیں سلائیوا میں تبدیل ہو کر دہن کو بھگونے لگیں۔

''میں نے بچپن میں کئی راتیں بھوک کے بستر پر گُزاری ہیں۔ اِس لئے اناج کیا ہے؟ اُس کی اہمیت مجھ جیسا ہی کوئی اناتھ بتا سکتا ہے۔'' آنکھوں کے دونوں کنارے بھیگنے لگے تھے۔

ڈاکٹر کپل نے تولیے سے اُس کی آنکھوں کے کنارے صاف کئے۔ پھر ریئلیٹی، بھوک اور کپڑے کے متعلق اپنے ثالثی نظریات اِس طرح پیش کئے کہ شیام سندر اُنہیں دیکھتا رہ گیا۔

''یہ دنیا کی سب سے بڑی ریئلیٹی ہے کہ ایک غریب انسان جب بھوک سے مرتا

ہے تب بھی اُس کے جسم پر میلے کچیلے کپڑے ہوتے ہیں.........لیکن فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پیٹ بھرنے والے کچھ ایسے ہیں جو ماڈرنیٹی کے نام پر چھاتیوں کو کپڑوں سے بے نیاز رکھتے ہیں۔ عیش کی خاطر کیمرے کے سامنے زیرِ ناف اُتارتے ہیں۔ اور دورانِ بے حیائی ایسا تاثّر دیتے ہیں جیسے عظیم فریضہ نبھا رہے ہوں۔''

ہفتے میں دو تین راتیں ایسی آ ہی جاتیں۔

دو تین صُبحیں بھی باسی کھانے کے استقبال میں رہتیں۔

ایک ایسی ہی رات کے بعد صبح آئی تو دونوں نے باسی کھانے کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ اِس کے بعد ڈاکٹر کپل کلینک جانے کی تیّاریوں میں جُٹ گئے۔ چائے کی پہلی چُسکی کے ساتھ اُنہوں نے اخبار کا پہلا صفحہ کھولا۔ نظر پریتی کی نیم عریاں تصویر پر پڑ گئی۔ وہ اُسے شامو کی نظروں سے چھُپا لینا چاہتے تھے۔ اِس لئے جلدی میں اُنہوں نے اخبار کا دوسرا سِرا اپنی طرف کر لیا۔ آخری صفحہ پر چھپی اسپورٹس کی خبریں وہ یوں ہی پڑھنے لگے۔ تب تک شامو ٹرے رکھ کر سامنے بیٹھ گیا۔ تبھی اُس کی نظر فرنٹ پیج پر پڑ گئی۔ وہ کسی طرح اخبار اُن سے لے لینا چاہتا تھا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ ذہن میں سوچ کی نئی پود پھُوٹتی، دوسری چُسکی کے ساتھ ڈاکٹر کپل کو کچھ یاد آیا۔ اُنہوں نے ہڑبڑاہٹ میں فرنٹ پیج اپنی طرف کر لیا۔ اُس وقت کچھ اِس صفائی سے شیام سندر نے نظریں دوسری طرف گھما لی تھیں کہ جب ڈاکٹر کپل نے اُس کی طرف دیکھا تو اُنہیں ایک گونا گوں راحت کا احساس ہوا کہ شامو دوسری طرف رُخ کئے کسی اور کام میں مصروف ہے۔ اُس کی نظر تصویر پر نہیں پڑی ہے۔ تب وہ بہانے سے اُس پر چائے گرا کر اُسے دوسری پیالی چالے لانے کے لئے کہتے ہیں اور خود اخبار کو موڑ کر ڈسٹ بین میں ڈال دیتے ہیں۔

ہاؤکر جب اخبار پھینک کر گیا تھا اُس وقت اخبار فولڈ تھا۔ اگر وہ کھول کر دیکھ لیتا تو پہلے ہی اُسے چھُپا دیتا یا کوئی اور بہانہ بنا دیتا۔ لیکن وہ اُس وقت اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اُس نے آج اخبار کو کھول کر دیکھا کیوں نہیں؟ ویسے بر آمدے سے اخبار اُٹھا کر وہ اکثر پانچ

دس منٹ پڑھ لیا کرتا تھا۔ اور ایسا اِس لئے ہو پاتا تھا کہ جب ہاؤکر کے آنے کا وقت ہوتا تھا
ڈاکٹر صاحب باتھ روم ہوتے۔ نہادھوکر جب تک وہ کپڑے پہن نہیں لیتے تھے تب تک وہ
اخبار اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا تھا۔ لیکن آج چوں کہ پلکیں نیند سے بوجھل تھیں اور طبیعت
مضمحل۔ اِس لئے اس نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کے کلینک جانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام
کرے گا۔ بعد میں اخبار کی اہم خبروں کو نوٹ کرے گا۔

چائے لے کر شیام سندر جیسے ہی اندر آیا ڈاکٹر کپل نے کہا۔

''کل سے اخبار والے کو منع کر دینا۔ سالے جو چاہتے ہیں چھاپ دیتے ہیں۔''

پریتی کی ادھ ننگی تصویر کو ڈسٹ بین میں ڈالنے کے بعد اُنہوں نے راحت کی
سانس لی۔ ساتھ ہی ساتھ اخبار بند کرنے کی بات بھی کہہ دی۔ لیکن پھر کچھ ہی دیر میں اُنہیں
اِس بات کا احساس ہوا کہ جس اخبار کو بند کرنے کی بات کر رہے ہیں اُسے دراصل شیام
سندر کے لئے لگوایا گیا ہے۔ تا کہ جنرل نالج میں اضافہ ہو۔ ایسے میں شامو نے کوئی جواب
نہیں دیا۔ چپ رہا۔ اور یہی بات ڈاکٹر کپل کو اندر سے بے چین کر رہی تھی۔ آخر اس بے
چینی کو کسی نہ کسی راستے سے تو نکلنا ہی تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو کہ یہ اخبار گھر میں آتے رہے اور تم گھر بیٹھ کر پریتی کی ادھ ننگی
تصویریں دیکھتے رہو.........؟''

''نہیں نہیں.........'' وہ کچھ گڑ بڑا گیا تھا۔ ڈاکٹر کپل اُس سے اِس طرح کی
بات کریں گے اس نے خواب وخیال میں بھی سوچا نہیں تھا۔ وہ اندر سے کانپ رہا تھا۔ ''میں
تو........ پریتی کے بارے میں .... ایسا کبھی ....سوچ بھی........نہیں سکتا ڈاکٹر
انکل۔''

''پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ اِس میں پریتی کی ادھ ننگی تصویر چھپی ہے۔''

ڈاکٹر کپل کو اچانک یاد آیا کہ ہر روز وہ اُن سے پہلے اخبار اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے
تو پھر آج کیسے نہیں دیکھا ہوگا؟ اُنہیں اب یقین ہو گیا تھا کہ اُن سے پہلے وہ تصویر دیکھ چکا

تھا۔

شامو رونے لگتا ہے۔

''آپ کی قسم! میں نے اخبار دیکھا ہی نہیں۔'' روتے روتے وہ سسکنے لگا۔ ''آپ
کو دوا کھلا کر میں رات بھر.........آپ کے سرہانے بیٹھا جاگتا رہا تھا.........اور سوچا تھا کہ
آپ کے کلینک جانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گا.........اور پھر اخبار دیکھوں گا۔''

اس جواب پر ڈاکٹر کپل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُنہوں بڑھ کر شیام سندر کو گلے
لگایا اور دیر تک خود بھی روتے رہے۔

شامو چپ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر کپل مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

'' شامو وعدہ کرو کہ آج کے بعد تم کبھی نہیں روؤ گے۔'' اس کے چہرے کے نچلے
حصّے کو پکڑ کر اُسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''اور ہاں! رہی بات اخبار کی تو وہ تو میں نے
یونہی کہا تھا.........لیکن اتنا یاد رکھنا کہ جب تک تم ٹھیک سے اخبار دیکھ نہ لو تب تک مجھے
پڑھنے کے لئے نہیں دینا۔ ورنہ ایک باپ کے دل پر کیا گزرے گی، یہ تمہیں تب پتہ چلے گا
جب تم ایک جوان بیٹی کے باپ بن بنو گے.........لیکن اِس سے بھی زیادہ شرم آمیز بات
یہ ہے کہ کمسن بیٹی کا باپ ہوتے ہوئے جوان بیٹی کی تصویر دیکھ رہا ہوں۔''

اِس کے بعد جب بھی اِس طرح کی تصویریں شائع ہوئیں، شامو نے تراش کر
الگ کر لیا۔ اس بابت ڈاکٹر کپل نے پوچھا تک نہیں کہ اُس نے تصویروں کا کیا کیا.........؟

بکھری ہوئی تصویروں کو یکجا کر کے خالقِ کائنات نے جب دنیاوی البم بنایا
تو وقت نے خوبصورت تصویروں کی تعریف کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن اِس کے
ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے تصویروں کے حوالے سے ہواؤں میں جو سوال اُچھالے وہ آج
بھی جواب کی تلاش میں محوِ گردش ہے۔

تصویروں کے ساتھ کوئی کیا کرتا ہے.........؟

کیا تصویریں بھی کبھی اندر اندر اپنی دوسری تصویریں بنا رہی ہوتی ہیں۔

کیا ایک کے اُوپر ایک رکھی ہوئی تصویریں بھی ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتی ہیں؟

کیا کبھی تصویروں کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ ایک البم سے نکل کر دوسرے البم میں اپنے لئے کوئی اچھّی سی جگہ تلاش کر لے؟

کیا تصویریں آنکھوں کی گرمی سے پگھلتی ہیں؟

کیا پگھلنے کے اِس عمل میں تصویریں عکس حقیقی سے گفتگو کرنے کے لئے بے چین نہیں ہوتیں؟

اگر اخبارات سے تصویریں کاٹنے کے دوران تصویریں بے چین ہوئی ہوں گی ۔آنکھوں کی گرماہٹ سے پگھلی ہوں گی تو یقیناً وہ ساری تصویریں البم سے نکل کر پریتی کے کانوں میں سرگوشی کی ہوں گی۔

''تم یہاں ہو،لیکن تمہیں تو وہاں ہونا چاہئے جہاں تم نہیں ہو۔''

☆☆☆

29

سائبر اسپیس، نئی نسل اور گھنگھرو

قارئین!

سائبر اسپیس میں جہاں نئی نسل اپنے بازوؤں میں پنکھ لگا کر آسمانی گھر بنانے کے خواب بن رہی تھی، وہیں پاؤں میں گھنگھرو باندھے وہ پوری دنیا کو اپنے چھم چھم پر نچانے کے نئے سپنے بھی دیکھ رہی تھی۔

شوبھا کے سپنے الگ تھے۔

ڈاکٹر کپل کے خواب گاہ کا راستہ قلم اور کتاب سے ہو کر آگے بڑھتا تھا۔

دونوں اپنے اپنے سپنوں اور خوابوں میں رئیلیٹی رنگ بھرنے کے لئے پریتی کو تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

لیکن اِن باتوں سے پریتی لاعلم تھی۔ کیوں کہ ابھی وہ چھوٹی تھی۔لیکن ہر چھوٹی چیز ایک نہ ایک دن بڑی ہوتی ہے۔اُس کا ایک مکمل وجود ہوتا ہے۔

وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی وقت کو ایک لمبے سفر پر نکلنا تھا۔

سفر پر نکلنے سے پہلے اور سفر کے دوران اور سفر کے بعد بھی اُسے خود سے لڑنا تھا۔

کیوں کہ سفر کے ہر قدم پر نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔

مسئلے ہمیشہ گفتگو سے نہیں سلجھتے۔

ان ہی مسئلوں کا حل نکلتا ہے جس پر دونوں فریقین کو اتّفاق ہوتا ہے۔

☆

لیکن شوبھا کو وقت کے ننگے پاؤں پسند نہیں ہیں اِس لئے وہ گھنگھرو باندھنے کے حق میں ہے کہ جب وہ چلے تو اُس کی جھنکار سے ساری دنیا مست ہو جائے۔

ڈاکٹر کپل کو کاغذ پر کھینچی جانے والی ہر آڑی ترچھی لکیر میں تہذیب کے نقوش

دکھائی دیتے ہیں۔ جن لکیروں میں ترقّی کے سارے راز پوشیدہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب وقت ایک لمبے سفر پر نکلا اور راستہ ہموار کرتے ہوئے آگے بڑھا تو دیکھا کہ شوبھا اُسی راستے پر پریتی کے ساتھ گھنگھرو لئے چل رہی ہے۔ کچھ فاصلے پر ڈاکٹر کپل شیام سندر عرف شامو کے کاندھے پر بستے کا بوجھ ڈالے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں.........بیچ راستے تک پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر کپل کو ایسا لگا جیسے وہ اِس ریئلیٹی سفر میں شوبھا سے بہت پیچھے چھوٹ رہا ہے اور اب ہار یقینی ہے تب اُنہوں نے بھاری بستے کی جگہ شیام سندر کے ہاتھوں میں لیپ ٹاپ تھما دیا اور اُسے انٹرنیٹ سے جوڑ کر نئی نسل کے وجود و بقاء کی خاطر اِس جنگ میں اُتار دیا۔

جنگ کے ابتدائی دور میں جب اُنہوں نے محاسبہ کیا تو اُنہیں اِس بات کی خوشی ہوئی کہ راتوں رات اُن کی قوّت MB سے GB میں منتقل ہوگئی ہے۔

میگا بائٹ سے گیگا بائٹ میں بدلتے ہی شیام سندر کے اندر کا عزم و حوصلہ نئے باب لکھنے کے لئے بے تاب ہوگیا۔ اِس بے تابی نے پہلے میڈیکل کا انٹرنس کلیر کیا اور بعد میں امتیازی نمبروں سے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر کپل کی دیرینہ خواہش پوری کی۔ جس کے باعث اُن کے دل کی شاخوں پر تمنّا کی کلیاں پھول بن کر کھلنے کے لئے بے تاب ہوگئیں۔

شیام سندر نے اُن کے ویرانے میں شگفتگی بخش کر زندگی کو جس طرح سے عطر بیز کر دیا تھا وہ اِس کا متّقاضی تھا۔ اِس لئے آج ڈاکٹر کپل اپنے آپ کو ادھورے ہوتے ہوئے بھی ادھورے محسوس نہیں کر رہے تھے۔ جیسے اُنہیں سب کچھ مل گیا ہو۔ یا شیام سندر کے اندر سب کچھ پا لیا ہو۔ وہ سب کچھ جو وہ اپنی اولاد کے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ریئلیٹی کی آندھی ایسی چلی کہ شوبھا نے پریتی کو اُن سے دور کر دیا۔ لیکن وہ آج بہت خوش تھے۔ اِس موقعے پر اُنہوں نے مٹھائیاں تقسیم کیں۔ شیام سندر کے دوستوں کو ایک خاص پارٹی پر بُلایا۔ سب کے سب شیام سندر کی قسمت پر حیران تھے۔

''یار شیام! تو بہت خوش قسمت ہے۔ تمہارے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ہمیں جلن ہو رہی ہے۔؟'' روہن ترپاٹھی میڈیکل کالج میں اُس کے ساتھ تھا۔

''نہیں دوست! میں تو جو کچھ بھی ہوں اپنے ڈاکٹر پاپا کی بدولت ہوں۔'' ڈاکٹر کپل کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے۔ ''ورنہ میں آج کسی چوراہے پر بھیک مانگ رہا ہوتا یا پھر دُکھ کے ہمالہ کے نیچے سسک سسک کر زندگی کے خون ٹپکا رہا ہوتا۔'' شامو جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا۔

''دُکھ اور سُکھ تو زندگی کے دھوپ چھاؤں ہیں۔'' ڈاکٹر کپل نے جذبات کی لہروں سے اُسے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ ''میں نے اِس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اِس نے اپنے کردار سے مجھے اِتنا متاثر کیا کہ اِس کا ٹیلینٹ خود بخود قسمت کا ستارا بن گیا۔'' اُس کے دوستوں سے یہ کہتے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اِس طرح اُٹھایا جیسے چھت شیشے کا ہو اور اُوپر کا منظر صاف دکھائی دے رہا ہو۔

''انکل شیام نے ہم لوگوں کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ اُس کے لئے بھگوان ہیں۔''

جمیل قمر نے جب یہ کہا تو تھوڑا سا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ لیکن اِس کے بعد بھی انسان اور بھگوان کا فرق اُنہیں معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ پوری دنیا کے لوگ مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں تو بھی وہ بھگوان کے سامنے ایک سکنڈ کے ہزارویں حصّے کے مدِّ مقابل بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ پھر اُن کی کیا بساط؟ اِس لئے فوراً کہا۔

''بیٹا میں بھگوان نہیں، انسان ہوں اور آج کل انسان کی تلاش میں ہوں اور تم سب میرے لئے دعا کرو کہ جب سانس کا رشتہ ٹوٹے تب بھی میرے اندر انسان موجود رہے۔ انسانیت باقی رہے۔''

☆

اِسی انسانیت نے شامو کو پوس پالک کا درجہ دیا تھا۔

حالاں کہ دوستوں کو یہ بات اچھّی نہیں لگی تھی۔ کچھ نے پریتی کے مستقبل کو

سامنے رکھ کرنفی کے ہاتھوں اُنہیں روکنے کی کوشش کی کہ ’’ کل کس نے دیکھا ہے ؟ اگر حالات سازگار ہو گئے اور وقت کا ڈاکٹر تمہارے جسم میں سرنج انجیکٹ کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ تمہاری نسیں واضح طور پر نظر آئیں .... ورنہ خون بھی رائیگاں ہوگا اور صحت بھی جائے گی۔‘‘

اُس وقت ڈاکٹر کپل کے نزدیک دوستوں کی اِن نصیحتوں کی کوئی اہمیّت ہی نہیں تھی۔حالاں کہ دوست واحباب کا مورل سپورٹ حاصل تھا۔ یہ بات وہ اچھّی طرح جانتے بھی تھے۔لیکن اُنہیں اِس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ آنے والے دنوں میں شیام سندر اُن کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا؟

’’نہیں مجھے اُس لڑکے پر پورا ’بھروسہ‘ ہے۔ میں نے چھ سات سالوں میں اُسے جتنے نزدیک سے دیکھا ہے اُس کی روشنی میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ’وہ‘ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔‘‘

ڈاکٹر کپل کے اندر اِس اعتماد کو دیکھ کر کچھ نے چُپّی سادھ لی۔لیکن ڈاکٹر حامد عالم اُنہیں متزلزل کرنے کے لئے یلغار کرتے رہے۔

’’چلو یہ مان بھی لیا تو اِس سے بات نہیں بننے والی......... کپل تمہاری آئیڈیالوجی کی لڑائی دراصل شوبھا سے ہے۔ اِس لئے ہوسکتا ہے کہ کبھی شوبھا اور پریتی میں کسی وجہ سے اختلاف ہوجائے اور پریتی تمہارے پاس لوٹ آئے ،تو ایسی صورت میں اُس کو دینے کے لئے تمہارے پاس کیا رہ جائے گا؟ اس لئے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ سب کچھ شیام سندر کے نام کر کے اپنا ہاتھ کاٹنے سے بہتر ہے کہ آدھا اُسے دے دو اور آدھا بچا کر رکھو تاکہ وقت ضرورت اپنے حساب سے مائنس پلس کرسکو۔ اگر ہاتھ ہی کٹ گیا تو پھر سمجھو کبھی اُوپر سے نیچے لکیر کھینچ کر مائنس (-) کو پلس (+) نہیں کر پاؤ گے ۔‘‘

رخسار جو بہت دیر سے باتیں سن رہی تھی اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔شوہر کی مائنس پلس والی بات سننے کے بعد وہ بھی میدان میں اُتر آئیں۔

’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘ وکالت کرتے ہوئے مسکرائی۔’’ کپل بھائی جان ! آج نہیں تو کل شوبھا کے دماغ ٹھکانے لگیں گے۔ ہوسکتا ہے اُس وقت وہ سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوجائے۔ایسی صورت میں دل کے اندر تھوڑی گنجائش باقی رہے تاکہ کوئی رہنا چاہے تو جگہ بنائی جاسکے۔‘‘

’’دیکھئے بھابی جان! مجھے شوبھا سے ایسی اُمیّد نہیں ہے۔ ہاں رہی بات پریتی کی تو ابھی وہ بچّی ہے۔ مجھے امیّد ہے کہ جب اُس کا شعور بالیدہ ہوگا وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرنا سیکھ جائے گی، کیوں کہ اُس کے وجود کی تشکیل میں میرے لہو کا بھی حصّہ ہے۔‘‘

اِس کے بعد بھی اُنہوں نے اپنے پتّے نہیں کھولے۔

لیکن دوست واحباب کے ذہن و دماغ میں سوچ کا عمل جاری تھا۔ کہ جب پریتی کو معلوم ہوگا کہ باپ نے پوری جائداد نوکرانی کے بیٹے شیام سندر عرف شامو کے نام کر دیا ہے تو اِس کارنامے پر اُسے نفرت سی ہوجائے گی۔

دوست واحباب کی اِس سوچ کے برعکس ڈاکٹر کپل کی سوچ کچھ الگ تھی۔

کیا سوچ کا پرندہ حقیقت کے پنکھ لگا کر آسمان کا چکّر لگا پائے گا؟

اس کا جواب وقت کے گربھ میں پوشیدہ تھا۔

وقت سے پہلے اگر سوچ کا اسقاط ہوگیا تو........؟ تو پھر دوسرے حمل تک اُنہیں انتظار کرنا پڑے گا۔لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جب جب وقت نے گربھ دھارن کیا ہے تب تب پیدائش کے وقت کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔

تو کیا پریتی کا بھی دوسرا جنم ہوگا........؟

یا پھر وقت کے گربھ میں اُس کی سوچ کا نطفہ بے اثر ثابت ہوگا۔؟

☆

سوچ کبھی نہیں مرتی ،لیکن سوچنے والے کو مارنے کا ہُنر رکھتی ہے.......... مرنے والا جب یہ سوچ لے کہ ایک دن مرنا ہے تو پھر وہ سوچ کی گود میں سر رکھ کر موت کو گلے لگانا

پسند کرتا ہے۔ایسے میں ’سوچ‘ بھی ’سوچ‘ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کیا کرے؟

سوچ کا یہ عمل جاری تھا۔

اور ڈاکٹر کپل سوچ کی گود میں سر رکھ مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ شیام سندر سامنے آ گیا۔

’’کیا بات ہے ڈاکٹر پاپا.........؟ اِدھر میں کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ جب بھی اکیلے ہوتے ہیں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔‘‘ اُس نے سر دباتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں نہیں کچھ نہیں ....‘‘ سوچ کی گود سے سر الگ کرتے ہوئے اُنہیں ایسا لگا ہے جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ بات بدلتے ہوئے بولے۔’’اب جب تم میرے پاس ہو تو پھر مجھے کسی کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت.........؟‘‘

’’نہیں کچھ تو ہے جسے آپ چھپا رہے ہیں؟۔‘‘ ڈاکٹر کپل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

’’شامو! یہ تمہاری آنکھوں کا دھوکہ ہے۔‘‘ ڈاکٹر کپل نے چالاکی سے آنکھیں اِس طرح سامنے رکھ دیں کہ اُسے شک نہ ہو۔’’ میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپا رہا۔اب تم میرے بیٹے ہی نہیں میری سانسیں بھی ہو۔ ہر پل دل میں دھڑکتے رہتے ہو۔اور اِس وقت بھی میں تمہاری دھڑکنوں کو اپنے اندر سُن رہا ہوں۔تم باہر بھی ہو اور میرے اندر بھی۔ اکثر تم اسی طرح مجھ سے ہم کلام ہوتے ہو۔اور میں گھنٹوں اِسی طرح تمہاری گفتگو سنتا رہتا ہوں۔‘‘

’’کیا آپ اب بھی میری گفتگو سُن رہے ہیں۔؟‘‘

’’ہاں بیٹے.......میں اب بھی تمہاری گفتگو سن رہا ہوں۔‘‘

’’تو اچھّا اب آپ یہ بتائیے کی اِس وقت میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں؟‘‘

’’تم میری باتوں کو انکار کر رہے ہو۔‘‘

’’انکار.........؟‘‘

’’ہاں!‘‘

’’نہیں یہ نہیں ہوسکتا؟‘‘

’’لیکن یہ سچ ہے کہ تم ’انکار‘ کر رہے ہو۔‘‘

’’ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میں آپ کی کسی بات کا انکار کروں.........لیکن وہ کون سی بات ہے جس کے لئے میں انکار کر رہا ہوں۔

’’اصل میں بیٹے تم سے جو میرا ’میں‘ اِس وقت گفتگو کر رہا ہے وہ دراصل میرا ہمزاد ہے۔اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ ’’تم نے اپنے بیٹے کے نام صرف گھر کا وصیت نامہ لکھا ہے۔ لیکن گھر اب بھی تمہارا ہے۔اگر تم یقیناً اُس کے نام کر چکے ہو تو سب سے پہلے اِس گھر کو اُس کی پسند کے عین مطابق بناؤ ورنہ.........؟ میں نے ہمزاد کی بات مان لی۔اب ہمزاد تمہیں راضی کرنے میں لگا ہے۔اور تم ہو کہ انکار کر رہے ہو۔‘‘

ایک بار پھر ہمزاد کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اور ایک بار پھر اس نے انکار کرنے کی کوشش کی۔

’’ڈاکٹر پاپا! یہ گھر جیسا ہے اُسی طرح رہنے دیں۔ مجھے کسی طرح کی تبدیلی نہیں چاہئے.........آپ نے بھلے ہی یہ گھر میرے نام کر دیا ہے۔لیکن سچ ہے کہ مجھے نہیں چاہئے یہ سب کچھ.........مجھے صرف آپ کا پیار چاہئے ....پیار.........‘‘

شیام سندر جذباتی ہو کر رونے لگا تھا۔

ڈاکٹر کپل اگر اُس وقت جذبات کو دیکھتے تو وہ سب کچھ جو کرنا چاہتے تھے کر نہیں سکتے تھے اور جو کر سکتے تھے اِس کے لئے جذبات کی اَن دیکھی کرنا ضروری تھا۔اِس لئے اُنہوں نے دل کو سخت کر لیا۔

’’جب تک تم اپنی پسند سے اِس گھر کو ڈیکوریٹ نہیں کرو گے تب تک میں کلینک میں ہی سوؤں گا۔‘‘

ڈاکٹر کپل کی محبّت آمیز دھمکی کام آئی اور شیام سندر عرف شامو گھر کو اپنی پسند کے

عین موافق بنانے کے لئے راضی ہو گیا۔

پھر شروع ہوا موڈی فیکیشن کا کام.........

رنگ و روغن سے کام شروع ہوا۔ پہلے اندر جس کلر کا ڈِسٹمپر تھا اُسے باہر کی دیواروں پر اور جیسا باہر تھا اُسے اندر کی دیواروں پر لگا کر رنگوں کے اِس اندر باہر کھیل میں گھر کو نیا لُک دیا گیا۔ جس کی وجہ سے اب وہ گھر وہ گھر نہیں رہا تھا، اور نہیں ہوتے ہوئے بھی وہ وہی گھر تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ پہلے جو رنگ تھے اُسے شوبھا نے پسند کیا تھا اور اب جو رنگ لگائے گئے ہیں اُسے شامو نے کمپیوٹر کی مدد سے منتخب کیا تھا۔ اتّفاق سے وہ رنگ بھی وہی تھے۔ بس صرف اندر باہر کا فرق تھا.........اور یہی وہ فرق تھا جس کے بطن میں گھر کی نئی پہچان پوشیدہ تھی۔

رنگ و روغن کے ساتھ ساتھ گھر کی بہت ساری پرانی چیزیں بدل گئیں.......... پردے، فرنیچر، یہاں تک کہ ضرورت کی ساری چیزیں ڈاکٹر کپل نے شیام سندر سے پوچھ پوچھ کر اُس کی پسند کے مطابق بنوائی تھیں۔

جب بھی وہ منع کرتا۔ ڈاکٹر کپل یہی کہتے۔

''تمہارے سوا میرا کون ہے۔ جو کچھ میرا ہے وہ سب تمہارا ہے، جو تمہارا ہے اُس میں تمہاری پسند کا ہونا ضروری ہے۔ تبھی زندگی انجوائے کر پاؤ گے ....اور اب تو میری خواہش ہے کہ بہو کا انتخاب بھی تم خود کرو گے۔ بس شادی سے پہلے اپنے اِس باپ کو اُس کا دیدار کرا دینا تا کہ لکڑی کے بستر پر سوتے وقت شعلوں کے بیچ بھی اچھی نیند آئے۔

30

باتھ روم اور انڈر گارمینٹس

قارئین!

ڈاکٹر کپل نے نوکرانی کے جس بیٹے شیام سندر کو پریتی کی کتابیں دے کر اور اُس کی پڑھائی کا خرچ اُٹھا کر شوبھا کے خلاف رِیئلیٹی کی اِس جنگ میں شامل کر لیا تھا، شوبھا اُسی شیام سندر کو ہر روز کچھ ایسے کپڑے دھونے کے لئے دیتی تھی۔ جس سے اُسے گھِن سی آتی تھی۔ وہ ہر روز اُسے باتھ روم کے ایک کونے میں رکھ دیتا۔ باقی کپڑے دھو کر جلدی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ لیکن شوبھا کپڑے دھونے کے دوران کسی بہانے سے جھانک لیا کرتی۔ کنارے رکھے ہوئے کپڑے اُٹھا کر سامنے کر دیتی۔ اُس کے ہاتھوں میں اِس طرح تھما دیتی کہ انڈر گارمینٹ سے اُٹھنے والی 'بوٗ' اُس کے نتھنوں میں سما جاتی۔ ایک ایسی 'بوٗ' جس کے پیچھے صدیوں سے ٹانگیں بھاگتی رہی ہیں، لیکن نتھنو سے بوٹکراتے ہی شامو کی ٹانگیں کپکپانے لگتیں۔ شروع میں یہ کپکپاہٹ شوبھا کو بہت اچّھی لگتی تھی۔ اِس سرشاری میں نچلے ہونٹ پر دانتوں کا دباؤ بڑھ جاتا تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔

ایک دو بار تو ناک پر ہاتھ رکھ کر ایک ہی ہاتھ سے اُس نے جلدی جلدی صابن لگا کر اور اُس پر پانی ڈال دیا تھا۔ اِس دوران اُس نے آنکھیں بند رکھی تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے شوبھا نے دیکھ لیا تھا۔ اور اب تو وہ یہی چاہتی تھی کہ شامو اُس کے سامنے انڈر گارمینٹ دھوئے تا کہ وہ ٹین ایج لڑکے کی فیلنگ کو انجوائے کر سکے۔ لیکن بہتر انجوائے مینٹ کے لئے وہ چاہتی تھی کہ شامو کی آنکھیں بھی کھُلی رہیں اور نتھنے بھی۔

لیکن دو تین دن کے بعد جب شامو کی حرکتوں میں کوئی تبدیل نظر نہیں آئی۔ ہمیشہ کی طرح اُن کپڑوں کو کونے میں رکھنے لگا تو شوبھا غصّے میں اندر داخل ہوئی۔

''کنارے کیوں کر رہے ہو۔''

''یہ سب ماں دھوئے گی۔''

''کیوں.........اور تم کیوں نہیں دھوؤ گے۔؟''

''پلیز! یہ سب دھونے مت دیجئے۔ مجھے اچھّا نہیں لگتا۔؟''

''کیوں اچھا نہیں لگتا.........؟''

''بس ایسے ہی.........؟''

''ایسے ہی کے بچّے.........'' ہاتھ مروڑتے ہوئے۔ تجھے ابھی اور اِسی وقت سب سے پہلے اِن کپڑوں کو دھونا ہوگا اور اِنہیں بالکونی میں بھی تم ہی ڈالو گے.........اور اگر اِنکار کیا تو سمجھو آج سے ہی تمہاری اور تمہاری ماں کی چھُٹّی۔ سمجھے.........''

تب تک کچن میں برتن دھو رہی ماں، مالکن کی آواز پر دوڑتے ہوئے باتھ روم کے پاس پہنچ گئی۔

''دیکھ لو ابھی سے اپنے بیٹے کا کارنامہ۔'' شوبھا اُسے دیکھتے ہی چلاّئی۔

''کیا ہوا ہے مالکن.........''

''کپڑے دھونے میں اِس کا دل نہیں لگ رہا ہے۔ اور اُوپر سے زبان درازی کرتا ہے۔ اگر دوسری بار غلطی کی تو اِس کی زبان تو کاٹوں گی ہی تمہیں بھی کام سے نکال دوں گی۔''

''نہیں نہیں مالکن.. ....میرا شامو ایسا نہیں ہے۔ وہ کیوں نہیں دھوئے گا کپڑے۔ ابھی میں بتاتی ہوں حرامی کے بچّے کو.........'' یہ کہہ کر وہ باتھ روم کے اندر گھس گئی اور مارنے لگی۔ ''حرام خور کون سا تیرے پیکڑ باپ نے مرنے سے پہلے خزانہ چھوڑا ہے کہ تم گھر بیٹھ کر کمائی کھاؤ۔ مالکن کا احسان مانو کہ اُس نے ہمیں کام پر رکھا اور تمہیں بھی.........

مالکن نے کل مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم نے ٹھیک سے کام کیا تو وہ تمہارے لئے دو جوڑے جینس اور ٹی شرٹ خرید کر لائے گی۔'' کہتے کہتے جب ماں کی نظر انڈر گارمینٹ پر پڑی تو ہاتھ رک گئے اور زبان گنگ ہوگئی۔ وہ فوراً باتھ روم سے باہر نکل آئی۔

شامو نے نوکری کے ڈر سے چپّی سادھ لی۔ ماں کے کچن میں جاتے ہی پہلے کی طرح ایک ہاتھ ناک پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے صابن لگانے لگا۔ اِس دوران اپنی بھیگی آنکھیں دوسری جانب موڑ رکھی تھیں۔ کچھ دیر تک شوبھا باہر سے اُسے دیکھتی رہی۔ دیکھتے دیکھتے اُس کے نچلے ہونٹ پر دانتوں کا دباؤ بڑھنے لگا۔ وہ باتھ روم کے اندر گھُس گئی۔ چہرے کو سامنے کرتے ہوئے بولی۔

''ارے اس طرح سے تو ٹھیک جگہ پر صابن بھی نہیں لگے گا۔''

اور پھر وہ اُس کے ہاتھ سے صابن لے کر اُسے کس طرح لگانا ہے بتانے لگی۔ اور یہ سب کچھ جس طرح سے اُس کے سامنے جھُک کر بتا رہی تھی۔ اُس سے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ بتا کم رہی ہے بلکہ کل کس کلر کا انڈر گارمینٹ دھونا ہے اُسے دکھا زیادہ رہی تھی۔ اِس کے بعد تو اُن کپڑوں سے اُسے اور بھی گھِن محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن مرتا کیا نہیں کرتا۔ مجبوراً ناک بند کرتا رہا۔ ہاں آنکھیں کھُلی ضرور رکھتا۔ تا کہ وہ جب بھی شوبھا کو باتھ روم میں آتے ہوئے دیکھے تو سنبھل جائے۔ کیسے صابن لگانا ہے یہ بتانے کے بہانے اُس کے ہاتھ کو صابن کے ساتھ کپڑے پر نہ گھمائے۔

اُس شام گھر پہنچ کر ماں بیٹے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ کئی بار شامو نے کچھ کہنے کی ہمّت جٹائی۔ لیکن سوچا کہ ماں جب باتھ روم گئی تھی تو یقیناً وہ کپڑے دیکھی ہوگی۔ پھر بھی اُنہوں نے مجھے مارا۔ اِس کا مطلب ہے کہ نوکروں کو اِس طرح کے کپڑے دھونے پڑتے ہیں.........اور ماں یہ سوچ رہی تھی کہ اچّھا ہوا کہ شامو کو نہیں معلوم ہوا کہ میں نے وہ کپڑے دیکھ لئے ہیں۔ اگر نہیں دھوئے تو مالکن اُسے بھی کام سے نکال دے گی اور کھانے کے لئے در در بھٹکنا ہوگا۔ اِس لئے مالکن کے ایسے کپڑے دھو دے تو کوئی بات نہیں.........ویسے میں اُس سے ذکر کروں اور وہ پوچھ لے کہ مالکن اُس سے ہی وہ کپڑے کیوں دُھلوانا چاہتی ہے تو اُس کے پاس کیا جواب ہوگا؟

اب وہ کپڑے ناک بند کر کے دھونے تو لگا تھا لیکن شوبھا کی خواہش تھی کہ اُس کی

بونھنو کے اندر کوئی ہلچل برپا کرے۔اور تحفے میں وہ اُسے جینس اور ٹی شرٹ لا کر دے۔ ....ناکامی کے باوجود اُس نے تحفے کی فہرست لمبی کر دی اور ساتھ میں ماں کے لئے بھی دوساڑی خرید لائی۔ماں کو ہدایت کی کہ اب سے شامو نئے کپڑوں میں کام پر آیا کرے۔

شامو اِس کے لئے تیاّر نہیں تھا،لیکن ماں کی ضد کے آگے جھُکنا پڑا۔جب مالکن نے برانڈیڈ کپڑوں میں شامو کو دیکھا تو وہ اپنے جذبات کو روک نہیں پائی۔

''مجھے معلوم تھا کہ اِن کپڑوں میں تم بہت ہینڈسم لگو گے۔میں بھی خوبصورتی کی قدردان ہوں۔اور مجھے امید ہے کہ تم بھی ہو گے۔؟ بولو میرا گفٹ کیسا لگا۔؟''

ماں پہلے کام پر آجاتی تھی۔شامو ڈاکٹر کپل کے کلینک جانے کے بعد آتا تھا۔اِس لئے جیسے ہی ماں کو لگا کہ شامو آیا ہے اور مالکن کچھ پوچھ رہی ہے تو وہ فوراً کچن سے باہر آ گئی اور بیٹے کو خاموش دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''مالکن اِسے کپڑے بہت پسند آئے۔میں نے پہن کر دِکھانے کے لئے کہا تو بولا کہ سب سے پہلے اپنی پیاری مالکن کو دکھاؤں گا،جنہوں نے اِتنے مہنگے کپڑے خرید کر دیئے۔''

ماں یہ کہتے ہوئے تیزی سے جب کچن کی طرف بڑھ گئی تو شوبھا نے اُسے ایک بار پھر اُوپر سے نیچے دیکھا اور کہا۔

''شامو!تمہیں کپڑے دھونے نہیں آتے ،لیکن پہنتے سلیقے سے ہو۔''

اچانک شوبھا کی نظریں اُس پالی تھین پر پڑ گئیں جسے وہ پیچھے چھپائے ہوئے تھا۔

''پالی تھین میں کیا ہے۔؟''

''جی کام والے کپڑے.........''

''بے وقوف کہیں کا۔پھینکو اِس پالی تھیں کو.........وہ ہاتھ سے پالی تھین چھیننے کی کوشش کی اور شامو مضبوطی سے اُسے پکڑے ہوئے تھا۔

''نہیں مالکن! مجھے اپنی اوقات معلوم ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باتھ روم میں

کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور پرانے کپڑے پہن لیتا ہے۔

پہلے تو شوبھا کو اُس کی اِس حرکت پر بہت غصّہ آتا ہے کیوں کہ وہ اُسے مارکیٹنگ کے بہانے کار سے باہر جانے والی تھی۔یہ سوچ کر کہ شامو کو گدّے دار سیٹ کا لُطف مل گیا تو وہ اکثر کار میں بیٹھنے کے سپنے دیکھنے لگے گا۔

لیکن ایسا ہوا نہیں.........

اور شوبھا کو دھکّا لگا۔لیکن جیسے ہر گیم کے دو تین پلان ہوتے ہیں کہ اگر ایک فیل ہو گیا تو دوسرے پلان پر عمل شروع ہو جاتا ہے۔

اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ شامو کپڑے پہن کر نہیں آیا تو وہ اُسے کسی دوسرے کام پر لگائے گی۔اُس نے آج قصداً ٹنکی کا آدھا پانی ضائع کر دیا تھا۔اور ماں کو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ آج پانی ٹنکی میں کم چڑھا ہے اس لئے خرچ کم کرنا۔احتیاطاً اسے دیکھ لینے کے لئے بھی کہا تھا۔''پانی بہت کم ہے۔''اور پھر شوبھا نے اُسی وقت یہ صاف کر دیا تھا کہ اتنے پانی میں کپڑے دھونے کا کام نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

31

بیڈروم اور دوسرا کام

قارئین!

جب وہ باتھ روم سے پُرانے کپڑے پہن کر نکلا تب شوبھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔''دھونے کے لئے کپڑے تو بہت ہیں لیکن ٹنکی میں پانی نہیں ہے۔''

پھر آنکھ مٹکاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اِس کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے؟ لیکن شامو جانتا ہے کہ وہ نوکر ہے اور ماں کی ہدایت کے مطابق جو بھی کام ملے اُسے کرنا ہی ہے۔

گرمی کے موسم میں پانی ختم ہونے سے جہاں لوگوں کے چہرے پر سوکھے کی ناراضگی جھلکنے لگتی ہے وہیں حیرت انگیز طور پر پانی کی عدم موجودگی ،شوبھا کی آنکھوں میں پانی جمع کر دیتا ہے، جس میں شامو کا چہرہ ہلکورے کھانے لگتا ہے۔

''لیکن میں نے تو جاتے جاتے ٹنکی فُل کر دیا تھا۔'' شامو ٹنکی کی طرف دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

''ارے کہیں سے لیک ہو گیا ہوگا۔'' شوبھا نے اِس طرح کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''تو مالکن میں چڑھ کر دیکھتا ہوں کہ کہیں پائپ وائپ تو نہیں کھُل گیا۔''

شوبھا کے برعکس شامو کی حیرانگی میں اب پریشانی گھُلنے لگی تھی کہ اگر کہیں سے لیک ہوا بھی ہوگا تو اُسے ہی ٹھیک کرنا پڑے گا اس لئے وہ اس وقت چڑھ کر ٹنکی دیکھ لینا چاہتا تھا۔

''ارے نہیں! تمہاری ماں نے دیکھ لیا ہے۔'' شوبھا کی آنکھوں کا پانی کچھ اور نیچے اُتر آیا تھا۔

''تو مالکن! ایسا کرتے ہیں کہ کسی پلمبر کو پکڑ لاتے ہیں۔ ورنہ آج جو پانی چڑھے گا وہ کل صبح تک چوُ جائے گا۔''

جب شامو نے مالکن کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ٹنکی کا سارا پانی مالکن کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔ لیکن اُس میں نہ کہنے کی ہمّت تھی اور نہ ہی اُس پانی کو دوبارا ٹنکی میں ڈالنے کی تاب تھی۔

''ایسا ہے کہ میرے جاننے والوں میں کئی کونٹریکٹر ہیں۔ فون کر دوں گی تو شام تک کوئی نہ کوئی ٹھیک کرنے آجائے گا۔ تمہیں اِس دھوپ میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

آنکھوں کا پانی کچھ اور نیچے اُتر آیا تھا۔ اور اب جو پانی نیچے اُترا تو اُس میں شیام سندر عرف شامو کو اپنا چہرہ تیرتا ہوا نظر آیا۔ کچھ دیر کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چہرے کو پانی سے نکال کر بھاگنے کی تاک میں لگ گیا۔

''تو پھر بیٹھنے سے اچھا ہے مالکن کہ کپڑے لے کر میں گھر چلا جاؤں۔ شام تک دھو دھا کر اور سکھا وکھا کر لے آؤں گا۔''

''تو اِس کا مطلب ہے کہ تم بیٹھنا نہیں کوئی کام کرنا چاہتے ہو؟''

''جی!'' شامو نے سوچا کہ کام بن گیا۔

''تو چلو پھر میں آج تمہیں کوئی دوسرا کام دیتی ہوں۔'' پانی سے بھری آنکھیں آئینے میں بدل چکی تھیں جس میں شامو کی تصویر اب صاف ہو کر اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

شامو اپنی تصویر کو دیکھتا رہا۔

''بولو کیسا رہے گا......... باہر گرمی ہے اور اندر اے سی۔'' پانی کے آئینے میں اُس کی تصویر ایک بار پھر ہلکورے کھانے لگی تھی۔

وہ کچھ نہیں بولا.........

''آؤ میرے ساتھ.........'' لہراتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔

اُس کے پیچھے چلتے ہوئے شاموسوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں مالکن کہاں لے جائے گی ۔؟ کون سا دوسرا کام دے گی.........؟ لیکن وہ وہاں سے سیدھے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ داخل ہونے سے پہلے مڑ کر شامو کی طرف دیکھا۔ شامو اب دروازے کا پاس پہنچ گیا تھا۔ اتنا خوبصورت بیڈ روم بھی ہوتا ہوگا اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ ٹی وی یا فلموں میں جو دیکھا تھا اُس کے بارے میں خیال تھا کہ سوٹنگ کے لئے خاص طور پر ویسا سیٹ تیار کیا جاتا ہوگا۔ لیکن یہاں وہ یہ سب کچھ اپنے سامنے دیکھ کر حیران تھا۔ اور بھلا کیوں نہ ہوتا کہ اِس سے قبل اُس نے کسی بڑے آدمی کے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اندر جانے کی ہمّت نہیں تھی۔ وہ دیر تک کمرے کو دیکھتا رہا۔

دیواروں میں کئی رنگوں کی آمیزش سے ایک ایسی دنیا کی تخلیق کی گئی تھی جہاں پہنچتے ہی انسانی جمالیات اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ رنگوں کے حُسن کو نکھارنے کے لئے فالس سیلینگ میں جگمگاتے بلب روشن تھے۔ جھومر کی دلکشی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ صوفہ سیٹ سینٹر ٹیبل، ٹی وی اور کمپیوٹر کمرے کی آرائش میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ سامنے شوکیش میں رکھے جوڑے کے لپٹنے کی مقناطیسی کشش ایسی تھی کہ ہر کسی کو اپنی طرف متوجّہ کر لیتی تھی۔ شوبھا جب بھی اُس کمرے میں کسی کو لے کر آتی تو مقصد ہوتا کہ اُس کی نظر خوبصورت جوڑے پر پڑے اور کام آسان ہو جائے۔ اگر اس سے بھی نہیں بنا تو وہ گدّے دار پلنگ پر لیٹ کر ریموٹ کا بٹن دبا دیتی تھی۔ اسکرین پر ویسے ہی جوڑے نمودار ہو جاتے تھے۔

شامو دروازے کے باہر سے ہی شوکیش کے جوڑے کو نہارنے میں مگن تھا۔ شوبھا نے جب اُس کے ٹین ایج حرکات وسکنات کا باریکی سے جائزہ لیا۔ پھر مالکانہ رعب جمانے کی کوشش کی۔ لیکن اس رعب میں بھی اپنائیت کی جھلک تھی۔

''وہاں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤ۔''

''جی مالکن میں یہیں ٹھیک ہوں ....آپ بس کام بتایئے۔؟'' شامو نے

شوکیش سے نظریں اس طرح چُرائیں جیسے چوری پکڑی گئی تو کٹگھرے میں اُسے ننگا کر دیا جائے گا۔ اِس لئے وہ اندر ہی اندر سہا ہوا تھا۔

''پہلا کام اندر آنے کا ہے۔ پھر دوسرا بتاؤں گی۔''

شوبھا کی آنکھوں کی گولیاں پانی سے دُھل کر اب اور بھی چمکیلی ہو گئی تھیں۔ اور اِن چمکیلی گولیوں کے ریٹینا پر جو تصویر بن رہی تھی اُسے شامو دیکھ تو رہا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کمرے میں آنے سے پہلے سوچا تھا کہ اُسے مالکن کے کمرے کی صفائی کرنی ہے۔ لیکن جب ہر طرف صفائی دیکھی تو سمجھ گیا کہ ماں نے آتے ہی صفائی کی ہوگی۔ اِس لئے ساری چیزیں قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔ پھر اُسے یہاں کیوں بلایا گیا.........؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شوبھا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے آئی۔

''تو اندر آنے سے کیوں ڈر رہا ہے رے۔؟''

''نہیں میں ڈر نہیں رہا۔ بس یہ دیکھ رہا ہوں کہ مالکن کا گھر کتنا سندر ہے۔'' اس نے اپنے ٹین ایج خوف پر شعوری طور پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

''صرف گھر یا مالکن بھی.........؟''

ایک ایسا سوال جس کا جواب شامو کے پاس تھا۔ لیکن وہ دینا نہیں چاہتا تھا ۔ مصلحتاً سر جھکا کر کھڑا رہا۔

''بدھو کہیں کے، تمہیں اتنا کہنے میں شرم آ رہی ہے کہ گھر کے ساتھ ساتھ مالکن بھی۔'' شوبھا نے ہولے سے کان پکڑ کر اُسے خوبصورتی کا نیا درس پڑھایا۔

وہ اِس بار بھی خاموش رہا۔

''دیکھو اِس وقت تمہارا گونگا پن مجھے اچھا لگ رہا۔ بس مجھے بہروں سے نفرت ہے.........تم جواب دو یا مت دو، لیکن بات سنو۔''

اِس کے بعد بھی وہ کچھ نہیں کہتا ہے تو وہ ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ کے پاس لے آتی ہے۔ لیٹتے ہوئے پاؤں اُس کی طرف بڑھا دیتی ہے۔

''بہت درد ہو رہا ہے تھوڑا دبا دو۔''

وہ بیڈ کے پاس کھڑا ہے اور گھٹنے سے اُوپر کھُلی ٹانگ ہاتھوں کے لمس کے انتظار میں بے تاب ہے۔ یہ سب دیکھ کر اُس کے دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب کسی عورت نے ٹانگ اُس کے سامنے اِس طرح آگے کیا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ اگر اِنکار کرتا ہے تو ماں ناراض ہوگی اور شوبھا اُس کے ساتھ اُنہیں بھی کام سے نکال دے گی۔ اگر ایسا ہوا تو گھر میں چولہا جلنا بند ہو جائے گا۔ فاقہ کسی کی نوبت آ جائے گی اور ماں اِس وجہ کہیں خودکشی نہ کرلے۔

وہ کچھ دیر اِسی ادھیڑ بُن میں رہا۔ پھر کسی طرح سے خود کو تیّار کیا اور کھڑے کھڑے کھُلی ٹانگ کی بجائے اُس ٹانگ کو جس پر اب بھی ساڑی کا پہرا تھا، ہمّت کر کے آہستہ آہستہ دبانے لگتا ہے۔ ایک عجیب سی لہر اندر دوڑ جاتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

''تم اندھے تو نہیں ہو۔ پھر اندھوں جیسی حرکت کیوں کر رہے ہو؟''

شوبھا کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ کوئی کھُلی ٹانگوں کی پیشکش کو اِس طرح سے ٹھکرا دے۔

وہ اِس بار بھی کچھ نہیں کہتا ہے۔

''ارے میری اِس ٹانگ میں درد ہے اور تم دبا اُس ٹانگ کو رہے ہو۔'' شوبھا نے ساڑی والی ٹانگ کو کھینچ کر ادھ کھلی ٹانگ کو سامنے کر دیا، اور اب ایسا کرنے میں پہلے سے بھی کچھ زیادہ حصہ ساڑی سے آزاد ہو گیا۔

''مالکن! میری بات کا بُرا مت مانئے گا۔'' اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میں ماں کے پاؤں بھی اُوپر سے ہی دباتا ہوں۔''

''میں تمہاری ماں نہیں۔ مالکن ہوں۔ پاؤں اگر کپڑے کے اُوپر سے دباؤ گے تو پھر کیا تیل کپڑے پر لگاؤ گے۔''

''تیل.........'' حلق کے اندر سے یکا یک آواز جیسے باہر نکلی ہو۔

''ہاں ہاں! پیر دبوانے کے بعد ہر روز مالش کی عادت ہے مجھے۔'' یہ بات اِس طرح کہی جیسے منہ دھونے اور کھانے کی طرح یہ عمل بھی معمول کا حصّہ ہو۔

وہ بیڈ سے تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ سی ہونے لگی۔ ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہاں سے سیدھے باہر بھاگ جائے۔ لیکن ماں کا چہرہ سامنے آ گیا۔

''تم مالش کے نام سے پیچھے ہٹ رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں کیا بلا ہوں۔''

شوبھا اِس بات کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی کہ اُس کی ٹانگیں کھلی ہوں اور نوکر کی ہمّت کہ وہ دبانے سے اِنکار کر دے۔ ہاتھ پکڑ کر بیڈ کی طرف کھینچ لیتی ہے اور پاس ہی رکھی تیل کی شیشی بڑھا دیتی ہے۔ شامو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ شوبھا کا غصّہ آسمان کو چھونے لگتا ہے۔ وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی تلملا اُٹھتی ہے۔

''تمہیں ہر حال میں مالش کرنا ہوگی۔'' شوبھا گھوم کر دروازے کی طرف آ جاتی ہے تا کہ وہ باہر نہیں نکل سکے۔

''نہیں، میں مالش نہیں کر سکتا۔'' خوف کے مارے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

شوبھا غصّے میں آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے اُس کی خوبصورتی کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ نوکر ہو کر جس طرح سے ٹھکرایا تھا، اُسے وہ اپنی خوبصورتی کی توہین سمجھ رہی تھی۔ اِس لئے بدلے میں وہ بال پکڑ کر تھپڑ کی برسات کر دیتی ہے۔

شامو کی ماں کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ مالکن کے چلّانے اور شامو کے رونے کی ملی جلی آوازیں سُنیں تو وہ دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم پار کر کے بیڈ روم میں پہنچ گئی اور شامو کو چھُڑانے لگی۔

''مالکن چھوڑ دیجئے مالکن ۔مت ماریئے مالکن ۔''

شاموکی ماں میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ وہ شوبھا سے یہ پوچھتی کہ اُسے کیوں مار رہی ہیں ۔

''چل آج تیرے کہنے پر چھوڑ دیتی ہوں حرامی کے پلّے کو۔'' بال پکڑے پکڑے ماں کی طرف دھکیل دیا۔ پھر چلاّتے ہوئے بولی۔''اِس کو سمجھا دینا کہ جب بھی ہم کوئی کام کہیں تو اِنکار نہیں کرے۔''

''کس کام سے منع کیا ہے مالکن.........'' ماں نے شاموکو بانہوں میں بھر لیا تھا۔

''میں ذرا سا پاؤں دبانے اور مالش کرنے کیا بولی کہ اِس دوفُٹ کے چھوکرے نے صاف اِنکار کر دیا۔'' شوبھا نے مالکانہ رُتبہ دکھاتے ہوئے شاموکو حقارت بھری نظروں سے دیکھا۔

''بس اتنی چھوٹی سی بات پر آپ مار رہی ہیں مالکن۔ مجھے کہا ہوتا ۔ میں دبا دیتی۔'' ماں حیران تھی۔

''کیا کہا.........؟'' شوبھا نے غصّے سے دیکھا۔

''نہیں مالکن! کچھ نہیں، غلطی ہوگئی۔ اب سے ایسی بات نہیں کروں گی اور وہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔'' خوف کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

''اور تمہارا بیٹا۔؟'' گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا بیٹا..........میرا بیٹا بہت آگیا کاری ہے مالکن.........بس آپ ایک موقع اور دیں.........'' ماں نے گڑگڑاتے ہوئے ہاتھ جوڑ لئے۔ پھر بیٹے کا کان مروڑتے ہوئے بولی۔''کیوں رے! بات سُنئے گا نہ تو اب سے مالکن کا.........؟''

''ماں پہلے تم میرے کان تو چھوڑو ....کان چھوڑو ماں .... کان چھوڑو.........نہیں تو میں مرجاؤں گا۔'' شامو درد سے بلبلا رہا تھا۔

''تو جب تک ہاں نہیں کرے گا تب تک میں نہیں چھوڑو گی حرامی۔''

''مالکن.........مجھے بچاؤ مالکن!''

شوبھا بڑھ کر ماں سے اِس طرح چھڑاتی ہے جیسے بہُت بڑی ہمدرد ہو۔ پھر پیار سے اُس کے بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھوں کی کنگھی سے درست کرتی ہے۔ یہ ادا بھی شاموکو اچھّی نہیں لگتی ہے۔لیکن مرتا کیا نہیں کرتا۔ اگر ہاتھوں کو جھٹک دیتا تو پھر ماں کے قبضے میں اُس کی روح ہوتی۔ اور 'مالکن بچاؤ' نہیں کہتا تو ماں اب تک کان اُکھاڑ چکی ہوتی۔

شامو مالکن کی بات ماننے کے لئے تیّار ہو گیا تھا۔لیکن اِس کے بعد بھی کپڑے دھونے، پیر دبانے، یا مالش کرنے میں اکثر وہ آنا کانی کرتا اور شوبھا کی مار کھاتا..........ماں اُسے بچانے کے لئے آگے آتی کہ لاؤ کپڑے میں دھو دیتی ہوں۔ مالش کر دیتی ہوں۔لیکن شوبھا ایک نہیں سنتی۔ دھکّے مار کر اُسے باہر کر دیتی اور شامو سے وہ سارے کام زبردستی کرواتی۔ انڈر گارمینٹ دُھلواتی۔ پیر دبواتی۔ مالش کرواتی۔ اور ہر بار دھمکانے کے ساتھ ماں کو نصیحت کرتی۔

''نوکر ہو کر اگر ابھی سے یہ سب کی عادت نہیں رہی تو پھر جوان ہو کر کیا کرے گا.........؟ اِس لئے ذرا سمجھاؤ اپنے بیٹے کو۔ ورنہ اُس کی وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گی''

☆☆☆

32

ناظرین، ووٹنگ سسٹم اور جج صاحبان

قارئین!

''انڈر سکسٹین سُپر ڈانسنگ ریئلیٹی شو'' کا موڈیول پچیس ہفتے کے لئے ڈیزائن کیا گیا تھا۔

بیس ہفتے تک پہنچتے پہنچتے اُس کا TRP چھوٹے پردے کے آسمان کو چھونے لگا۔ پوری دنیا کی نظریں اِس شو پر گڑی ہوئی تھیں۔ آخری پانچ ہفتے کے لئے جو ووٹنگ سسٹم تھا وہ مختلف تھا۔ پہلے سو میں سے پچاس مارکس جج صاحبان کے اختیار میں تھے اور اس کے دیئے ہوئے مارکس کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔لیکن اِس پانچ میں سے شروعات کے دو ہفتوں کے لئے جج صاحبان کے پاس اختیاری نمبر صرف پچیس رہ گئے تھے۔ اور آخر کے تین ہفتوں میں ججیز کے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ اختیاری مارکس اُن سے واپس لے لئے گئے تھے۔ اب سو میں سے سو نمبر پبلک ووٹنگ پر منحصر تھا۔لیکن اگر پبلک ووٹنگ ٹائی ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں جس کے حق میں دو جج صاحبان اپنے خاص ووٹ کا استعمال کریں گے، اُسے دوسرے پر فوقیت دی جائے گی اور یہ مرحلہ اکیسویں سے پچیسویں ہفتے کے درمیان کبھی بھی آ سکتا تھا۔

اِس ٹائی بریکر سسٹم کی ضرورت جیت ہار کے لئے ہوگی۔ یہ ناظرین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنی اپنی پسند کے ڈانسر کے متعلّق یہی قیاس آرائی کر رہے تھے کہ جہاں کروڑوں کروڑ لوگ ووٹ کریں گے وہاں جیت ہار کا فاصلہ لاکھوں اور کروڑوں میں ہوگا۔

بیس ہفتے تک ووٹنگ لائن پر تینوں ججیز کی پوری نظر تھی۔

تینوں نے ہمیشہ ہی بدل بدل کر پریتی کو اِس طرح لڑتے جھگڑتے ڈرامائی انداز میں فُل مارکس دیئے تا کہ ناظرین کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے اور جب بھی وہ ووٹنگ کے لئے موبائل پر بٹن دبائے تو خود بخود اُس کے سامنے پریتی آ جائے۔ گرین روم میں تینوں نے یہ اقرار بھی کیا کہ اُن کے ڈراموں نے پرفارمینس سے زیادہ ناظرین کے دلوں پر اثر ڈالا ہے۔لیکن اِس ہفتے اتنی ووٹنگ نہیں ہوئی کہ وہ محفوظ رہ پاتی۔

لیکن پریتی محفوظ تھی۔

شو بھا نے اُسے کبھی ڈینجر زون میں جانے نہیں دیا۔ جب بھی ایسے مواقع آئے تو خوبصورت نوٹوں سے اختیاری نمبر خرید کر زینہ بہ زینہ آگے بڑھانے کا کام کیا جو دوسری ممّیوں کے بس میں نہیں تھا۔

لیکن پریتی نے سکنڈ راؤنڈ میں جیسے ہی قدم رکھا، پچیس اختیاری نمبر ججیز کے ہاتھ سے پھسل گئے۔لیکن پھسلتے پھسلتے بھی پورے بچے ہوئے پچھتّر نمبر ججیز نے بڑی ہی صفائی سے پریتی کی ڈانسنگ جھولی میں گرا دیئے۔لیکن مفت میں ملے اِس نمبر کو جوڑنے کے باوجود اُس کا مجموعی نمبر ماسٹر اکرم خان کے نمبر سے ٹیلی کر گیا۔

نیم عریاں لباس میں ایک بار پھر حسینہ پنکھڑی ٹانگوں کی نمائش کرتے ہوئے منچ پر آئی اور ناظرین کو آواز کی ریشمی ڈور میں باندھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ڈانس کے اِس منچ پر آج یہ پہلا موقع ہے جب سکنڈ راؤنڈ میں مستقبل کے دو ڈانسنگ اِسٹار کی مارک شیٹ ٹیلی ہو گئی۔ قانون کے مطابق ناظرین کو اب دیکھنا یہ ہے کہ تین ججیز میں سے دو ججیز کا فیصلہ کس کے حق میں جاتا ہے۔ سامنے جو بڑا سا اسکرین ہے اُس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف پریتی سنگھ کا نام لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف اکرم خان کا۔''

جلوے بکھیرتی پنکھڑی بیچ میں نمودار ہو کر دونوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتی ہے۔

''ناظرین! دونوں نے اپنے اپنے دھماکے دار پرفارمینس سے ہمارے دلوں کو جیتا ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے آج ڈانسنگ منچ کی اِس ٹائی پر ججیز اپنے وشیس ادھیکار سے

کسے جیت کے دروازے تک پہنچاتے ہیں۔ویسے میں نے گیس کر لیا ہے۔لیکن تھوڑا بہت آپ بھی گیس کریں۔اور جب تک آپ گیس کریں گے تب تک آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ ججیز کے ووٹس کونفیڈینشیئل ہیں۔کس نے کس کے حق میں ووٹ دیا یہ ناظرین کو معلوم نہیں ہوگا۔کنٹروورسیز سے بچنے کے لئے ہی اس قانون کو لاگو کیا گیا ہے۔''

پھر تینوں ججیز کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے ۔''ویسے ہمارے تینوں ججیز کی ایمانداری پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔کیوں کہ اُن کی شخصیّت پہلے ہی دن سے سب کے سامنے آئینے کی صاف ہے۔''

''تو اب شروع ہوتا ہے ووٹنگ کا وقت.........''

''ناظرین!اب آپ سب اپنے دل کو تھام لیں اور اپنی اپنی آنکھوں کو نکال کر اسکرین پر رکھ دیں.........جیسے ہی ججیز کے دو ووٹس اسکرین سے ٹکرائیں گے،اُس کا نام ہائی لائٹ ہو کر خود بخود جگمگانے لگے گا۔

اناؤنسر پنکھڑی کی بات ختم ہوتے ہی اسکرین پر تین ووٹس گرتے ہیں۔

پہلے دونوں کے نام کے سامنے ایک ایک ووٹ جھلملاتا ہے۔

پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد تیسرا ووٹ بھی اسکرین پر مسکرانے لگتا ہے۔

ناظرین اسکرین سے چپکے ہوئے تھے۔کچھ کے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھے ہوئے تھے اور کچھ نے پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

دل کی دھڑکنیں سب کی تیز تھیں۔

اسکرین پر تینوں ووٹس پڑتے ہی یکا یک دُعا والے ہاتھ نیچے گر گئے۔چہرے پر پژمردگی چھا گئی۔

ہاتھ جوڑے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

اِس کے ساتھ نیم عریاں لباس والی اناؤنسر کی چہکار گونجی۔

''ناظرین!اِس طرح ٹائی بریکر میں پریتی سنگھ ایک کے مقابلے دو ووٹوں سے

ماسٹر اکرم خان پر جیت درج کر کے فائنل پانچ کنٹسٹینٹ میں جگہ بنا پانے میں کامیاب رہی ہیں۔مجھے بھی کچھ ایسے ہی ریزلٹ کی اُمیّد تھی۔اور مجھے اُمیّد ہے میری طرح آپ میں سے بہت سارے ناظرین نے یہی گیس کیا ہوگا۔''

''پریتی تمہیں بہت بہت مبارک ہو کہ اب تم فائنل کی دوڑ میں شامل ہو گئی ہو ۔اِس وقت تمہیں کیسا لگ رہا ہے۔''

''اچھا لگ رہا ہے۔لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اکرم خان سے جیت پاؤں گی۔اکرم خان بہت بہترین ڈانسر ہے۔''

اکرم خان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔پریتی اُس سے لپٹ جاتی ہے۔ تسلّی دیتی ہے۔چاہنے والوں کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

☆

پریتی فائنل پانچ کنٹسٹینٹ میں پہنچ چکی تھی۔اِس خوشی کے موقع پر اُس رات شوبھا نے شہر کے سب سے مہنگے ریستوراں میں پارٹی دی۔

پارٹی کا اہتمام صرف تینوں ججیز کو خوش کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔کھانے کے بعد پینے کا بھی دور چلا۔انگوری نسل کی بلیک شہزادی جب سر پر چڑھ بیٹھی تب سینئر جج کے ہونٹوں سے شراب کی بو لفظوں میں بدل کر باہر نکلنے لگی۔

''شوبھا جی!ہم لوگوں نے تو آپ کے لئے وہ کیا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا ....''پھر اُنہوں نے دونوں ججیز کی طرف دیکھا اور اپنے دانت نکال دیئے۔''اکرم خان کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہم تینوں نے ووٹنگ مشین میں بھی چھیڑ چھاڑ کی......... ووٹنگ لائن بند ہونے سے پانچ منٹ قبل تک پریتی کو پچاس ہزار ووٹس سے آگے کر دیا تھا۔لیکن آخری کے پانچ منٹ میں اُسے جتنے ووٹ ملے اِس سے آپ اندازہ لگا لیں کہ اگر مشین میں چھیڑ چھاڑ نہیں کی جاتی تو اکرم خان کتنے ووٹوں سے جیتتا..........؟ لاکھوں ووٹوں کو کم کرنے اور لاکھ لاکھ ووٹس بڑھانے کے بدلے آپ نے جو بھی کیا وہ کم ہے شوبھا

جی! سینئیر جج رونق افروز نے سوال شوبھا کی طرف اُچھال کر اُس کے اندر تلاطُم پیدا کر دیا تھا۔

سینئیر جج صاحب خوش تو تھے لیکن وہ اِس سے زیادہ کے متمنّی تھے۔ کیوں کہ اِس کھیل میں اُنہوں نے سینئیر جج کی عزّت و ناموس کو بھی داؤں پر لگا دیا تھا۔ اِس لئے وہ اِس کے علاوہ کچھ اور چاہتے تھے۔

''کم ....وہ کیسے؟''

شوبھا ویسے جانتی تھی کہ پریتی کو یہاں تک پہنچانے میں ججیز نے جو کیا ہے وہ بہت ہے۔ لیکن پھر بھی اُس نے جاننے کی کوشش کی تا کہ یہ شکایت آگے چل کر پریتی کے پاؤں کی زنجیر نہ بن جائے۔

''وہ ایسے کہ جتنا چینی ڈالیں گی اُتنا میٹھا ہوگا شوبھا جی! .... پہلے ہی ہم لوگوں نے آپ کا سارا قرض وصول کر دیا ہے۔ اور اب نئے سرے سے عمارت کی تعمیر ہونی ہے۔ قرض تو لینا ہی ہوگا۔ ویسے سینکشن تو آپ ہی کریں گی۔ لیکن اِس بار ٹرانسفر پریتی کے اکاونٹ سے ہوگا......... آپ سمجھ رہی ہیں نہ شوبھا جی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' سینئیر جج نے بہکے بہکے انداز میں ہی سہی لیکن سمجھانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' شوبھا پہلے تو کچھ حیران ہوئی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ لیکن آپ کو سمجھنا چاہئے سینئیر جج صاحب! کہ ابھی ابھی تو اس کا ٹین ایج اکاونٹ کھلا ہے۔ کچھ ٹرانسفر لائق جمع ہو جائے تو پھر آپ جب چاہیں کھاتے میں شفٹ کروالیں۔''

''شوبھا جی یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔'' دوسرے جج نے چشمے کے اُوپر سے جھانکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''فرسٹ ڈے ہی ہم لوگوں نے سیف موڈ میں کلِک کر کے اوپننگ اکاؤنٹ بیلنس چیک کر لیا ہے۔ ریہرسل کے دوران بھی کچھ نہ کچھ ڈیپوزٹ ہوتا رہا ہے.........اب وہ اتنی بھی چھوٹی نہیں ہے جتنی آپ سوچ رہی ہیں شوبھا جی ....!''

اِس سے پہلے کہ شوبھا کچھ کہتی۔ تیسرے جج کے منہ سے سونے کا ایک دانت باہر آ گیا۔

''بُرا مت ماننا شوبھا جی! آج کا زمانہ نینوٹکنالوجی کا ہے۔ ہر چیز چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اور جو چیز جتنی چھوٹی ہو رہی ہے لوگ اُسے اتنا زیادہ پسند کر رہے ہیں ....'' پھر مسکراتے ہوئے طنز بھرے انداز میں اپنی باتوں کی کڑی کو جوڑنے کی کوشش کی۔

''ٹھیک اُسی طرح مردوں کی خصلت بھی بدلی ہے۔ جسے بدلنے میں آپ جیسی موڈرن ماؤں کا بڑا رول ہے جو جیتنے کی خواہش میں ٹین ایج ڈنر کروانے سے پرہیز نہیں کرتیں.......... اور اب جب عادت خراب ہو چکی ہے تو ہمیں خراب عادت ہی اچھّی لگنے لگی ہے ....بس آپ 'ہاں' کر دیں۔ باقی ہم لوگ سنبھال لیں گے۔''

''دیکھئے میں تو ماں ہوں اور آپ سب تو اُس کے جج ہیں۔'' شوبھا نے ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ پھر آگے کہا۔ ''جب آپ لوگوں نے ڈانس پریکٹس میں ہی جج کر لیا ہے کہ وہ آپ کے کام آ سکتی ہے تو باقی آپ لوگوں کی مرضی .... ویسے لڑکیاں بڑی ہی اِس کام کے لئے ہوتی ہیں۔''

جیت کی چاہت میں کہنے کے لئے تو اُس نے کہہ دیا۔ لیکن وہ تینوں مسٹنڈوں کو جسم کے ترازو پر کئی بار تول چکی تھی۔ اِس لئے کس کا کتنا وزن ہے وہ واقف تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ چھوٹے ترازو پر اگر ستّر اسّی کیلو وزن کا بٹکھرا باری باری سے رکھا گیا تو پھر ترازو بیچ سے ہی ٹوٹ جائے گی؟ لیکن اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود اُس نے عیش وعشرت کا چشمہ آنکھوں سے نہیں اُتارا کہ کروڑوں کی رنگین دنیا ایک پل میں خاک ہو جائے گی۔

''دیکھا سالے میں نے کہا تھا نا کہ شوبھا جی بہت سمجھ دار ہیں۔ ہم لوگوں کے پاس فائنل پریکٹس کے لئے پریتی کو ضرور بھیجیں گی۔'' سینئیر جج نے اپنی باتوں پر صداقت کی مہر لگاتے ہوئے اپنی بتّیسی باہر کر دی۔

''میں نے کب کہا تھا۔ وہ تو اِس نے کہا تھا'' دوسرے جج نے تیسرے جج کی طرف اشارہ کیا۔

پھر شروع ہوئی فائنل پریکٹس کی تیاری۔

اور جب فائنل پریکٹس کے لئے تینوں ججیز لگ گئے تو پھر جیت بھی پریتی کی ہی ہونی تھی۔

لیکن دوسرے ہفتے بازی پلٹ گئی۔

ڈانسنگ بساط پر جب شوبھا تینوں مہروں کو بڑی چالاکی سے جیت کے خانے میں رکھ رہی تھی تو نشے کے زوم میں ایک چال سیدھی پڑتے پڑتے اُلٹی ہوگئی.........یہی وجہ ہے کہ دوسرے ہفتے کی ووٹنگ سے قبل اُس پارٹی کی بھنک اور ووٹنگ مشین سے چھیڑ چھاڑ ہونے کا شک چینل کے مالک کو ہوگیا۔

پھر کیا تھا: چینل آنر نے خفیہ طریقے سے ایک دوسری پیرالل ووٹنگ مشین اپنے چیمبر میں لگوالی اور خود اُس کے نگراں بن گئے۔ کمپیوٹر آپریٹر کی سینیئر جج سے سانٹھ گانٹھ تو تھی ہی اِس لئے اُس نے چُپ سے یہ بات اُنہیں بتادی۔

اِس طرح آنے والا ہفتہ صرف پبلک ووٹنگ پر منحصر تھا۔

سینیئر جج کے ہاتھوں کا جادو جب کسی طرح نہیں چل پایا تو پھر ہونا کیا تھا: پانچوں کنٹسٹینٹ میں پریتی کو سب سے کم ووٹ ملا۔

جب ریزلٹ اناؤنس ہوا تب شوبھا کا چہرہ دیکھنے لائق تھا جیسے زندگی بھر جیتنے والا سب سے اہم جنگ ہار گیا ہو۔ اور ہار بھی ایسی جب اُس کی دعویداری سب سے مضبوط رہی ہو۔ پریتی کو داؤں پر لگا کر اُس نے سوچا تھا کہ اب جیت پکّی ہوچکی ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ وقت کبھی کبھی وہ داؤں بھی چل دیتا ہے جس کے بارے میں کسی نے سوچا نہیں ہوتا ہے۔

اگر وہ سوچتی تو کبھی فائنل پریکٹس کے لئے لگاتار تین دن تک گھنٹوں الگ الگ ججیز کے پاس نہیں بھیجتی۔ زیادہ پریکٹس سے اُس کی کمر اور ٹانگوں پر بُرا اثر پڑا تھا۔ اِس لئے ڈانسنگ فلور پر وہ اپنے ٹیلینٹ کی مناسبت سے پرفارمینس نہیں دکھا پائی جس کی امیّد اُس سے کی جاسکتی تھی۔ لیکن شوبھا کو اِس کے بعد بھی امیّد تھی کہ سب کچھ لاسٹ پانچ منٹ میں ٹھیک

ہو جائے گا۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔

کیوں کہ اِس بار او ڈینس بھی باخبر تھی۔

چینل والے بھی ڈبل ووٹنگ مشین لگا چکے تھے۔

سرکاری نظر بھی کچھ پینی ہوگئی تھی۔ کیوں کہ ان کے دفتروں میں بھی ریزلٹ کو لے کر چہ میگوئیاں شروع تھیں۔

اس لئے کہیں بھی کچھ ہونے کا سوال نہیں تھا۔

☆

پریتی کے ایلیمینیٹ ہوتے ہی دوا کے زور پر کام کرنے کے مُضر اثرات نے اپنے رنگ دکھانے شروع کردیئے اِس لئے راتوں رات پریتی کو ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں بھرتی کرنا پڑا۔

''اپنا نرسنگ ہوم'' کی ہیڈ لیڈی ڈاکٹر آرتی نے پریتی کے معائینے کی رپورٹ دیکھنے کے بعد شوبھا کو ہمدردانہ ہدایت کی کہ ''بھلے ہی وقت کی دواؤں نے اُسے جسمانی طور پر جوان کردیا ہو لیکن آپ ماں ہیں اِس لئے اب سے اِس بات کا خیال رکھیں کہ کچھ چیزیں میچیوریٹی کے بعد ہی اچھّی ہوتی ہیں.........فی الحال اُسے دو تین ماہ پوری طرح ریسٹ دیں۔ اور اگر اِس بیچ ایسا ویسا کچھ بھی ہوا تو اُس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔''

جب بھی کسی کی جان خطرے میں پڑتی، سینیئر جج اُسے ''اپنا نرسنگ ہوم'' ریفر کردیتے۔ جہاں بہت ہی پرائیویسی کے ساتھ مفت میں علاج ہوتا۔ اِس علاج کی ایکسپرٹ تھیں سینیئر جج رونق افروز کی معشوقہ۔ مسیز آرتی جو نرسنگ ہوم کی مالک تھی۔ بغیر رجسٹر میں نام درج کئے علاج کرتیں۔ دوا اور بیڈ چارج کے ساتھ پتی سے الگ رہنے کی فیس یک مشت وصول کیا کرتیں۔

☆☆☆

33

سینہ، ناف، کمر اور فیتہ

قارئین!

فائنل پریکٹس کو دو ماہ ہو گئے تھے۔

اِن دو مہینوں میں پریتی کی خوبصورتی لوٹ آئی تھی۔شوبھا جو اُس کی خوبصورتی کو لے کر فکر مند تھی اب اُس کی آنکھوں میں بھی اُمیّد کروٹیں بدلنے لگی تھی۔ایک دن کروٹ بدلتی آنکھیں فکر کے بستر سے اُٹھ بیٹھیں اور انگڑائیاں لینے لگیں۔انگڑائیاں لیتی اِن آنکھوں نے جب پریتی کو دیکھا تو اُس کے اندر ہلچل سی پیدا ہو گئی۔وہ خوبصورتی کو کیش کرانے کے لئے ایک بار پھر بے چین سی ہو گئی۔

اور پھر ایک دن بے چین شوبھا پریتی کو لے کر ماڈلنگ اسکول پہنچ گئی۔سر پرستوں میں منتری جی بھی شامل تھے۔داخلے کے لئے خود آ گئے تو بھلا شوبھا کو کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔

اِس طرح پریتی کے لئے ماڈلنگ کی راہیں آسان ہو گئیں۔

اُن دنوں شوبھا کے پسندیدہ چینلوں میں ایم ٹی وی، وی ٹی وی اور ایف ٹی وی جیسے کئی ایڈلٹ چینل شامل ہو گئے تھے۔وہ صبح سے شام تک ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتی۔یہ سب اس لئے کہ اب ماڈلنگ کی مقناطیسی کشش اُسے اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔اِس میں اُنہیں پیسہ نظر آ رہا تھا اور شہرت بھی۔اور آگے بڑھنے کے راستے بھی۔

رات کے وقت اسپیشل شو دیکھنے کے دوران شوبھا خود کو ایسے راستے پر چلتے ہوئے دیکھتی، جہاں اُس کے ساتھ ساتھ پریتی چل رہی ہوتی۔ریمپ پر چلتے چلتے وہ وہاں پہنچ جاتی، جہاں دونوں طرف کے لوگ متوالی چال دیکھنے کی چاہت میں اپنی آنکھیں پھاڑے ہوئے ہوتے۔کیٹ واک کرتی ادھ ننگی لڑکیوں کی اس قطار میں شوبھا اپنی پریتی کو بھی ویسی ہی متوالی چال چلتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔اور پھر یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ ایسے میں ریمپ

کے دونوں جانب بیٹھے لوگوں کے ہوش کا عالم کیا ہوتا ہے۔

ایسی جوانی بھی کس کام کی کہ ججیز کو مدہوش نہ کر دے۔

اِس خواہش میں شوبھا نے پریتی کو خود بھی ٹرینڈ کرنا شروع کیا۔اِس ٹریننگ میں اُس نے کچھ خاص پہلوؤں پر زور دیا۔کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ریمپ کے دونوں جانب بیٹھے لوگوں کو کیا چاہئے.........؟لوگوں کی آنکھیں کہاں کہاں ہوتی ہیں..........؟

شوبھا نے اپنی مخصوص ٹریننگ کے پہلے ہی دن پریتی کو سمجھایا۔

''دیکھو بیٹا! ماڈلنگ کی دنیا میں کامیابی اُسی کو ملتی ہے جو عقل سے کام لیتا ہے۔اِس لئے میری ایک بات ذہن نشیں کر لو کہ ریمپ پر جب بھی اُترو تو چال ایسی ہو جیسے کسی الہڑ حسینہ کو پہلی بار کسی نے شراب میں نہلا کر بوتل گلے میں ڈال دی ہو۔اُس کی پلکوں میں ایسی خماری ہو.........اُس کی کمر میں ایسا لوچ ہو.........اُس کے سینے میں کمان کی وہ تان ہو.........انگ انگ سے جوانی کی ایسی خوشبو پھوٹ رہی ہو کہ دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں مدہوش ہو جائے۔''

شوبھا نے یہ کہتے ہوئے خود کو الہڑ حسینہ کا رول ماڈل بنایا۔پلکوں میں خماری، کمر میں لوچ اور سینے کے کمان کو اِن اداؤں سے پیش کیا کہ پریتی بھی شرما گئی۔

''دیکھو بیٹا یہ وقت شرمانے کا نہیں ہے۔اگر تم نے حُسن کے ساتھ اپنی نوخیز جوانی کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا۔سینہ، ناف، کمر اور ٹانگوں کی نمائش کرنے میں ناکام رہی تو کل ماڈلنگ کی دنیا تمہیں دودھ میں سے مکھّی کی طرح نکال باہر کرے گی۔لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہر جگہ تمہارا راج ہو تا کہ مجھے ایک خوبصورت ماڈل کی ماں بننے میں فخر محسوس ہو۔''

اور جب پریتی نے ریمپ کے لئے پریکٹس کی اور پہلی بار ماں کو کیٹ واک کر کے دکھایا تو اُس نے چال کی جم کر تعریف کی اور ساتھ میں کچھ ٹپس بھی دیئے۔

''بیٹا چال تو تیری واقعی قیامت ہے۔بس نیچے سے کپڑے تھوڑے اور اُوپر اٹھا لو۔اور اُوپر کے بٹن ایک دو زیادہ بھی کھل جائیں تو کوئی بات نہیں۔نمبر اِسی کے تو ملتے ہیں۔

سب کچھ چھُپا رہ گیا تو بے چارے جہیز کیا دیکھیں گے..........؟ نمبر کہاں دیں گے........؟ اس لئے سینے کی ہارڈ کاپی جہیز کے سامنے رکھو۔ تاکہ نمبر دیتے وقت اُنہیں جگہ کی تنگی کا ذرا بھی احساس نہ ہو۔''

اِس احساس کے ساتھ جہاں شوبھا ہر روز اُسے کیٹ واک کرواتی، وہیں ماڈلنگ اسکول کے درجنوں مرد فٹنس ٹرینر پریتی کی خوبصورتی اُبھارنے میں تندہی سے جٹے ہوئے نظر آتے۔ وہاں اُسے صبح وشام ٹرائل سے گذرنا پڑتا۔ سینہ ناف کمر اور نہ جانے کس کس چیز کی ناپ لی جاتی.........؟ کبھی کبھی شوبھا بھی فیتہ لے کر بیٹھ جاتی۔ کپڑے اُتارنے کے لئے کہتی۔

''نہیں ماں! میں کپڑے نہیں اُتاروں گی۔''

وہ شرماتے ہوئے اپنے سینے کے سامنے دونوں ہاتھوں سے کراس بنا لیتی اور دونوں کندھے کو ہاتھوں سے کس کر پکڑ لیتی۔ شوبھا گدگدانے لگتی۔ ہاتھوں کی گرفت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتی اور جب اِس کوشش میں کامیاب ہو جاتی تو وہ اُس کے ٹائٹ فٹنگ ٹاپ کو نیچے سے پکڑ کر کندھے سے اُوپر کھینچ لیتی۔ پھر اس کے بعد شروع ہوتا جسم کے ایک ایک حصے کی تسلّی بخش پیائش۔ تاکہ نمائش کے دن حُسن کے نشیب وفراز میں فیتے کا نمبر کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔

بتّیس، چوبیس، بتیس کا آئیڈیل فریم سامنے تھا۔

شوبھا اِس فریم میں پریتی کے سینہ، ناف اور کمر کو کاپی کر کے وقت کے اسکرین پر اِس طرح پیسٹ کرنا چاہتی تھی تاکہ دنیا کے سبھی کمپیوٹر پر یمی اُس کی تصویر کو ڈیسک ٹاپ پر سیو کر کے پسندیدگی کی مہر لگا سکیں۔

کاپی، کٹ، پیسٹ اور سیو کا عمل جاری تھا۔

ایک سروے کے مطابق پریتی کی کچھ تصویریں ایسی تھیں جسے سب سے زیادہ نیٹ پر سرچ کیا گیا۔

یہ تصویریں نئی نسل کی دھڑکنوں میں بسنے لگیں۔ بیڈروم میں سجنے لگیں۔ اسکرین سیور میں جگہ پانے لگیں۔ میل کی جانے لگیں.........اور خوابوں کے راستے رات کے شبابی بستر بھگونے لگیں۔

☆

شوبھا کی حرکتوں کو دیکھنے سے اب ایسا لگتا تھا کہ ایک ماں خود اپنی بیٹی پر عاشق ہو گئی ہے۔ وہ اکثر راہ چلتے چوم لیتی تھی۔ کار میں بیٹھے بیٹھے گود میں کھینچ لیتی تھی۔ گھنٹوں نہارتی رہتی تھی۔ انگ انگ کو چھوتی۔ کبھی اپنے بازوؤں میں بھر کر اُسے زور سے بھینچ لیتی۔ جب بھی وہ ایسا کرتی، یہی کہتی۔

'' کبھی کبھی سورج گرہن کے دوران ''ٹوٹل یوکلپس'' کی وجہ سے آسمان میں ڈائمنڈ رِنگ بنتا ہے۔ تم وہی ڈائمنڈ رِنگ ہو جس کا حُسن آنکھوں کو چکاچوندھ کر رہا ہے۔''

''ڈائمنڈ رنگ.........؟''

''ہاں بیٹی! اور یہ سب فٹنیس ٹرینر کے ہاتھوں کا کمال ہے کہ صبح وشام جواں ہاتھوں کی ایسی مالش کی کہ تمہارا انگ انگ سیکسی سانچے میں ڈھل گیا ہے......'' یہ کہتے کہتے شوبھا نے نہ جانے کہاں ہاتھ رکھ دیا کہ پریتی اُچھل گئی۔ تب مسکراتے ہوئے اُس نے آگے کہا۔ ''میں تو دن رات بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتی ہوں کہ تمہارا جسم اتنا خوبصورت ہو جائے کہ دنیا کا ہر مرد تُمھیں پانے کے لئے میان سے اپنی اپنی تلواریں کھینچ لے۔''

لیکن ممّی! ڈائمنڈ رِنگ بنتے ہی اگر زمین اور چاند کی گردش ہمیشہ کے لئے تھم جائے تو پھر کیا ہوگا.........؟ اندھیرے میں میرا حُسن بھی بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گا۔ چمچماتی تلواریں دمیان کے اندر چلی جائیں گی۔''

پریتی کی ان باتوں کو سننے کے بعد شوبھا کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جن دواؤں نے اُس کے جسم کے خاص حصّوں کو اثر انداز کیا ہے اُسی تناسب میں اُس کی ذہنی نشوونُما بھی ہوئی ہے۔ پھر وہ بات کا رُخ موڑ کر انٹرٹینمینٹ کا درس پڑھانے لگتی ہے۔

’’جب ایسا ہوگا تب دیکھا جائے گا۔ ابھی جو سامنے ہے اُسے دیکھو۔ جتنا انٹر ٹینمنٹ کر سکتے ہو کرو۔ کیوں کہ موت ایک حادثہ ہے جو بتا کر نہیں آتی۔ اِس سے پہلے ایسا کچھ ہو، زندگی کا رس نچوڑ لو، تا کہ پیاس باقی نہ رہے۔‘‘

☆

ٹرانس پرنٹ کپڑے میں لیمینیٹ کر کے جب شوبھا نے پہلی بار پریتی کو بطور لیمی نیٹیڈ گرل، رینپ پر کیٹ واک کے لئے اُتارا تو ہزاروں آنکھوں نے آپس میں تلواریں کھینچ لیں۔ اُس کی چال، کمر کا لوچ۔ ناف کے بھنور اور سینے کے اُبھاروں کو دیکھ کر لوگ پاگل ہو اُٹھے تھے۔ اُس نے ایسی قیامت برپا کی بڑے بڑے فیشن ڈیزائنر، اور کمپنیوں کے مالک اپنے برانڈ کو پرموٹ کرنے کے لئے منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور ہو گئے۔

شو ختم ہوتے ہی تعریفوں کی جھڑی لگ گئی۔

’’آپ نے فرسٹ شو میں کئی ماڈلس کی چھٹّی کر دی ہے۔‘‘

’’ماڈلنگ کی دنیا میں تو آپ نے حُسن کی آگ لگا دی ہے۔‘‘

’’آپ جیسی ماڈل جس کی بھی برانڈ امبیسڈر بنیں گی اُس کی مارکیٹنگ تو خود بخود ہو جائے گی۔‘‘

’’ایسی ماڈل تو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔‘‘

ڈنر پارٹی میں سب کے سب پریتی کو گھیرے ہوئے تھے اور سبھی یہ چاہتے تھے کہ پریتی پہلا کونٹریکٹ اُس کے برانڈ کے لئے سائن کرے اور اس کے عِوض وہ چاہے تو بلینک چیک لے لے۔

’’میں ’’دلرُبا ریشم ورلڈ‘‘ کا مالک۔ ساری دنیا میں میرے برانڈ کی دھوم ہے۔ دس ہزار سے لے کر دس لاکھ تک کی ساڑیاں ہمارے یہاں بنتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جیسی ماڈل ٹاپ برانڈ کی ساڑی پہن کر اُسے پرموٹ کریں۔‘‘

لوگ آگے پیچھے کر رہے تھے۔

’’دِلرُبا ریشم ورلڈ‘‘ کے مالک کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ’’سلور اسکرین‘‘ کا نمبر ون فیشن ڈیزائنر راکیش مشرا اپنی بات کہنے کے بے چین ہو گیا۔

’’ ٹاپ موسٹ ہیروئنیں اور ماڈلس کی پہلی پسند میں ہوں۔ اُن کے لئے ایسے ایسے ڈیزائن کریئٹ کرتا ہوں کہ اُن کی شہرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ہم دونوں اگر ایک دوسرے کو پرمورٹ کریں تو اِس میں دونوں کا فائدہ ہے۔‘‘

راکیش مشرا کی باتوں میں واقعی دم تھا۔ کیوں کہ اُنہوں نے کئی ایسے ماڈل کو جس کی کوئی پوچھ نہیں تھی، لیکن اِس کے ڈیزائن کئے کپڑے کے ساتھ جب رینپ پر آئی تو پھر اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

فیشن ڈیزائنر کے بعد باری تھی مشہور کوسمیٹک کمپنی ’’بیوٹی ون سکس‘‘ کی۔ جو قریب پچیس سالوں سے بازار میں اپنی مضبوط پکڑ بنانے کے لئے اپنا بہت کچھ جھونک چکی تھی۔ لیکن اِس کے بعد بھی وہ کبھی ورلڈ کے ٹاپ سیون میں اپنے لئے جگہ نہیں بنا سکے۔ لیکن جب انہوں نے پریتی کو دیکھا تو اُمیّد بندھی کہ آنے والے سالوں میں وہ نمبر ون کی پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے راکیش مشرا کو بڑی صفائی سے دھکّا دیتے ہوئے وہ آگے آ گئے۔

میرے کئی آئٹم دوسری کمپنیوں سے بہتر ہیں۔ لیکن ماڈل کے سلیکشن میں، میں ہمیشہ پیچھے رہ گیا۔ اِس لئے میری کمپنی کو وہ اہمیت نہیں مل پائی۔ اب آپ مل گئی ہیں تو ’’بیوٹی ون سکس‘‘ کی قسمت راتوں رات بدل جائے گی۔‘‘

’’دلرُبا ریشم ورلڈ‘‘، ’’سلور اسکرین فیشن ڈیزائنر‘‘، ’’بیوٹی ون سکس‘‘ اور دوسری کئی کمپنیوں کے اِس سنہرے آفر پر بھی شوبھا نے پریتی کو بہت زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا

’’کہ ابھی یہ بچّی ہے۔ کیا ماڈلنگ اور کیا کونٹریکٹ پیپر۔ ابھی تو یہ ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوئی ہے۔‘‘

☆

ماڈلنگ کی دنیا میں پریتی راتوں رات اِس طرح سے اِسٹار بن جائے گی۔ ایسا شوبھا نے سوچا نہیں تھا.........لیکن پہلے ہی دن خواہش سے کہیں زیادہ کونٹریکٹ ڈیل کرنے کا موقع جب شوبھا کو ملا تو اُس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ دوسرے دن فائیو اسٹار ہوٹل میں شاندار پارٹی کا اہتمام ہوا، جہاں بڑے بڑے لوگ شوبھا سے مل کر اپنے رُتبے اور عزّت کو کیش کرانے میں لگے ہوئے تھے۔

ایم ایل اے اور منتری جی بھی اِس پارٹی میں پیش پیش تھے۔

پہلا اشتہار.........

''دلرُ باریشم ورلڈ'' کی ٹاپ برانڈ ساڑی کے لئے پریتی نے کیا۔ جس میں کام دار آنچل کو ایک ہاتھ سے پکڑے دوسرے ہاتھ سے دامن کو گھٹنوں تک اُٹھائے وہ غضب ڈھارہی تھی۔ سمندر میں اُترنے اور نہانے سے پہلے ساڑی کو کمر سے نکال کر جس طرح سے وہ اُسے ہوا میں لہرارہی تھی، وہ قابل دید تھی۔ اِس کے لئے اُسے منہ مانگی رقم بھی ملی تھی۔ اور رقم کے حساب سے جیسا کمپنی نے چاہا تھا ویسا کام بھی ہوا تھا۔ کمپنی والے خوش تھے ۔کیوں کہ راتوں رات اُس ساڑی کا ڈیمانڈ اتنا بڑھ گیا جتنے کی مارکیٹنگ پورے سال میں بھی ممکن نہیں تھی۔

کونٹریکٹ لیٹر پر پریتی سائن کرتی رہی۔ شوبھا کے ہاتھوں میں چیک گرتے رہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں لوگ جمع ہوتے رہے۔

اور ہر پارٹی کے بعد شوبھا کا اثر ورسوخ کارپوریٹ گھرانے کے ساتھ بڑھتا رہا۔
سیاسی اثر ورسوخ میں بھی رات دن اضافہ ہوتا رہا۔ جس کا فائدہ ہر سطح پر شوبھا کو ہوا۔

اِس طرح سال بھر ماڈلنگ کی دنیا میں پریتی کے جلوؤں کی ہنگامہ آرائی رہی ۔لیکن بازارِ حُسن کے نشیب وفراز سے شوبھا بخوبی واقف تھی کہ جیسے ہی گاڑیوں سے فریش سامان گوڈون میں اُترتے ہیں، پُرانے کی قدر و قیمت خود بخود کم ہوجاتی ہے۔ حالانکہ شوبھا نے سیاسی کولڈ اِسٹوریج کا بھی سہارا لیا تھا۔ لیکن کولڈ اسٹوریز میں ایک میعاد تک ہی

فریشنیس برقرار رہتی ہے۔ اِس لئے جیسے ہی رینپ پر فریش لیگس نے نمائش کے لئے انٹری ماری تو شوبھا کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔

پھر کیا تھا؟

کمپنیوں کے فون کم آنے لگے۔

اشتہار سازی کی دکان چلانے والے بھی کم دکھائی دینے لگے۔

جہاں کونٹریکٹ لیٹر پر سائن ہونے بند ہوئے، وہاں فائیو اسٹار پارٹیوں کی زبان پر بے ذائقہ سواد کے تالے لگ گئے۔

ایسے میں چیک کہاں سے آتے.....؟

بغیر چیک کے پارٹیاں کیسے ہوتیں......؟

لیکن جن کا وجود ہی پارٹیوں کے لئے بنا ہو، وہ تو ہر وقت پارٹیوں کی تلاش میں رہے گا۔

☆☆☆

34

تہذیب کے دروازے، کُنڈ یاں اور شیشے کی دیوار

قارئین!

انسان جب جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں سے ہوتا ہوا کھیت کھلیانوں کے راستے مٹّی کی دیواروں پر بانس اور پھوس سے چھت بنانا سیکھ لیا تب اُس نے اپنے اپنے گھروں میں تہذیب کے دروازے لگائے اور کنڈلی لگا کر اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ رہنے لگے تو ایسا لگا کہ انسان نے خود کو تلاش کر لیا ہے.........لیکن جیسے جیسے خود کو تلاش کرنے کا یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا، ویسے ویسے سمینٹ اور لوہے سے بنی دیواروں اور چھتوں میں رہنے والے لکیں موڈرنیٹی کے نام پر اپنے دروازے شیشے کے لگانے لگے۔ تاکہ ترقّی یافتہ دور میں اپنی مہذّب بیویاں تلاش کرنے میں کسی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔

ڈاکٹر کپل اپنی مہذّب بیوی کی تلاش میں نکلے تو ضرور۔ لیکن ڈھونڈ نہیں پائے۔ شاید اِس لئے کہ ابھی اُنہوں نے شیشے کی دیواروں کے اُس پار جانے کا ہُنر نہیں سیکھا تھا۔ یا پھر اِتنے مہذّب نہیں ہوئے تھے کہ گھر گھر کی تلاشی لیتے۔

تلاشی کے کام میں شوبھا ماہر تھی۔

اگر آپ کو کسی چیز کی تلاش ہو تو وہ شوبھا سے سیکھئے۔ کم وقت میں اُس نے خوشیوں کی جو نئی راہ تلاش کی تھی وہ سب کے بس میں کہاں تھا؟.........انسان نے بہت مشکل سے تہذیبی مٹّی سے بنے راستوں پر رفتہ رفتہ چلنا سیکھا تھا۔ لیکن اُن راستوں پر شوبھا کے پاؤں تھکنے لگے تھے...........میدانوں، صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلوں سے ہوتا ہوا یہ راستہ جب سمندر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مصنوعی نخلستان تک پہنچا، تب وہاں پہنچ کر انسان نے خود کو تلاش کرنا شروع کیا۔ وہاں انسان پہلے سے فطری لباس میں موجود تھا۔ جو کچھ تھا وہ سامنے تھا۔ اور جو سامنے تھا وہی سب کچھ تھا۔ اور وہی سب کچھ اُس کے لئے زندگی تھی۔

لیکن حقیقت میں تلاش کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اور جہاں یہ ختم ہوتا ہے وہاں سے بیچ پارٹی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اور جہاں یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے وہاں شوبھا اپنی پریتی کو لے کر جانا چاہتی تھی۔

وہ وہاں گئی بھی۔

میامی جیسے ہی ایک بیچ میں۔ جہاں دنیا بھر کے سیلانی موج مستی کے لئے آتے ہیں۔ وہاں پریتی جیسی لڑکی کو کام ملنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پریتی کی خوبصورتی اور ڈانس کو دیکھ کر اُسے ایک سال کے کونٹریکٹ پر رکھ لیا گیا۔ کونٹریکٹ لیٹر میں بولڈ حرفوں میں لکھا تھا۔

''اگر پرسنل کونٹریکٹ نے سیلانیوں کی تعداد میں اِضافہ نہیں کیا تو سال بھر کے بعد کونٹریکٹ خود بخود ختم ہو جائے گا۔''

اس خاص حصّے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد شوبھا نے پریتی کو سائن کرنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ سائن کر چکی تب شوبھا نے منیجر سے کہا۔

''مجھے پوری اُمّید ہے کہ میری پریتی اپنے ڈانس اور حُسن سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لے گی۔'' اُس نے رُک کر پریتی کی طرف دیکھا۔ ''کیوں بیٹی؟''

''جی مما!'' اُس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''پھر دوسرے سال کا کونٹریکٹ پکّا ہی سمجھئے۔''

منیجر نے ایکسرے جیسی آنکھوں سے جب پریتی کو دیکھا تو شوبھا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ منیجر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی ہے۔ اِس لئے اُس نے کہا۔

''پکّا ہی سمجھ رہی ہوں منیجر صاحب!'' آگے مسکراتے ہوئے۔ ''ڈانس کے ہر اسٹیپ کے بعد پریتی کا جسم اِتنا زہریلا ہو جاتا ہے کہ آپ جیسے ماہر ڈاکٹر گھنٹوں زہر نکالتے بھی رہیں تو بھی کچھ نہ کچھ اندر رہ ہی جاتا ہے۔''

اُس نے یہ خوبیاں اِس طرح بیان کیں جیسے وہ پریتی کی نہیں اپنے جین کی خوبی بیان کر رہی ہو۔ اِس بات کو منیجر نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

''ابسلوٹلی رائٹ میڈم ۔ یہاں تو مجھ جیسے بہت ڈاکٹر ہیں ۔اور سب اِسی تاک میں رہتے ہیں ۔ جہاں کسی کے جسم میں زہر چڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ فوراً اتار دیتے ہیں.........''

ایکسرے جیسی آنکھوں نے ایک بار پھر پریتی کی تصویریں کھینچیں ۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔

''یہاں ویسی فلموں میں کام کرنے والے نئے نئے مسٹنڈے بھی پریکٹس کے لئے آتے ہیں ۔جس کے اندر زیادہ زہر بھر جاتا ہے اُسے اُن نوسکھیوں کے سامنے اسٹریچر پر ڈال دیا جاتا ہے۔کیس اِسٹڈی کے بعد کبھی کبھی تو دوتین ایک ساتھ زہر نکالتے ہیں۔''

''دوتین ایک ساتھ...........''

''ہاں کبھی کبھی اس سے زیادہ ڈاکٹر بھی مریض کا علاج کرتے ہیں۔'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ۔'' میرا مطلب !جس کے اندر جتنا زہر اُس کے لئے اتنے ڈاکٹر.........''

''تو ہر ڈاکٹر کی الگ الگ فیس بھی ہوگی نا.........؟''

شوبھا کے لئے یہ معلوم کرلینا ضروری تھا۔ کیوں کہ بغیر فیس کے علاج میں وہ تاثیر نہیں ہوتی۔ڈاکٹر اچھّی دوائیاں نہیں لکھتے۔اورحُسن جہاں ایک بار بیمار پڑا تو ہسپتال کا آئی سی روم اُس کا مقدر بن جاتا ہے۔آکسیجن زندگی اور دوبارا کونٹریکٹ سائن ہونا چیلنج۔ جیسے کوئی اپاہج سومیٹر کی دوڑ جیتنے کا خواب دیکھ رہا ہو۔''

''ہاں !لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ حُسن وجنس میں سے کسی ایک کا بھی زہر کم ہوگیا تو اُس کے علاج میں ڈاکٹروں کا اِنٹرسٹ کم ہو جائے گا.........'' بیچ اور حسن کے نازک رشتے کو سمجھاتے ہوئے آگے کہا۔'' بیچ پارٹیوں میں جلوے بکھیرنے والی لڑکیوں کو کونٹریکٹ کے مطابق صبح وشام اپنی دکان کھولنا پڑتی ہے۔اِس لئے سال بھر میں اُس کا حُسن مدھّم پڑ جاتا ہے۔بہت کم ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کا حُسن سال بھر کے بعد ویسا ہی رہتا

ہے۔''منیجر نے پریتی کے گالوں کو چھوتے ہوئے ایکسرے بھری نظروں سے دیکھا''میں تو گاڈ سے پرارتھنا کروں گا کہ آپ کی بیٹی کا حُسن مینٹین رہے۔

''تاکہ دوسرے سال بھی آپ لوگوں کے کام آسکے۔'' شوبھا ایک زوردار ٹھہا کہ لگاتی ہے۔'' ہم جیسی مائیں تو اِسی لئے پیدا کرتی ہیں بیٹیاں تاکہ اُس کے ساتھ ساتھ آپ جیسوں کا بھی کام چلے۔''

بیچ پارٹی میں یوں تو بہت ساری مائیں آتی تھیں۔لیکن کسی نے بھی ایسی بولڈنیس نہیں دکھائی کہ ماں کی حرمت ہی تارتار ہوجائے.........لیکن مالکوں اور منیجروں کو تو ایسی ہی ماؤں کا انتظار رہتا تھا۔

''ہم لوگوں کو واقعی آپ جیسی ماؤں کا شکر گذار ہونا چاہئے اور ساتھ میں پاپاؤں کا بھی جو بیٹی کی کمائی پرعیش کرتے ہیں۔اگر ایسے جنم داتا نہ ہوں تو ہمارے بیچ کی خوبصورتی میں راتوں رات گہن لگ جائے گا۔ہمارا کرڑوں کروڑ کا نقصان ہوجائے گا.........اور ساتھ ہی دنیا میں سیکس کرائم بھی بڑھ جائے گا۔

''یہ آپ نے بہت پتے کی بات کی۔ جہاں حُسن ہوگا وہاں چاہنے والوں کے بیچ زورآزمائی ہوگی۔حسن کا قتل ہوگا۔عزّت سرِ عام نیلام ہوگی۔''

لیکن جب یہی خوبصورتی گھروں سے نکل کر بیچ پارٹی کا حصّہ بنتی ہے تو سورج نکلنے سے پہلے رات اپنے بدن میں ہزاروں ستارے ٹانک لینا چاہتی ہے۔

رات جھِل مِل کرتی رہی۔

عشق انگڑائیاں لیتا رہا۔

حُسن مسکراتا رہا۔

سال ختم ہوتے ہی اُسی حُسن وعشق کے اشتراک سے جنم لینے والی کئی ٹین ایجر لڑکیاں بیچ پارٹی کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے اِس طمطراق سے وارد ہوئیں،جو پریتی سے زیادہ دھماکے اور جلوے بکھیرنے کا ہُنر اپنی کمر کے لوچ میں رکھتی تھیں۔

اِن لڑکیوں کے آنے کی خبر جب شوبھا تک پہنچی تو بے چینی کی لہر شریانوں میں دوڑ گئی۔نیند غائب ہوگئی.........اور جب نیند کا علاج کرانے پریتی کو لے کر ڈاکٹر کے کیبن پہنچی تو دھچکا لگا۔شریانوں کی بے چینی کچھ اور بڑھ گئی۔وہاں پہلے سے فریش لیگس اپنے ڈانسنگ اسٹیپس کا علاج کروا رہی تھیں۔

ایک گھنٹے کے بعد جب کسی طرح سے اُن تک پہنچنے کا موقع ملا تو اُنہوں نے کوئی توجّہ نہیں دی۔

''منیجر صاحب!''

جان بوجھ کر چونکتے ہوئے۔''ارے شوبھا جی آپ؟ بس ابھی میں آپ کو بلوانے ہی والا تھا۔اچھّا ہوا کہ آپ خود ہی آگئیں۔'' انہوں نے دراز سے لفاف نکالا اور پریتی کی طرف دیکھے بغیر شوبھا کو تھما دیا۔

لفاف کے اندر کیا ہوگا شوبھا کو بخوبی علم ہوگیا تھا۔کیوں کہ آج کونٹریکٹ کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ویسے وہ اندر سے کانپ رہی تھی پھر بھی ہمّت کر کے بولی۔

''منیجر صاحب! ابھی بھی پریتی میں بہت سارا ٹائلینٹ بچا ہے۔''

''دیکھئے شوبھا جی آپ اپنا وقت برباد کر رہی ہیں۔'' قطار میں کھڑی فریش لیگس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔''جب تیرہ چودہ سال کی لڑکیاں بیچ کی خوبصورتی میں چھٹا بکھیرنے آگئی ہیں تو پھر پندرہ سولہ سال کی طرف دیکھنے کی فرصت کس کو ہے؟''

''منیجر صاحب! آپ ایک بار پھر سے اِنٹرویو لے لیں۔پریتی کے اندر اب بھی وہ ٹین ایج بیوٹی بچی ہوئی ہے۔'' شوبھا نے ہر ممکن کوشش کی کہ تیّار ہو جائے۔لیکن قطاروں میں کھڑی فریش لیگس کی مقناطیسی کشش اُنہیں اپنی طرف کھینچتی رہی۔

شوبھا جی! سال بھر کا باسی کھانا نہ فریج میں رکھا جاتا ہے اور نہ ہی کھایا جاتا ہے۔ہمارے بیچ کی سیر کرنے والے شہزادے تو ایسے فنگس زدہ کھانے کی طرف دیکھتے بھی نہیں.........رہی بات باہر کی دنیا کی تو وہاں پریتی جیسی لڑکیوں کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔

وہاں عمر کوئی معنی نہیں رکھتی۔اُنہیں صرف عورت چاہئے ہوتی ہے۔چاہے وہ کسی عمر کی ہو۔نارمل ہو ابنارمل ہو اُس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

حُسن کے نئے منظر نامے پر منیجر کی بات سُن کر شوبھا کو یوں تو اچھّا نہیں لگا۔لیکن اِس کے باوجود اُس کی آنکھیں آس پاس کے جن منظروں کو سمیٹ رہی تھیں اُس کے مطابق ٹین ایج کی مانگ میں راتوں رات اِضافہ ہوا تھا۔

کیوں ہوا تھا؟

یہ ایک اہم سوال تھا جو وقت کے چاک پر گھوم رہا تھا اور ہر لمحہ اپنے وجود کی تلاش میں تھا۔

شوبھا ایک ہاتھ سے لفاف اور دوسرے ہاتھ سے پریتی کو تھامے مایوس قدموں کے ساتھ باہر نکل گئی۔

باہر نکلتے ہی ایک بار پھر کیبن کا دروازہ چرچرایا اور چودہ سالہ فریش لیگس کیٹ واک کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

پریتی پندرہ سال سے تجاوز کرنے کے جرم میں بیچ پارٹی کے قانون کی زد میں آگئی تھی۔اس لئے اُسے باہر کا راستہ دیکھنا پڑا تھا۔

☆☆☆

35

کلینڈر کی دُنیا، رِسپونس اور بلیک لِسٹ

قارئین!

شوبھا ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔سوچا کہ بھلے ہی بیچ پارٹی سے رُخصتی ہو ئی ہو،لیکن ابھی پریتی میں جلوے باقی ہیں۔لیکن اِن جلوؤں کے لئے وہ جگہ کون سی ہوگی؟ یہ سوچنے سمجھنے اور انتخاب کرنے میں اُسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

اِدھر بیچ پارٹی سے فائنل حساب کتاب ہوا اور اُدھر وہ کلینڈر کی دنیا میں پریتی کی جلوہ افروزی کے لئے تانے بانے بُننے لگی۔مشہور کلینڈر کمپنیوں کے ایڈریس اور ای۔میل انٹرنیٹ سے حاصل کئے۔اور پریتی کی درجنوں نیم عریاں سیکسی تصویریں مع تعارف میل کر کے بیٹی کے حُسن کے ساتھ ساتھ اپنی ساکھ کو بھی بچانے کی جدوجہد میں جُٹ گئی ۔

دو تین دن کے اندر ہی میل پر رِسپونس آنے شروع ہو گئے۔

ابھی ہفتہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ فوٹو سیشن کے لئے کئی فوٹو گرافرس آ گئے۔ایک دو فوٹو شوٹ کرنے کے بعد ہی کلینڈر کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ''سی نائٹ'' کے مشہور فوٹو گرافر کرسٹوفر اینجل نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔

''شوبھا جی! آپ کی بیٹی کا چہرہ تو بالکل فوٹو جینک ہے۔''

پھر کیا تھا: کمپنی کے مالک کے ساتھ شوبھا کی فون پر بات کروا کر ساری شرطیں طے کروالیں۔کونٹریکٹ پیپر پر پریتی نے سائن کئے۔ چھ صفر سے مزین چیک کو مسکراتے ہوئے شوبھا نے رِسیو کیا۔

''کیا اچھّا ہوتا کہ ایک سال کے بعد آپ ایک اور چیک میری بیٹی کے حُسن پر نچھاور کرتے۔'' شوبھا نے اپنی قاتل اداؤں کا سہارا لیا۔

''دیکھئے کلینڈر کے بارہ اوراق اُلٹتے ہی دُنیا بدل جاتی ہے۔'' اُس نے اپنے

ساتھ لائے ٹیبل کلینڈر کے اوراق کو ایک کے بعد ایک پلٹنا شروع کیا۔آخری مہینہ دسمبر کا پلٹتے ہی بلینک شیٹ آ گیا۔اُس نے اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اِس خالی ورق پر دنیا نئے چہرے کو دیکھنا پسند کرتی ہے۔اب تک کے کلینڈر ہسٹری میں کسی ماڈل کو رِپیٹ نہیں کیا گیا ہے.........'' پھر پریتی کی خوبصورتی کا معائینہ کرتے ہوئے بولے۔''ایسے اِس وقت میں وعدہ نہیں کروں گا،سال کے آخر آخر تک کام کی بنیاد پر ریویو کروں گا ہے۔ہوسکتا ہے کہ آپ کی بیٹی صدیوں کی ہسٹری بدل دے..........اگر ایسا ہوا تو آپ کے چیک کا وزن دُگنا ہو جائے گا۔''

''اگر ایسا ہوا تو اضافی رقم آپ کے حوالے۔''

''بہت خوب شوبھا جی! لیکن یہ بہت چیلنجنگ کام ہے۔'' شوبھا کی اِس دریا دلی کو سراہتے ہوئے کرسٹوفر نے کہا۔

''وہ کام ہی کیا جو چیلینجنگ بھرا نہ ہو۔اور پھر آپ تو اِس کام میں ماہر ہیں ہی ۔ پریتی کے کچھ ایسی تصویریں اُتاریئے کہ ساری دنیا میں ہنگامہ مچ جائے..........کلینڈر کی دنیا میں انقلاب آ جائے..........گھر گھر میں اُس کی تصویریں نظر آئیں۔''

''شوبھا جی آپ یہ بھول رہی ہیں کہ ہمارے کلینڈر گھر گھر نہیں لگائے جاتے ۔ کچھ خاص لوگوں کے بیڈروم کی زینت بنتے ہیں۔اور اب تو اُن خاص لوگوں کے بیڈروم تک آپ کی اور پریتی کی رسائی ہونے والی ہے۔'' چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے۔''پھر فون کالس کی ایسی بھرمار ہوگی کہ آپ کو سوچنا پڑے گا۔کس کو انٹرٹین کریں اور کس کو نہیں؟ کیوں کہ ہر کوئی منہ مانگی قیمت کی صف میں کھڑا ہوگا۔''

''منہ مانگی قیمت کی تو ہمیں عادت لگ چکی ہے کرسٹوفر صاحب!۔'' وہی قاتلانہ مسکراہٹ شوبھا کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

''لیکن پورے سال کا جو اوپری بزنس ہوگا اس کا ففٹی پرسینٹ ''سی نائٹ'' کو دینا ہوگا۔ورنہ کونٹریکٹ بیچ میں ہی ختم ہو جائے گا۔یعنی پریتی کو کلینڈر کی دنیا سے بلیک لِسٹ

کر دیا جائے گا۔اور ایک بار جو بلیک لسٹ ہو گیا اُسے کوئی بھی کمپنی سائن کرنے کا گناہ نہیں کرے گی۔ ورنہ یونین کیس کر دے گی اور اُسے دس گُنا فائن کا بوجھ جھیلنا پڑے گا۔''

''چلئے اُوپری کمائی میں ففٹی پرسینٹ تو ہمارا ہو گا نا.........؟'' شوبھا کے چہرے پر ففٹی پرسینٹ کی خوشی ہنڈریڈ پرسینٹ میں تبدیل ہو گئی۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں ....؟''

پھر کچھ دیر ہنسی مذاق کا دور چلا۔

''اب چلئے! باہر کسی لوکیشن پر پریتی کا فوٹو شوٹ کرتے ہیں۔ پھر وہ فوٹو اپنے کچھ خاص لوگوں کو میل کر دیں گے تاکہ کلینڈر آنے سے پہلے پریتی کا حُسن اُسے قتل کرتا رہے۔''

نئے جلووں کے ساتھ کلینڈر کی رنگین دنیا میں اُترنے سے پہلے پریتی کی ننگی تصویریں کچھ خاص لوگوں کے کمپیوٹر اسکرین تک پہنچ گئیں۔

☆

کالس آتے رہے۔

پرسینٹیج بنٹتے رہے۔

فوٹو گرافر زاویہ بدل بدل کر خوبصورت سے خوبصورت فوٹو شوٹ کرتے رہے۔

لوکیشن سرچنگ ٹیم، تھیم اور سچویشن کے مطابق لوکیشن بدلتے رہے۔ میک اپ مین حُسن میں جان ڈالتے رہے۔

شوبھا ہر لوکیشن میں ساتھ ہوتی۔

کبھی سمندری لہروں کے درمیان پریتی ہیجانی کیفیت میں تصویر کھنچواتی نظر آتی تو کبھی بھیگی ریت پر سن باتھ لیتی ادھ ننگی لیٹی رہتی۔

کبھی اوپر غائب

کبھی نیچے غائب

اور کبھی.......

اوپر نیچے دونوں غائب

جب سال کے کلینڈر بدلے تو وہ بھی وہاں سے غائب کر دی گئی۔

دیواروں سے

انکمنگ کال سے

یہاں تک کہ ففٹی پرسینٹ اوپری سورس آف انکم سے بھی وہ غائب ہو گئی۔ اِس کے بعد بھی شوبھا کو اُمید تھی کہ اُوپر نیچے کے حاضر غائب کھیل میں پریتی نے نئے فراز کے ساتھ کچھ ایسے نایاب نشیبی جوہر دکھائے ہیں جس کی بدولت اُسے کہیں نہ کہیں کام مل جائے گا۔

اور ایسا ہوا بھی۔

اُسے کام کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

سیکسی بُک کی زینت بننے کے لئے اُسے کئی فوٹو گرافرس کے آفر ملے۔ یہاں بھی خوب شہرت حاصل ہوئی۔ خوب پیسے کمائے۔ لیکن فریش لیکس کے آتے ہی اُس کے کام کی رفتار میں بریک لگنے لگی۔

پھر اُس نے کئی چھوٹے موٹے پروڈکٹ کے ایڈ کئے۔ پینٹی برا اور کنڈوم نے اُسے آسمان پر چڑھایا۔ لیکن چوں کہ کوئی بڑی کامیابی ہاتھ نہیں لگی تھی اِس لئے بڑے برانڈ کے ایڈ جھولی میں کم گرے۔

آہستہ آہستہ اشتہار کے دروازے بھی تنگ ہونے لگے۔ شوبھا اور بھی پریشان رہنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ فریش لیکس کی آمد کے باعث ایک نہ ایک دن پریتی کے حُسن کا سنسیکس کچھ اِس تیزی سے نیچے گرے گا کہ اُسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

گرتا ہی رہے گا۔

اور گرتے گرتے جب بہت نیچے گر جائے گا تو مندی کے بازار میں یہی حُسن، کلب کے راستے طوائف کے کوٹھے پر مجرا کے لئے پاؤں پاؤں آئے گا۔

☆☆☆

36

سنسیکس، وہائٹ واش اور جن لوک پال بِل

قارئین!

شوبھا کو ایسی اُمید تھی کہ گرتے سنسیکس کے باوجود کوئی نہ کوئی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر، ٹی وی یا پھر اے سرٹی فِلکیٹ فلم میں آئٹم ڈانس کے لئے پریتی کو سائن کرلے گا۔ وعدہ بہتوں نے کئے۔لیکن چھوٹے موٹے آئٹم سونگ میں ایکسٹرا ڈانسر سے زیادہ کی حوصلہ افزائی کے لئے کسی نے بھی پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھا۔اس طرح مِس بیوٹی بنانے کا سپنا شوبھا کے سامنے چور چور ہونے لگا تو اُس نے آخری پناہ گاہ کے طور پر ڈانس کلب کے انتخاب میں چھٹّی حِس کا سہارا لیا ۔

اور اِس حِس نے اُسے ''راج بارر اینڈ ڈانس کلب'' کے سامنے لاکھڑا کیا۔

مالک راج ملہوترا نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

''آیئے آیئے! پریتی کو کون نہیں جانتا۔سال بدل جانے کے بعد بھی وہ کلینڈر آج تک میرے بیڈروم میں موجود ہے۔''

راج ملہوترا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔وہ جس حُسن کا پرستار تھا اور سونے سے پہلے جسے جی بھر کر دیکھا کرتا تھا وہ لباسِ حریر میں سامنے کھڑی تھی۔

شوبھا بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔وہ تو آئی تھی یہاں کام کی تلاش میں لیکن جب پہنچی تو معلوم ہوا کہ کام اُس کی تلاش میں ہے۔

صوفے پر بیٹھتے ہی اُس نے پریتی سے کہا۔

''بیٹی میں نا کہتی تھی کہ تمہیں تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔''

''بھلا کیوں نہیں.........حسین ہے۔ڈانسر ہے۔میں نے ٹی وی شوز میں اِسے دیکھا ہے۔اِس لئے خود کو خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ پریتی 'راج بار اینڈ ڈانس کلب' سے جڑ رہی ہے۔'' راج ملہوترا نے تعریف کرتے اپنی انکساری کا ثبوت دیا۔

''آپ جیسے قدر دان جب تک اِس دنیا میں موجود رہیں گے تب تک حُسن کی عزّت افزائی ہوتی رہے گی راج صاحب۔'' شوبھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کے یہ جملے میرے لئے کسی کمپلی مینٹ سے کم نہیں ہیں۔''

راج کے اِشارے پر بار بوائے طشتری لئے حاضر ہوگیا۔

''لیجئے پہلے کافی پیجئے۔''

میٹرو سِٹی کے سب سے پرانے ''راج بار اینڈ ڈانس کلب'' کے مالک راج ملہوترا نے پریتی کو پہلو میں بٹھا کر فارم پر سائن کروایا اور ایک ماہ کا چیک بطور ایڈوانس شوبھا کے حوالے کیا۔

قسمت کا ستارہ ایک بار پھر حُسن کے آسمان میں چمکنے کے لئے بے تاب ہوگیا اور شوبھا کا اُٹھنا بیٹھنا ہائی پروفائل لوگوں کے ساتھ ہونے لگا۔بڑے بڑے منتریوں کی پارٹی میں وہ پریتی کو لے کر جانے لگی۔وی آئی پی کی خوشنودی کی خاطر شوبھا اُسے کبھی بلیک شیشے والے اِمپورٹیٹ کار میں گھنٹے دو گھنٹے کے لئے سڑکوں کی پیمائش کرنے بھیج دیتی تو کبھی ڈنر پارٹی میں مزے اُڑانے کے لئے کمرے تک پہنچا دیتی۔

بلیک شیشے والی اِمپورٹیٹ کار سڑکوں پر دوڑتی رہی۔

ڈنر پارٹیاں بھی ہوتی رہیں۔

ڈنر پارٹی میں پہنچ کر پریتی اپنے حسن کے ہاتھوں جو عزّت منتریوں کو بخش رہی تھی ،اُسی کی بدولت شوبھا کی آنکھیں سیاست کے سنہرے خواب بننے لگی تھیں کہ اس عزّت کے عِوض اُسے آئندہ انتخاب میں عزّت نگر سے ایم ایل اے کا ٹکٹ مل کر ہی رہے گا۔

ایک دن شوبھا نے اِس خواب کا ذکر کیا تو منتری مہودے بھی پھڑک اُٹھے۔

''شوبھا جی آپ نے اکثر میری اور میرے پارٹی کے قدآور نیتاؤں کی جس طرح عزّت کی ہے اُس کے بدلے اگر میں پورا عزّت نگر بھی آپ کو دے دوں تو کم ہے۔آئندہ

ایم ایل اے انتخاب کا انتظار کریں۔ ابھی سے عزّت نگر کی سیٹ میں نے پکّی کر دی ہے۔''

منتری جی نے اُس سے یہ سب کچھ اِس طرح سے کہا جیسے دورِ بادشاہت میں بادشاہ جب کسی کی عزّت افزائی کرنا چاہتا تھا تب وہ من پسند جاگیر اُسے بخش دیتا تھا۔

''بس! سیاسی منچ پر پریتی کو پرفارمینس کرنے دیں۔ پھر دیکھیں کیسے کیسے انعامات آپ کی گود میں گرتے ہیں؟''

''سیور.........؟'' شوبھا مسکراتی ہے۔

''وہائی نوٹ ....'' اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے آگے کہا۔ ''پریتی سے پہلے ہم لوگوں نے کنول کو پروموٹ کیا تھا۔ اُس کی ممی نے بھی بہت خدمت کی۔ پتی دیو مسٹر شرما بھی پیش پیش تھے۔ ایسا آئیڈیل پتی میں نے آج تک نہیں دیکھا ہے۔ آپ کو اندر کی بات بتا دوں کہ 'عشق پور' سے ایم پی کے نام کا ٹکٹ فائنل ہو گیا ہے.........شوبھا جی! ہم سیاست والے اِس معاملے میں ہوتے تو بہت گندے ہیں، لیکن کسی کا اُدھار نہیں رکھتے۔ '' پریتی کے گالوں کو چھوتے ہوئے۔'' اور اب تو پریتی کی حیثیت ایک ستارہ کی ہو چکی ہے۔ اِس الیکشن میں یہ میرے ساتھ دورہ کرے گی اور ساتھ میں کمپین بھی ....کیوں ٹھیک ہے نا پریتی؟''

پریتی منتری جی کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی ہے۔ بس مسکرا کر ممی کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ شوبھا کو ایسا لگتا ہے کہ وہ اُس کے پرمیشن کی منتظر ہے۔

''ٹھیک ہے منتری جی! دورے پر آپ اپنے ساتھ لے جایئے۔ لیکن یہ بھاشن واشن اِس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کیوں کہ ابھی بچّی ہے اور سیاسی اونچ نیچ سے واقف بھی نہیں ہے۔''

''شوبھا جی! وہ تو میں نے ''کمپین'' والی بات ویسے ہی کہہ دی ہے۔ لیکن اتنا تو طے ہے کہ وہ جہاں جہاں جائے گی، لوگوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آئے گا۔''

سیاسی منچ پر حسن کی نمائش ہوتی رہی۔

حسن کے پرستار جوق در جوق جمع ہوتے رہے۔

اور منتری جی پریتی کے بغل میں بیٹھ کر نئی نسل کو یہ پیغام دیتے رہے کہ اگر اِس بار تم نے جیت دلا دی تو تم سب کے پہلو میں ایسی ہی حسین لڑکی بیٹھی ہوگی۔ اور اگر یہ پسند ہے تب تو کوئی بات نہیں، کیوں کہ میری ساری چیز تو جنتا کی ہے۔

شوبھا نیتا ٹوپی پہنے لوگوں کو کام کروانے کے عِوض ٹوپی بھی پہناتی رہی۔

عزت نگر کی عزّت دار جنتا تک جب یہ خبر پہنچی کہ آئندہ انتخابات میں شوبھا یہاں سے ایم ایل اے کی امیدوار ہوگی تو سبھوں کو رائٹ ٹو ریجکٹ قانون کے پاس ہونے کا انتظار ہونے لگا۔

☆

''یار یہ قانون کب پاس ہوگا؟'' ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے داڑھی کھجلاتے ہوئے اپنی عمر سے زیادہ کے ایک شخص سے پوچھا۔

''جب پاس ہوگا تب ہم نہیں ہوں گے۔'' کاندھے سے بیساکھی جوڑ کر چلنے والے شخص نے کہا۔

''ارے بھئی ایسی باتیں نہیں کرتے۔ نا اُمیدی کفر کی علامت ہے۔'' داڑھی والے نے اُسے اُمیّد کی ڈور سے باندھنے کی کوشش کی۔

''ساٹھ پینسٹھ سالوں میں جب اِس کا نفاذ نہیں ہو پایا تو پھر.........اب تم ہی بتاؤ کہ انسان کی طبعی عمر کیا ہوتی ہے۔ اِسی کے آس پاس نا.........؟ آزادی کے بعد پیدا ہونے والوں میں سے بھی بہت سارے لوگ بل کے بغیر دنیا چھوڑ گئے ہیں.........ایک دن ہم بھی چھوڑ دیں گے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ آنے والی نسل اپنے آباؤ اجداد کے حقوق کا حساب وقت کی عدالت سے طلب کر کے رہے گی.........بل آج نہیں تو کل پاس ہوگا ہی۔''

داڑھی اور بیساکھی کی گفتگو کو بحث کی شکل دینے اور مزہ اخذ کرنے کے لئے لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔

''تو ایسے میں جہاں ادھیکاریوں اور سی گروپ کے کرمچاریوں پر کرپشن کا لگام لگے گا وہاں کیا ریئلیٹی شو پر بھی کوئی قانون بن پائے گا۔؟'' بھیڑ میں سے ایک شخص جس نے رودراکش کی مالا پہن رکھی تھی سوال اُچھال دیا۔

''نہیں اِس کی امید نہیں ہے۔'' گنجے سر والے نے اِس طرح سے کہا جیسے قانون کی نہیں، بال اُگنے کی بات کر رہے ہوں۔

''کیوں.........؟'' ناٹے قد کے شخص نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

''اس لئے کہ اِس میں کسی کو کسی طرح کا کوئی بھرسٹاچار نظر نہیں آتا۔'' سیاہ چشمے والا شخص یہ کہتے ہوئے بہت پُر اسرار لگ رہا تھا۔ اپنی بات پوری کرتے ہی جب اُس نے چشمہ اُتارا تو بھیڑ نے دیکھا کہ اُس کی ایک آنکھ پتّھر کی ہے۔

''کیوں نظر نہیں آتا۔؟'' پھٹے حال ایجوکیسنشٹ نے سوال اُچھالا۔

''اس لئے کہ ہماری دونوں آنکھیں پتّھر کی ہیں۔'' ریئلیٹی شو اور بچّوں کی زندگی پر ریسرچ کرنے والے ایک معمّر شخص نے پہلے افسوس کا اظہار کیا۔ پھر آگے ریئلیٹی شو کے کالے کارناموں کا کچّا چٹھا کھولا۔

''سنو، دوستو سنو......!''

''ہمارے یہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچّے جو ڈرگس میں جیل جاتے ہیں اور بیوی کو نشے کی حالت میں مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے ہیں، ویسے بچّوں کے کالے کارناموں پر وہائٹ واش کر کے 'ریئلیٹی شوز' صرف اُن کے کالے دھبّوں کو دھوتے ہی نہیں، بچّوں کے جج بھی بناتے ہیں اور اِس عزّت کے عوض تحفے میں درجنوں لڑکیوں کے ساتھ عیش کروا کر گفٹ میں اُسے ایک عدد بیوی عطا کرتے ہیں۔''

اب اِس بھیڑ میں داڑھی والے، بیساکھی والے، رُدراکش والے، گنجے سر والے، ناٹے قد والے، سیاہ چشمہ والے، ریئلیٹی شوز اور بچّوں پر ریسرچ کرنے والے لوگوں کی اِس بھیڑ میں سماج کے لگ بھگ ہر طبقہ کے لوگ شامل ہو گئے تھے۔ بحث کو نئی سمت عطا

کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

''یار ریئلیٹی شو کے نام پر جو کچھ آج دکھایا جا رہا ہے اس میں سر پیر کا تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔'' سوشل ایکٹیوسٹ کے سامنے پکاسو کی تصویر گھوم گئی۔

''پتہ ہی چل جائے تو پھر وہ ریئلیٹی شو کیا........؟'' مسکراتے ہوئے مذہبی رہنما نے اپنی ٹوپی سیدھی کی۔

''ویسے اے بی سی کے ''سروائیور'' ون اور 'ٹو' کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' ٹی وی جرنلسٹ نے پوچھا۔

بھیڑ میں موجود رائٹر نے جواب دیا۔

''ہاں یہ سچ ہے کہ'' سروائیور'' جیسے کچھ پروگراموں نے ریئلیٹی شو کی عزّت بڑھائی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ریئلیٹی کے نام پر جو ہو رہا وہ کس سے چھپا ہے.......... ایک چینل نے تو بے شرمی کی حد ہی پار کر دی۔ کیمرے کے سامنے ننگی ہونے والی کو اسٹار بنا دیا۔

''اور وہ پاکستانی ہیروئن..........؟'' دھوتی کرتا والے شخص سے بھی رہا نہیں گیا۔

''ارے اُس کی بات چھوڑو..........وہ تو ایسے اُس کے ساتھ رہ رہی تھی اور چڈھی بنیان دھو رہی تھی جیسے بیوی ہو۔'' بھیڑ میں لمبے قد کے شخص نے اِس طرح اُچک کر کہا جیسے ریئلیٹی شو کے باتھ روم میں جھانک رہا ہو۔

''ارے چھوڑو اِن لوگوں کی باتیں........'' زنار پہنے ہوئے شخص نے منہ بنایا۔

''یہ سب بے شرمی پنا نہیں تو اور کیا ہے۔؟'' کہنے والے شخص نے اپنی پگڑی سیدھی کی۔

''اور ہم سب بڑے مزے سے اُن کی بے شرمی کو اپنے چھوٹے چھوٹے بال بچّوں کے سامنے آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔'' تسبیح دانہ گننے والے شخص نے والدین کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''اور اِسی دیکھنے کے نتیجے میں بچّے بھی وقت سے پہلے بے شرم ہو گئے ہیں۔'' سینے میں صلیب لٹکائے شخص نے ایک آہ بھری۔

''ہو نہیں گئے۔ ہم نے کر دیا ہے..........'' بھیڑ سے اعترافِ گناہ کی صدا آئی۔

''ہم نے سے مطلب..........؟'' بھیڑ میں سے ہی کچھ کی ملی جلی آواز اُبھری۔

''آج کے دور کے ماں باپ۔ جو بچّوں کے پیسے پر عیش کر رہے ہیں۔'' اعترافِ گناہ کی صدا بلند کرنے والوں کی طرف سے ایک بار پھر صدا اُبھری۔

''آپ نے وہ چھوٹی سی موٹی سی کیوٹ سی لڑکی کو نہیں دیکھا؟ ابھی اُس کے ٹھیک سے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہیں، لیکن وہ اپنی عمر سے چار پانچ گنا بڑے مردوں کے ساتھ لافٹر لافٹر کھیل رہی ہے۔'' بھیڑ میں ایک لاغر سا نظر آنے والا شخص جس کے ہاتھ میں لاٹھی اور آنکھوں میں گاندھیائی چشمہ تھا سوال اُٹھایا۔ ''اب آپ ہی بتایئے کہ وہ عمر سے پہلے جوان ہو گی یا نہیں..........؟''

''جوان ہو گی کیا؟ جوان کر دی گئی ہے۔'' لوگوں کی ایک ساتھ آواز اُبھری۔

''اُس بچّی کے بچپن کا کیا ہوا..........؟''

بھیڑ سے کس نے یہ سوال کیا۔ کسی کو پتا نہیں چلا..........لیکن جواب دینے والا شخص ڈاکٹر کپل تھا جنہوں نے ذاتی تجربے کی بنیاد پر بچپن، جوانی کے ساتھ بڑھاپے کو شامل کر لیا تھا۔

''اس کا بچپنا تو کبھی آیا ہی نہیں۔ وہ سیدھے جوان ہوئی۔ جو لوگ بچپن میں بڑھاپے کے ریہرسل سے گذر چکے ہوتے ہیں اُن کے لئے زندگی آسان ہوتی ہے۔ لیکن جنہوں نے بچپنا دیکھا ہی نہیں اُن کے لئے موت بھی اذیّت ناک ہوتی ہے دوستو!''

بھیڑ مبہوت سا ڈاکٹر کپل کی بات سُن رہی تھی۔ جیسے ہی بات ختم ہوئی ایک شخص رونی صورت بنا کر سامنے آ گیا۔

''تو اِس کا یہی مطلب ہے نہ کہ اِس طرح کے ریئلیٹی شوز بچّوں کی زندگی سے

کھلواڑ کر رہے ہیں۔''

''لیکن یہ کون سوچ رہا ہے۔؟''

''سوچنے والے تو سوچ ہی رہے ہیں۔''

''لیکن یہ سوچنے والے ہیں کتنے..........؟''

''ارے ہمارے جیسے لوگ اب گنتی کے بچے ہیں..........''

''باقی تو یہی سوچ رہے ہیں کہ اُن کے بچوں کا مستقبل سنور رہا ہے۔ ٹائلینٹ کی پرستش ہو رہی ہے۔ رات دن اُن کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

اور مقبولیت کا ہی یہ نشہ ہے کہ آج لگ بھگ ہر گھر کے بچّے کسی نہ کسی سطح پر اس شوز کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

37

حمل، پُستان اور گیت سنگیت کے کیلشیم

قارئین!

چائلڈ ریئلیٹی شو کی مقبولیت میں دن رات اضافہ ہو رہا تھا۔

جس کے نتیجے میں میٹرنیٹی وارڈ میں بھرتی ہونے والی نئی نسل کے ڈیمانڈ پر کمر میں اُس شو کے 'انجیکشن' لگائے جا رہے تھے.........زچگی کے دوران لیبر روم میں بھی ٹی وی آن رکھا جا رہا تھا، تا کہ بچّے کو جنم دیتے وقت اُنہیں تکلیف نہ ہو۔

اب نومولود کی آنکھیں ریئلیٹی شو کے پالنے میں کھُلنے لگی تھیں۔ حاملہ کے بیڈروم میں خوبصورت بچّوں کے بجائے شو جیتنے والے بچّوں کی قد آدم تصویریں آویزاں تھیں تا کہ کوکھ کے کینوس پر سوچ کے برش سے بننے والی گوشت پوست کی تصویروں پر اُس کا مثبت اثر پڑے۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا رسیدی ٹکٹ کی پریتم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا.........؟

تو کیا کائنات کا سب سے بڑا کمپیوٹر آپریٹر، کاپی اور پیسٹ کے ذریعہ زندگی کی فائل کو اس طرح سے بھی ڈیکسٹوپ پر سیو کرتا ہے؟

دورانِ حمل شوز دیکھنے کے درمیان کنفیوژن یہ پیدا ہو رہا تھا کہ عورت کی پسند کچھ اور ہوتی اور مرد کسی اور کی حمایت کرتا..........ایسی صورت میں کبھی کبھی پہلی پسند پر دوسری پسند حاوی ہو جاتی۔ ایسے میں عورتوں کو اکثر یہ ڈر ستانے لگتا کہ کہیں اُن کے بچّے آدھے آدھے نہ ہو جائیں۔ دونوں گُن سما گئے تو سارے خواب دھرے رہ جائیں گے۔

اب بچّے کی 'آنکھیں' ریئلیٹی شو کے 'پالنے' میں کھُل رہی تھیں، پالنے سے وہ 'شو' کو پہلے اور 'ماں' کو بعد میں دیکھتا۔ جب تک دیکھتا۔ اُسے اچھّا لگتا۔ دودھ پینا بھول جاتا.........لیکن بھوک تو بھوک ہے بڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ جب روتا یا ماں کے سینے میں کچھ تلاش کرتا تو کچھ مائیں آنچل میں چھُپا لیتیں، اور کچھ دودھ پلانے کے بجائے

بچّے کا چہرہ ٹی وی کی طرف کر دیتیں۔ بھوک سے رو رہا بچّہ رنگین اسکرین پر ناچتے گاتے بچّوں کو دیکھ کر اپنی اُنگلی مُنہ میں ڈال لیتا۔ رونا بھول جاتا ہے۔

کچھ دیر کے بعد پھر وہ رونے لگتا ہے۔

چہرہ پھر سے ٹی وی کی طرف کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا ہے جب تک 'شو' ختم نہیں ہو جاتا۔

ریئلیٹی کے پالنے میں جنم لینے والے بچّوں کو ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ گیت سنگیت اور ہنسی کے 'کیلشیم' بھی ملنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں جلد ہی مضبوط ہونے لگیں۔ لیکن دماغ کے اندر تو صرف گودا بھرا تھا۔ ہڈیاں کہاں تھیں جو مضبوط ہوتیں۔ اس لئے پڑھائی لکھائی میں بھی ان کی دلچسپی کم ہی رہی۔

''تو اِس کا مطلب یہی ہوا نا: کہ ریئلیٹی کے 'کیلشیم' نے وقت سے پہلے ہماری ٹانگیں مضبوط کر دیں اور ہم نے استعمال کے لئے ڈانس فلور کا انتخاب کر لیا۔ او جب مست ہو گئے تو کتابوں سے دل کا اُچٹنا لازم تھا۔ یہیں ہماری سب سے بڑی بھول ہوئی۔ جس کا وقت رہتے علاج ضروری تھا۔ لیکن علاج کے لئے لوگ کپل جیسے ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے یہ سوچ کر کہ اِن کے بچّے تو خود ریئلیٹی کی گود میں پل رہے ہیں۔

سچّائی سے لوگ ناواقف تھے۔

یہی وجہ ہے کہ آنے والے دنوں میں اِس بھول کا خمیازہ لوگوں کو چکانا پڑا۔ پرائیویٹ اسکول دھڑا دھڑ بند ہونے لگے۔ پہلے جس اسکول میں ہزار دو ہزار بچّے پڑھتے تھے۔ نرسری اور ایل کے جی کے ایڈمیشن میں ہزاروں ہزار فارم سیل ہوتے تھے۔ سینکڑوں لوگوں کو بلیک میں لینا پڑتا تھا۔ لیکن اب اِن اسکولوں میں پہلے کے مقابلے آدھے سے بھی کم فارم بِک تھے۔ اور وہ بھی وہ بچّے خرید رہے تھے جو خطِ افلاس کے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے۔

لیکن زخمی سوال اسکول کے پھاٹک سے سر جوڑے اب بھی کھڑا تھا؟

''کہ وہ بچّے کہاں گئے؟ جن کے گارجین ہنستے کھیلتے ڈونیشن کے نام پر موٹی رقم

دینے کے لئے ہر وقت تیّار رہتے تھے۔''

لنگڑاتا ہوا سوال جب جواب کی تلاش میں نکلا تو اُسے دور نہیں جانا پڑا۔

پاس ہی ایک سِنگ سانگ اسکول تھا۔

اس سے کچھ دوری پر ڈانس اسکول کی بلڈنگ تھی۔

اور اس سے کچھ ہی دوری پر لافٹر اسکول کی باؤنڈری شروع ہوتی تھی۔

اور اس سے آگے زمین خالی تھی۔ جہاں درجنوں اسکول کے بورڈ نصب تھے۔ وہاں کے جغرافیے کو دیکھنے کے بعد کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہاں نئی نسل کے لئے کس طرح کے اسکول کھولے جانے ہیں۔

اِن نوزائیدہ اسکولوں کا معائنہ کرنے کے لئے جب منیجمینٹ کی ٹیم نکلی تو یہ حیران رہ گئی کہ ہزاروں ہزار کی بھیڑ میں کچھ بچّے ایسے ہیں جو اُن کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ ایڈمیشن کی لائن میں کچھ گارجین ایسے تھے جو اپنے بچّوں کے لئے اُن سے کئی بار مل چکے تھے۔

☆

معائنہ کرنے والی ٹیم میں پرنسپل پیارے لال بھی تھے۔ دن بھر گھومتے گھومتے تھک گئے تھے۔ اسکول بند ہونے کی فکر الگ ستا رہی تھی، اِس لئے رات بھر جاگتے رہے تھے۔ صبح سویرے بیوی کی اونچی ہیل والی سینڈل کی کھٹ کھٹ نے اُنہیں بھی بے چین کر دیا۔

''تم اتنی صبح منّے کو لے کر کہاں جا رہی ہو۔''

''آپ کو اپنے اسکول سے فرصت نہیں ہے اِس لئے اب منّے کو لے کر میں ہی فیوچر برائٹ سنگنگ اینڈ ڈانسنگ اسکول جا رہی ہوں۔''

''لیکن کیوں.........؟''

''کیوں کا جواب آپ کو بھی معلوم ہے۔

اور اب جب آپ اُٹھ ہی گئے ہیں۔ تو یہ فارم لیجئے اور ایڈمیشن کروا آیئے۔''

''لیکن یہ مجھ سے نہیں ہوگا''

''کیوں نہیں ہوگا؟.........میڈموں کے ساتھ تو سب کچھ ہوتا ہے؟ مجھے سب معلوم ہے کہ آپ آفس میں روز کس کے ساتھ گل چھرّے اُڑاتے ہیں۔ جس دن میرا دماغ خراب ہو گیا نا تو اُس دن چٹیا پکڑ کر باہر نہیں کر دیا تو میرا بھی نام نہیں ....سمجھے!''

بیوی کے اس خوف سے کہ کہیں خواہ مخواہ میں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اس لئے وہ کچھ ہی دیر بعد بچّے کا ہاتھ تھامے لائن میں نظر آئے۔

پرنسپل صاحبہ نے فارم پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پیارے لال کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور خالی کرسی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لمبی لائن میں لگے لگے آپ تھک گئے ہوں گے۔ اِس لئے بیٹھ جایئے۔'' پھر مسکراتے ہوئے۔ ''کیا زمانہ آ گیا ہے پرنسپل پیارے لال کہ سات آٹھ سال پہلے آپ نے میری بیٹی کو اِن ڈسپلین کے سنگین جرم میں اِس لئے نکال دیا تھا کہ وہ لیزر پیریڈ میں اپنے برتھ ڈے کی خوشی میں ڈانس کر رہی تھی.........اور آج اُس جرم کے پاداش میں اپنے بچّے کو ڈانس سکھانے میرے پاس لائے ہیں۔''

''میڈم اُس وقت کی بات کچھ اور تھی اور آج.........''

پرنسپل پیارے لال نے اُنہیں سمجھانے کی ابھی پہل ہی کی تھی کہ پرنسپل صاحبہ کے جسم میں کرنٹ سی دوڑ گئی۔

''آج کی بات کچھ اور ہے۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا.........؟'' وہ سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔ ''تو لے جایئے اپنے بچّے کو یہاں سے اور کرا لیجئے کسی دوسری جگہ ایڈمیشن۔ میں نے پروفائل ٹھیک سے دیکھ لیا ہے۔ آپ کے گھر میں نہ کوئی سنگر ہے نہ ڈانسر۔ پریکٹس کون کرائے گا؟ اِس سے تو ہمارے اسکول کا پرفارمینس خراب ہوگا۔'' پھر چلاّتے ہوئے۔ ''ارے کیسے بے شرم ہیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اور بیٹھے ہوئے ہیں کرسی پر لاٹ صاحب کی طرح۔ اُٹھئے! نہیں تو میں بلاتی ہوں سکوریٹی کو۔

☆☆☆

38

میٹنگ، لالی پاپ اور عدالت کا فیصلہ

قارئین!

کیا آپ کو کوئی اس طرح بے عزّت کر کے اپنے یہاں سے نکال دے تو برداشت کرلیں گے؟

نہیں نا.........؟

ڈانسنگ اسکول کی پرنسپل صاحبہ کے ہاتھوں جب پرنسپل پیارے لال بے عزّت ہوکر باہر آئے تو انہوں نے اُسی شام سکریٹری سے مل کر ایک کے بعد ایک ہنگامی میٹنگ بلوائی۔

صدر محترم!

یہ بات کسی سے ڈھکی چھُپی نہیں ہے کہ آج کل اپنے اسکول کی حالت دن بدن بد تر ہوتی جا رہی ہے اور اب تو اسٹوڈنٹ کی تعداد اتنی ہوگئی ہے کہ ٹیچروں کو تنخواہ دینا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں میری گذارش ہے کہ وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے اسکول میں بھی ڈانسنگ اور سنگنگ کی پڑھائی شروع کرنے کے بارے میں سوچیں۔'' پرنسپل صاحب نے روہانسی آواز میں بات آگے بڑھائی۔''اگر یہ قدم جلد نہیں اُٹھایا گیا تو ہمیں آنے والے دنوں میں اسکول کو بند کرنا پڑے گا۔''

صدر صاحب کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبے رہے پھر بولے۔

''میں خود بھی اسٹوڈنٹ کی تعداد کو لے کر فکر مند ہوں ۔ فیوچر کو دیکھتے ہوئے راستہ بدلنے میں ہی بھلائی ہے۔سکریٹری صاحب.........؟''

سکریٹری صاحب نے اِس مسئلے کو گمبھیرتا سے لیا۔

''لیکن راستہ بدلنے میں کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اُن ٹیچروں کا کیا کریں گے؟ اگر ہٹاتے ہیں تو ہنگامہ ہوگا۔ اور رکھتے ہیں تو بیٹھا کر سیلری دینا ہوگی۔

''ہاں یہ تو ہے۔لیکن سچویشن کو ہینڈل کرنے کے لئے دونوں میں سے کسی ایک پرابلم کو فیس کرنا ہوگا۔ جو بہت مشکل ہے۔'' معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سب سے بزرگ ممبر نے کہا۔

''اسی مقصد سے ہم نے ٹیچروں کی میٹنگ بلائی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اِن میں کچھ ٹیچر ایسے بھی ہوں جن کا اِنٹرسٹ گیت سنگیت میں ہو۔ ویسے ٹیچروں کو ہم لوگ رکھ لیں گے اور باقی کو کسی بہانے نکال دیں گے۔'' پرنسپل صاحب نے بیچ کا راستہ دکھایا۔

''لیکن میرے داماد پر کسی طرح کی آنچ نہیں آنی چاہئے۔''خزانچی صاحب نے سخت لہجے میں اپنا منشاء ظاہر کیا۔

''ارے کیسی باتیں کر رہے ہیں خزانچی صاحب! وہ صرف آپ کا نہیں ہم سب کا داماد ہے۔اُسے کون نکال سکتا ہے۔بس اُسے تھوڑا بہت ناچ گانا سکھوا دیجئے۔''صدر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن آج کل کسی کو نکالنا اتنا آسان کام نہیں ہے.........ٹیچر کورٹ میں چلے جائیں گے۔'' سکریٹری صاحب اندر سے کچھ خوف زدہ لگ رہے تھے۔

''اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پہلے ہم کانٹریکٹ کو باہر کریں گے۔ پھر جو پرمانینٹ ہیں اُنہیں سائنس میتھ اور انگریزی ہندی کی جگہ گانا سکھانے اور ڈانس کے اسٹیپس بتانے کے لئے کہیں گے۔ کچھ اِس کام کو کرنے میں اپنی بے عزّتی محسوس کریں گے.........اور کچھ بے شرمی سے نوکری بچانے کی کوشش میں منہ پھاڑ کر بے سرتال کے گانے اور ڈانس کرنے لگیں گے۔ ایسے ٹیچروں کو انوول ڈے فنکشن کے دن منچ پر اُتار دیں گے۔'' شطرنجی مسکراہٹ بکھیرے۔'' پھر گارجین خود فیصلہ کردیں گے کہ کسے رہنا ہے اور کسے جانا ہے.........اور جسے رہنا ہے اُسے تو ہر حال میں میوزک ڈانس سیکھنا ہی ہوگا۔ ہم بس اس کی اتنی مدد کریں گے کہ دو سال کی چھُٹّی دے دیں گے۔ پھر جب وہ ڈگری لے کر لوٹیں گے تب پرفارمینس دیکھا جائے گا۔ دوبارہ جوائن کروانا ہے یا نہیں سوچا جائے گا۔''

کچھ دیر تک اِس پر بحث ومباحثہ ہوتا رہا۔

آخر میں صدر صاحب نے بحث کا نچوڑ پیش کیا۔

''پرنسپل صاحب کی یہ باتیں یقیناً ہمارے اور اسکول کے فائدے کے لئے ہیں۔ اِس لئے نئے طرز کے اسکول کی بنیاد ڈالنے میں اپنا اپنا مثبت رول ادا کریں۔ ورنہ پرنسپل صاحب کی طرح بے عزّت ہونے کے لئے تیّار ہو جائیں۔''

☆

دوسری میٹنگ......

''میرے لرنیڈ کلیگ!''

''میں نے کبھی آپ لوگوں سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی ۔ ہمیشہ خود کو ٹرانسپر نٹ رکھا تا کہ رشتے میں کسی طرح کی کشیدگی پیدا نہ ہو۔''

''دوستو! بات ایسی ہے کہ.......... اِس لئے آپ سب منجمینٹ کا ساتھ دیں۔''

پرنسپل صاحب نے ٹیچروں کو اندھیرے میں رکھ کر منجمنٹ کے ساتھ ہوئی بات چیت کی روشنی میں فیوچر پلان کی لالی پاپ تھمایا تو سب کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ کچھ ٹیچر جلدی جلدی ریپر کھولنے لگے۔ لیکن کمل سری واستوا کو ریپر کے اُوپر سے ہی سیاسی شیرینی کی بُو آ رہی تھی۔ اُنہوں نے تجویز ماننے سے انکار کر دیا کہ ہمارا اسلیکشن سبجیکٹ پڑھانے کے لئے ہوا ہے اور اسکول کوئی کوٹھا نہیں کہ گانا گوائیں اور ساتھ میں ڈانس کریں۔''

کمل سری واستوا کی اِس بات پر ریپر کھولتے ہوئے کچھ ہاتھ رُک گئے۔

کچھ نے منہ میں سنبھال لیا۔

اس طرح ٹیچرس دو خانے میں بنٹ گئے۔

''ہم سے پیسے کے عِوض منجمنٹ جو چاہیں پڑھائیں۔ ہمیں اِس سے کوئی مطلب نہیں۔ بس ٹائم ٹو ٹائم سیلری اکاؤنٹ میں پہنچتا رہے۔''

''ہمیں جس میں ماسٹر ڈگری ملی ہے اگر اُس کو چھوڑ کر کچھ اور سکھاتے ہیں تو یہ

پروفیشن کے ساتھ دھوکہ ہوگا۔''

اور پھر ایک دن منجمنٹ کی شہ پر ایک گُٹ نے دوسرے سے مار پیٹ کر لی۔ بات پولس تک پہنچ گئی۔ دونوں فریقین کے کچھ لوگ جیل میں بند ہوئے۔ کمل سری واستوا کو سب سے زیادہ چوٹیں لگی تھیں اور حیرت یہ کہ اُس پر ہی سب سے زیادہ مارنے کا الزام تھا۔ جب کہ چشم دیدوں کے مطابق وہ دو لوگوں کو روک رہا تھا۔ کسی پر اُس نے ہاتھ بھی نہیں اُٹھایا اور اِس کا خمیازہ اُسے سب سے زیادہ دنوں تک جیل میں رہ کر بھگتنا پڑا۔

لیکن جیل سے چھوٹنے کے بعد اُن کا حوصلہ ہاتھوں سے نہیں چھوٹا ایک دو کلیگ کے ساتھ مل کر لڑائی جاری رکھی کہ ''پڑھائی کو کسی بھی حال میں سنگنگ یا ڈانسنگ میں تبدیل نہ کیا جائے۔''

اور ایک دن عدالت کا فیصلہ آیا۔

''اسکول منجمنٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے یہاں جس طرح کا ایجوکیشن سسٹم رکھنا چاہیں اُسے رکھ سکتا ہے۔ اور کسی کو اِس بات کا اختیار نہیں کہ وہ منجمینٹ کے فیصلے کے خلاف جائے ''میوزک'' بذاتِ خود ایک سبجیکٹ ہے اور اس میں ہی سانگ اور ڈانس آتے ہیں۔ لیکن منجمینٹ اس وجہ سے کسی بھی پرمانینٹ ٹیچر کو برخواست نہیں کر سکتی۔ بلکہ اُن کی صلاحیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یا تو اُنہیں آفس میں ایڈجسٹ کیا جائے یا سنگنگ اور ڈانسنگ کام میں مدد لی جائے۔''

عدالت کے اِس فیصلے سے جہاں بہت سارے اسٹاف خوشیاں منانے لگے تھے، وہیں کمل سری واستوا اندر ہی اندر ٹوٹ گئے تھے۔ اُن کی ہمّت نہیں ہوئی کہ وہ اسکول جائیں۔ لیکن ریزائن کرنے کا مطلب بیوی بال بچّوں کو جیتے جی مار ڈالنا تھا۔

اِن نامساعد حالات میں کمل سری واستوا بہت مشکل سے اپنے آپ کو سمجھا کر اسکول لے گئے۔ راستے بھر سوچتے رہے کہ وہ تو میتھ کے ہیں۔ اِس لئے آنکھ بند کر کے اُنہیں آفس ڈال دیا جائے گا۔

چیمبر میں داخل ہوتے ہیں پرنسپل مسکراتے ہوئے اٹینڈینس رجسٹر اُن کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔ دستخط کے کالم میں قلم رکھتے ہی ہاتھ کپکپانے لگتے ہیں، کیوں کہ نام کے آگے برائیکیٹ میں ڈانس ٹیچر لکھا تھا۔

ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا ہے۔

سائن ادھورا رہ جاتا ہے۔

وہ بغیر کچھ کہے پیچھے مڑتے ہیں اور گھر لوٹ آتے ہیں۔

پھر لوٹ کر کبھی اُس اسکول میں قدم نہیں رکھا جس کی دیواروں سے اُنہیں عشق تھا۔

اب وہ کارخانے جانے لگے تھے۔ جہاں وہ ڈیلی ویج پر بیلچہ چلانے کا کام کرتے۔ وہاں وہ اسکول سے زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔

اُن دنوں کمپنی میں کام کا دباؤ کچھ زیادہ تھا۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد شام ہوتے ہوتے وہ بُری طرح تھک جاتے تھے۔ اُس دن بھی تھکاوٹ سے جسم چور چور تھا۔ گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے اُنہیں بخار نے آگھیرا۔ وہ گھر جانے سے پہلے کسی میڈیکل اسٹور سے دوا لینا چاہتے تھے۔ راستے میں اُنہیں ڈاکٹر کی کلینک نظر آئی۔ اُنہوں نے سوچا کہ بول کر دوا لینے سے بہتر ہے کہ ڈاکٹر کو دکھا لیا جائے۔

اِس طرح وہ ڈاکٹر کپل کی کلینک پہنچ گئے۔

اُس وقت وہاں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ دو مریض کے بعد ہی اُن کا نمبر آ گیا۔ مریض والی کرسی پر بیٹھتے ہی ڈاکٹر کپل نے بغیر اُن کی طرف دیکھے نام پوچھا اور کہا۔

''جی بتائیے، کیا پریشانی ہے۔؟''

''ڈاکٹر صاحب پورے بدن میں درد ہو رہا ہے اور فیور بھی ہے۔''

اسٹیتھو اسکوپ سنبھالتے ہی اُنہوں نے پہچان لیا۔

''ارے سر آپ! میرا مطلب ہے شری کمل سری واستوا!. ڈائنمک پبلک اسکول

کے سب سے لوک پریہ ٹیچر۔''

''جی کبھی تھا.........لیکن اب میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔''

''کیوں.........؟''

''کیوں کہ اب وہ اسکول، اسکول نہیں رہا۔ سانگ اور ڈانس کا گھر بن گیا ہے۔ جہاں کسی کو مجھ جیسے ٹیچروں کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اب جو ٹیچر وہاں بحال ہوں گے وہ سب کے سب گوّیے یا نچنیے ہوں گے.........'' یہ کہتے کہتے کمل سری واستوا کچھ دیر کے لئے رکتے ہیں اور پھر حیرت سے ڈاکٹر صاحب سے ہی اُلٹے سوال کر دیتے ہیں۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے کیسے جانتے ہیں.........؟''

''میں قریب سات آٹھ سال قبل ایک دو بار آپ سے اسکول میں ملا ہوں۔ میری بیٹی بھی پہلے آپ کے یہاں ہی پڑھتی تھی۔''

''کیا نام تھا بیٹی کا.........؟''

''پریتی سنگھ!''

''پریتی سنگھ.........یعنی شوبھا سنگھ کی بیٹی۔ ارے وہ پڑھنے میں بہت تیز تھی ہمیشہ میتھ میں سو میں سو مارکس لاتی تھی۔'' پھر یکایک کمل سری واستوا کا لہجہ تلخ سے تلخ ہوتا چلا گیا۔ ''لیکن شرم آنی چاہئے ڈاکٹر آپ کو کہ آپ نے پیسے کے لالچ میں اپنی بیٹی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے کئی اسکول بند ہوئے ہیں۔ کئی ٹیچروں کی نوکری گئی ہے۔ میرے ایک کلیگ نے تو خودکشی کی کوشش بھی کی تھی، لیکن قسمت اچھّی تھی کہ وہ بچ گیا.......'' پھر غصّے میں کرسی سے اُٹھتے ہوئے۔ ''اور میں ایجوکیشن کے ویسے قاتلوں کے پاس علاج کے لئے آیا ہوں ....نہیں کرانا ہے مجھے آپ جیسے لوگوں سے اپنا علاج ....جو ایجوکیشن کی کمائی کھاتے ہوئے بھی کھلے عام اُس کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر کپل نے اُنہیں ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ ہاتھ جھٹک کر وہاں سے چلے گئے۔ ڈاکٹر کپل سر پکڑ کر دیر تک سوچتے رہے کہ کیا ہو رہا ہے یہ سب

..........کہاں جارہا ہے ہمارا ملک..........ایجوکیشن سسٹم کا کیا ہوگا؟ جب ایجوکیشن والے بھی ایسا کرنے لگیں...........کتنے کمل سری واستوا ہوں گے جو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے ہوں گے۔ کتنے گھروں کو ریئلیٹی نے برباد کیا ہے یہ تو تب معلوم ہوگا جب ایک نسل دوسری نسل کو نگلنے کے لئے تیّار کھڑی ہوگی۔

اُن کے جاتے ہی ڈاکٹر کپل کے اندر ایک طرح کی بے چینی پیدا ہوگئی۔ پھر وہ کلینک بند کر کے گھر لوٹ آئے۔

اُس رات اُن کے کانوں میں کمل سری واستوا کی ہی آواز گونجتی رہی تھی۔ وہ پوری رات نہیں سوئے۔

دوسری طرف بغیر دوا کے ماسٹر کمل سری واستوا مزدور والے لباس میں بخار اور درد سے تڑپتے رہے تھے۔ حالاں کہ بیوی اور بچوں نے کپڑا بدلنے کے لئے کہا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس چلنے کی ضد کی تھی۔ لیکن وہ کسی کی بات ماننے کے لئے تیّار نہیں ہوئے۔ لیکن وہ کیوں نہیں جانا چاہ رہے تھے اِس سے گھر والے لاعلم تھے۔

وہ رات جیسے تیسے ڈاکٹر کپل کی آنکھوں میں گذری۔ صبح ہوتے ہی اُنہوں نے اسکوٹر نکالی۔ اسکول پہنچے۔ گیٹ کیپر سے مل کر کمل سری واستوا کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ اور پھر وہاں سے سیدھے اُن کے گھر پہنچے۔

☆☆☆

39

اسکول، ایلین نسل اور برین واش

قارئین!

ریئلیٹی شو کی مقبولیت نے شوبھا کو بے راہ روی پر ڈال دیا تھا۔ اِس بے راہ روی کی عطا کردہ سستی شہرت، دولت اور عیش وعشرت نے پریتی کو ڈانس کے راستے جنس کی سنہری دلدل میں اُتارنے پر مجبور کیا تھا۔

وہیں........

کمل سری واستوا جیسے لوگ تھے جنہیں اپنی ٹیچنگ سے عشق تھا۔

عشق........

چاہے وہ خدا سے ہو۔

انسان سے ہو۔

یا پھر دنیا کی کسی شئے سے۔

انسان اُسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔

اتنا کہ کبھی کبھی وہ خود ''عشق'' کے دباؤ سے ٹوٹ جاتا ہے۔

منجمینٹ کے غلط اصولوں کی وجہ سے کمل سری واستو جیسے ٹیچر کو اپنے نوبل پروفیشن سے ہاتھ دھونا پڑا۔

عشق کا خمیازہ بیوی بال بچّوں کو بھوکے رکھ کر بھگتنا پڑا۔

لیکن اِس کے باوجود اُن کے عشق میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اب بھی کتابوں سے اُتنا ہی عشق کرتے تھے۔ وہ اب بھی طالب علموں سے اتنی ہی محبّت رکھتے تھے۔ اسکول سے اب بھی وہی لگاؤ تھا۔

لیکن اِس عشق، محبّت اور لگاؤ سے کیا ہوتا ہے؟

بھوک صرف پیٹ کو پہچانتی ہے۔

اور پیٹ بھرنے کے لئے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔

اور پیسے کمل سری واستوا کو اسکول سے ملتے تھے۔

☆

بھوکی آنکھوں کے سامنے کتابی اسکول بند ہو رہے تھے اور اُس کی جگہ سونگ ،ڈانس اور لافٹر اسکول ہزاروں کی تعداد میں کھُلتے رہے ۔ایسے وقت میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ جب کمل سری واستوا جیسے اساتذہ نے اپنی نم آنکھوں سے لوگوں کو یہ بتایا ہوگا کہ اُن کے کتابی اسکول بند ہو گئے ہیں۔اس کی جگہ ڈانسنگ اسکول کھُل گئے ہیں۔اور اُنہیں نوکری سے دستبردار کر دیا گیا ہے تو سوچئے کہ گھر والوں کی آنکھیں کس طرح بھیگی ہوں گی جن کے لئے نوکری ہی آخری سہارا تھی۔وہ سارے خواب کس طرح ڈانسنگ اسکول کی بنیادوں میں دفن ہوئے ہوں گے جن پر کل مستقبل کی عمارت کھڑی ہونی تھی۔

کمل کی بیٹی پنکی سری واستوا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ممّی اب تلک کے لئے اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے.........؟ اور اگر پیسوں کا انتظام نہیں ہوا تو منوج کے ساتھ میری شادی کیسے ہوگی۔ممّی! تم تو جانتی ہو کہ میں منوج کو کتنا چاہتی ہوں۔اور اُس کے گھر والے ایک ہی شرط پر راضی ہوئے ہیں کہ اُنہیں تلک میں پاپا موٹی رقم دیں گے۔''

''ہاں بیٹا! جب سے تمہارے پاپا نے بتایا ہے تب سے یہی بات مجھے گھُن کی طرح کھائے جارہی ہے.........لیکن فکر مت کرو۔تمہارا بیاہ منوج سے ہی ہوگا۔بھلے اِس کے بدلے ہمیں اپنا گُردہ ہی کیوں نہ بیچنا پڑے۔''

لیکن آج کل تلک ایک گُردہ کا چڑھاوا کہاں لیتا ہے۔؟

پورا کا پورا شریر مانگتا ہے۔

یہی اُس بیٹی کے تلک میں ہوا۔ایک کی جگہ دونوں گُردے منوج کے پریوار کو تلک

سوروپ بھینٹ کرنے پڑے۔بس اس کی بیٹی کو اِس بات کا افسوس تھا کہ ایک گردہ میں جب انسان زندہ رہ جاتا ہے تو اُس کی ماں کیسے مرگئی.........؟

کمل سری واستوا تو نوکری سے الگ ہوتے ہی ڈیلی ویج پر کام کرتے کرتے مشین کی زد میں آ کر اپنے دونوں ہاتھ گنوا بیٹھے تھے۔ریئلیٹی شو اُس کے لئے ایک ایسی قبرگاہ بن گئی تھی جس کے باعث اُن کا زندہ رہنا نہ رہنا کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا۔وہ بستر پر تھے اور رسم میں چاہ کر شامل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔اور اب جب تلک کے پیسے دیئے جارہے تھے اُس وقت ماں بھی سامنے نہیں تھی۔لیکن پرلوک سے وہ بیٹی کو دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

کس بات پر یہ صرف پرلوک والے ہی جانیں تو اچھا ہے۔

☆

لیکن اب کیا اچھا ہے.........؟

یہ بس وہ نوجوان سمجھ رہے تھے جنہوں نے رات دن محنت مشقت کر کے پروفیشنل ڈگریاں حاصل کی تھیں۔بی ایڈ کے لئے لاکھوں روپئے خرچ کئے تھے۔لیکن جب باری آئی نوکری کی لائن میں لگنے کی تو اُن کی ڈگریاں ریئلیٹی کی دیمک چٹ کر گئیں۔

اب اُن نوجوانوں کے سامنے صرف اندھیرا تھا۔

لیکن ویسے طالب علم جو ذہنی طور پر کمزور تھے۔پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔جن سے ٹیچر نالاں رہتے۔فیل ہونے کے بعد زیادہ تر ڈانس اور گانے کی چراگاہ کی طرف بڑھ گئے۔

آج اِن میں سے ہی زیادہ تر سنگنگ اور ڈانسنگ اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور نئی نسل اُنہیں صبح وشام سلام کر رہی تھی۔

''یار تمہیں نہیں لگتا کہ یہ وقت بھی عجیب ہے۔کبھی فیل کو پاس اور کبھی پاس کو فیل کرتا رہتا ہے۔''

''تو کیا سب کچھ وقت طے کرتا ہے۔اور اگر سب کچھ وقت طے کرتا ہے تو ہم کیا

کرتے ہیں۔ اگر ہم کچھ نہیں کرتے تو پھر وقت جو کرتا ہے اُس میں مین میخ کیوں نکالتے ہیں۔ اور اگر نکالنے کا اِتنا ہی شوق ہے تو رئیلیٹی کی اُس جڑ کو کیوں نہیں نکال دیتے، جس نے تہذیب کی دیواروں میں دراڑیں پیدا کردی ہیں۔''

''یار یہ بھاشن کا وقت نہیں ہے۔ وقت ہے سوچنے کا۔ وقت ہے اِس پر عمل کرنے کا۔ کیوں کہ آج ہی میری منگیتر نے فون کر کے بتا دیا ہے کہ اُس کی شادی اُس کے گھر والے اُس سے نہیں کرنا چاہتے۔ کیوں کہ وہ بے کار ہے۔''

''جسے ہم لوگوں نے بے کار سمجھا تھا آج وہی کار میں ہے.........اور جس ڈولی کو ہم نے پسند کیا تھا آج وہ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی آئس کریم کھا رہی ہے.........''

پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اس طرح کی باتیں اب عام ہوگئی تھیں۔

وقت کب کیسے اسٹیئرنگ بدل لے یہ کوئی نہیں جانتا۔ اُن میں سے کچھ لوگ راتوں رات اپور چونیٹی کے چوراہے سے یوٹرن لے کر صبح ہوتے ہوتے سنگر، ڈانسر اور لافٹر ٹیچر ٹریننگ کے فارم ہاتھوں میں سنبھالے روشنی کا حصّہ بن گئے۔

''ہاں یار جو فیصلہ ہم لوگوں نے وقت رہتے لیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔''

''ہاں! میرا بھی یہی ماننا ہے کہ جہاں سے پیسہ آئے اُسے ہی فیوچر پلان کا حصّہ بنانا چاہئے۔''

''لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ جو شو صرف ہمارے انٹرٹینمینٹ کے لئے تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے فیوچر پلان کا حصّہ کیسے بن گیا.........؟''

''یہ بولو کہ لوگوں کا برین واش کیسے کر دیا.........؟

''یہ سوچنے میں تم سب اپنا وقت برباد مت کرو۔ اِس پر غور و فکر کے لئے بڑے بڑے ایجوکیشنسٹ، مفکّر، فلاسفر اور نہ جانے کون کون اُوپر بیٹھے ہیں۔''

''لیکن اب صرف بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اُنہیں کھڑا ہونا ہوگا تاکہ دور تک نظر جاسکے۔''

☆

سرکاری شعبۂ تعلیم کی کرسیوں پر بیٹھے افسروں نے جب تھوڑا اُٹھ کر دیکھنے کی کوشش کی تو علم کے تئیں بچوں اور گارجین کی عدم دلچسپی نے اُنہیں حیران کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سب باہر نکلتے اور لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سمجھاتے، کھڑکیوں کی جالیوں سے چھن چھن کر آتی میوزک کی آواز کے ساتھ ساتھ گھنگھروؤں کی جھنکار نے اُن کے کانوں میں رس گھولنے شروع کر دیئے۔

پھر کیا تھا؟

ان کے پاؤں میں خود بخود بیڑیاں لگ گئیں۔ وہ دوبارہ کرسی پر براجمان ہوگئے۔ جس سے اُنہیں اپنے کام کو کرنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ اُنہوں نے اسکول کے احاطے میں جھانکنے کی کوشش کی تو اُنہیں سمجھتے دیر نہیں لگی۔ اور پھر اپنے ساتھیوں کو بُلا کر دکھایا۔

''اسکول کے باہر آپ لوگوں کو کچھ دکھائی دے رہا ہے۔''

سارے لوگ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

نہیں! یہاں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔

''ذرا اُچک کر دیکھنے کی کوشش کریں کہ وہاں کون لوگ ہیں۔''

کرسیوں پر چڑھ کر جب لوگوں نے دیکھا تو معلوم یہ ہوا کہ وہاں جو بھیڑ ہے وہ گارجین کی ہے۔

''ساتھیوں! اسکول کے باہر جو لوگ کھڑے ہیں وہ سب کے سب مغرب کی نقالی میں حُسن پرستی کے چولہے پر اپنے معصوم بچّوں کی ہانڈی چڑھا کر اپنے لئے عیش کی گرما گرم روٹی سینک رہے ہیں۔''

''سچ!''

''ہاں!!''

''ارے بھائی! اگر وہ اپنے توے پر اپنی روٹی سینک رہے ہیں تو اِس میں ہمارا کیا

جاتا ہے، سینکتے ہیں تو سینکنے دیں.........''

''یہی غلطی ہم میں سے کچھ لوگوں نے پہلی بار کی ہوگی۔ اور اِس کے بعد غلطی پر غلطی ہوتی چلی گئی ہوگی۔ اگر کسی نے پہلے پہل ہی بھیڑ پر کنٹرول کر لیا ہوتا تو.........

تو کیا آج یہ بھیڑ دکھائی دیتی؟ نہیں نا.........؟ تو پھر کیوں نہ ہم ہی پہل کریں اِس بھیڑ کو تتر بتر کرنے کی۔''

لیکن کوئی ہم نوا نہیں ملا۔

اکیلے اُنہیں ہی بھیڑ کا سامنا کرنا پڑا۔

پھر بھیڑ کا ایسا حصّہ بنے کہ نکل نہیں پائے۔

ساتھیوں نے گھنٹوں اُن کے لوٹنے کا انتظار کیا۔

لیکن وہ نہیں لوٹ سکے۔

لوٹ کر جب آئے تو لوگوں نے اُنہیں چار کاندھوں پر سوار کر دیا۔ اور یادگار کے طور پر اُسی چوراہے پر نصب کر کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دی۔

لیکن اس کے بعد پھر کسی نے بھیڑ کا حصّہ بننے کی ہمّت نہیں دکھائی۔

☆☆☆

40

دانشورانِ قوم، بس کی سیٹ اور بُک میوزیم

قارئین!

یوں تو رہنماؤں نے دانشورانِ قوم کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن کوئی بھی مستقبل کی مورت میں ڈھلنا نہیں چاہتے تھے۔ مخالفت جہاں بھی ہوئی اُس میں وہ دھار نہیں تھی کہ لہو کا اُبال جسم سے چھلکنے کے لئے بے تاب ہو جائے۔

اور یہ اُبال نہ ہو تو پھر کبھی انقلاب نہیں آ سکتا۔

انقلاب کے لئے صرف نعرے کی ہی ضرورت نہیں ہوتی جسم کی بھی ضرورت پڑتی ہے.........جب ہم جسم کو آرام پہنچانا چاہتے ہیں تو دماغ خالی ہو جاتا ہے اور زندگی کے سارے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔

اور یہ سارے رنگ اِس لئے پھیکے نظر آنے لگے کہ لوگوں نے زندگی کو دیکھنے کا نظریہ ہی بدل دیا تھا۔ جس کے پیشِ نظر جب کروٹ بدلتا وقت ہر چیز میں رئیلیٹی تلاش کرنے لگا تب اُن کے بچّے بھی رئیلیٹی کے رنگ میں رنگتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کیوں کہ وہ بھی اُسی سماج کا حصّہ تھے۔ وہ ہر روز رئیلیٹی پریمیوں کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔ وہ اُن کی ایک ایک ایکٹیویٹی پر نظر رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے بچّوں کا بھی چلنا، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا یہ سب الگ ہوتا گیا.........اب اُن کے ہاتھوں سے بھی کتابیں غائب ہونے لگیں اور اُن کی جگہ طبلہ، ڈھولک، بینجو، گیٹار نظر آنے لگے.........کچھ دنوں تک تو یہ سب کچھ بہت زیادہ مطلب نہیں رکھتا تھا کہ کس کے پاس کیا ہے؟

لیکن پڑھنے والوں کی تعداد میں جیسے جیسے کمی آنے لگی۔ یہ بچّے اپنے جیسے بچّوں کے ساتھ بس کی سیٹ شیئر کرنے میں ذلّت محسوس کرنے لگے۔ کیوں کہ اُس وقت دوسرے بچّے اُنہیں اِس طرح دیکھ رہے ہوتے جیسے اُن کا تعلق اِس زمین سے نہ ہو.........جیسے وہ

ALLIEN کی نسل ہوں۔

زمین پر جب بھی وہ ان آسمانی عجوبوں کو دیکھتے تو اُن کی کتابیں چھو کر پوچھتے۔

''وہاٹ از دِس ....؟'' گیٹار بجاتے بچّے نے شرارت سے کتاب چھو کر پوچھا۔

''کتاب۔''

''کتاب مِنس ....؟'' دوسرا بچّہ جس کے ہاتھ میں وائلین تھا، وہ اُس شرارتی بچّے کے کمپٹیشن میں کھڑا ہو گیا۔

''بُک۔'' اُس نے ایک چھوٹا سا جواب دے کر اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔

''اوہ! اچھا اچھا۔'' تیسرا بچّہ جس کے ہاتھ میں بینجو تھا اس نے بجاتے ہوئے کہا۔

''یہ بُک کہاں سے لایا؟'' ڈھولک والے بچّے نے کتاب کھینچنے کی کوشش کی۔

''کباڑی کی دکان سے ....'' کتاب والے بچّے نے اُن کی ذہنیت کو بھانپتے ہوئے غصّے میں کہا۔

''جھوٹ مت بولو۔ کباڑی والا بھلا ایسی فالتو چیزوں کو رکھ کر اپنا نقصان کیوں کرنے لگا؟ اب تو بُکس صرف میوزیم میں دیکھنے کو ملیں گی۔'' ڈرم اسٹِیک والے بچّے نے کتاب پر شرارت کی بیٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر کتاب کو اِس طرح سینے سے چپکائے رکھے تو ایک دن تم بھی میوزیم کے کسی کونے میں اسٹیچو کی طرح نظر آؤ گے۔ نیچے لکھا ہو گا ''پڑھا کو'' ....اور پھر دنیا والے ٹکٹ کٹا کر تمہیں دیکھنے جائیں گے۔ سمجھے پڑھا کو پیارے؟'' بانسری بجاتے ہوئے ایک نے مذاق اُڑایا۔

''لیکن یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے یار کہ ہم سب ان عجوبوں کو ریئلیٹی کے اِس زمانے میں دیکھ رہے ہیں۔''

سب سے موٹا بچّہ جو اپنے گینڈے پن کی وجہ سے خود کسی میوزیم سے بھاگا ہوا

لگ رہا تھا، اُس نے زور زور سے ڈھولک پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہ لگایا۔ دوسرے بچّوں نے بھی سُر میں سُر ملایا۔

اِس کے بعد بھی کسی نے اُنہیں سیٹ پر بیٹھنے نہیں دیا کہ وہ اپنے بینجو گٹار کہاں رکھیں گے؟ اُن کے چھوتے ہی قیمتی ساز بے سُر ہو جائیں گے۔ ایسے میں کنڈکٹر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتے۔ لیکن سمجھانے پر بھی وہ اُنہیں بٹھانے کے لئے تیّار نہیں ہوتے..........کئی بار سیٹ خالی ملتی تو وہ بیٹھ جاتے۔ لیکن جیسے ہی دوسرے اسٹوپیج پر ڈھولک طبلہ والے لڑکے چڑھتے تو وہ اُنہیں زبردستی سیٹ سے ہٹا دیتے۔ مار پیٹ کرتے..........اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اکثریت کے خلاف کچھ کر نہیں پاتے۔ اِن میں سے کئی بچّے جب گھر آتے تو رونا شروع کر دیتے۔ غصّے میں کتابیں پھینک دیتے۔

اُن کے والدین سوچتے کہ ہوم ورک کی وجہ سے ڈانٹ پڑی ہو گی۔ ٹیچر نے سب کے سامنے کوئی سخت سزا دی ہو گی۔ اِس لئے وہ اپنے لاڈلے/لاڈلیوں سے ہمدردانہ لہجے میں معلوم کرتے۔

''بیٹا کیا ہوا ہے..........؟''

''تمہیں اسکول میں کسی نے مارا ہے کیا۔؟''

''ارے کیوں رو رہے ہو، بتاؤ گے بھی کچھ..........''

'' اگر کسی ٹیچر نے مارا ہو گا تو اُس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔''

بہت پوچھنے کے بعد وہ روتے ہوئے جب منہ کھولتے تو ایسا لگتا ہے جیسے زبان کے پُرانے رکارڈ پر آواز کی سوئی ایک ہی دائرے میں بار بار چکّر کاٹ رہی ہے۔

''کل سے اسکول نہیں جاؤں گا..........کل سے اسکول نہیں جاؤں گا''

''کیوں نہیں جاؤ گے۔؟''

اٹکی ہوئی سوئی پر جب ''کیوں نہیں'' کا دباؤ پڑتا تو وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ جاتی ہے اور آواز دائرے کاٹنے لگتی ہے۔

''اب ہمیں کتابوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ گیٹار ہارمونیم والے ہمیں ہمیشہ بے عزّت کرتے ہیں۔ ہمیں بس وغیرہ میں اپنے ساتھ نہیں بٹھاتے، جیسے ہم اچھوت ہیں۔'' وہ رونے لگتے۔

''ہاں ہاں! اب پڑھائی کے نام سے ہمیں گِھن سی آنے لگی ہے۔ گھُٹن کا احساس ہونے لگا ہے۔ اب تو کسی بھی قیمت پر ہم اسکول نہیں جائیں گے......اسکول نہیں جائیں گے.........''

اِس طرح چلتے چلتے زبان کی سوئی ایک بار پھر رُک گئی تھی۔

اور ایک بار پھر بہت سارے گارجین نئے سرے سے سوچنے لگے.........کچھ سے بیٹا ربیٹی کے آنسو دیکھے نہیں گئے۔ اُنہوں نے بچّوں کی خوشی کی خاطر اسکول سے ٹی سی لے لیا تا کہ اُس کے بچّے بنجو گیٹار والوں کے ساتھ باعزّت سیٹ شیئر کر سکیں۔

لیکن کچھ ایسے بھی گارجین تھے جو ڈانٹ ڈپٹ کر، مار پیٹ کر، ڈرا دھمکا کر بچّوں کو اسکول بھیجتے رہے۔ جب بھی اُنہیں موقع ملتا وہ اُن کی تربیت کرنے بیٹھ جاتے۔

''دنیا میں ایجوکیشن سے بہتر کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے لوگ پڑھنا چھوڑ دیں اور سب کے سب ڈھول بجانے لگیں تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈھول کی اہمیت کتاب سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اِس لئے چپ چاپ اسکول جاؤ۔ پڑھائی کرو۔ اور مستقبل کے بارے میں زیادہ مت سوچو.........کیوں کہ ہم نے تمہارے لئے لاکھوں روپئے بینک میں فکس کر رکھے ہیں۔ اگر پڑھائی کے بعد نوکری نہیں لگی تب بھی بیٹھ کر کھاؤ گے۔ سمجھے.........؟''

ایسے ہی چند ایک پڑھے لکھے بنیاد پرست گارجین کی پیش قدمی سے جگہ جگہ اسکول اب بھی چل رہے تھے۔ لیکن اُس کا چلنا نہ چلنا کوئی مطلب نہیں رکھتا تھا۔ ایسے گارجین کا ماننا تھا کہ اگر پڑھائی سے دور ہوگئے تو پھر.........

دھارمک گرنتھوں کا کیا ہوگا.........؟

سماج کو نئی دشا کون عطا کرے گا.........؟

ملک ترقّی کے راستے پر کیسے آگے بڑھے گا.........؟

ایسی ذہنیت رکھنے والے گارجین کو آتے جاتے دیکھ کر بہت سارے لوگ ہنستے تھے۔ جان بوجھ کر راستہ روک لیتے تھے۔ مذاق ہی مذاق میں چھیڑتے تھے۔

''آپ اپنے بچّوں کو کہاں بھیج رہے ہیں؟''

''کہاں سے مطلب؟''

''میرا مطلب ....! لافٹر اسکول، ڈانسنگ اسکول، سنگنگ اسکول یا پھر ....؟'' پوچھنے والا تیزابی مسکراہٹ لئے اپنے دانت باہر نکال دیتا ہے۔

''اسکول۔''

''وہ کتاب والا اسکول۔؟'' دوسرا شخص طنزیہ لہجے میں پوچھتا ہے۔

''ہاں ہاں! لیکن یہ سب آپ کیوں پوچھ رہے ہیں.........؟''

''نہیں کچھ بھی نہیں.........بس پڑوسی ہیں اِس لئے پوچھ لیا۔ اور یہ سن کر اچھّا لگا کہ آپ ابھی بھی اپنے بچّے کو اسکول بھیج رہے ہیں.........'' تیسرا شخص جس نے نیتا کی طرح حلیہ بنا رکھا تھا۔ اس نے مسخرہ پن دکھاتے ہوئے کہا تو سب کے سب ہنسنے لگے۔

''آپ بچوں کو زبردستی پڑھانے پر کیوں تُلے ہیں۔؟''

''اس میں زبردستی والی کون سی بات ہے.........؟ جب ہم نے پڑھائی کی تھی اُس وقت ہم سے تو کسی نے زبردستی نہیں کی۔ آپ بھی تو پڑھے لکھے ہی لگتے ہیں۔ کیا آپ کے والدین نے آپ کے ساتھ کوئی زبردستی کی تھی۔؟''

سوال وجواب کا سلسلہ جاری تھا۔

کچھ گارجین ایسے بھی تھے جو نا مساعد حالات میں بھی نصیحت کرنے والے کو تابڑ توڑ جواب دے رہے تھے۔ اور ساتھ میں اُن سے سوال بھی کر رہے تھے۔ نصیحت کرنے والے چوں کہ اکثریت میں تھے اس لئے ہر بات کا جواب دینا اُن کے لئے ضروری نہیں

تھا۔جواب دیتے بھی تو اِس پیرائے میں کہ سوال سوالی بنا در پر کھڑا رہ جاتا۔

’’چلئے ٹھیک ہے۔لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا۔اور یہ زمانہ کچھ اور ہے۔اگر پیسے نہیں ہیں تو وہ ہم لوگوں سے لے لیجئے۔بچّے کو کچھ بنانا ہے تو پیسے تو لگانے ہی پڑیں گے۔ورنہ جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے تو بے روزگار بچّے آپ کی پرورش کیسے کر پائیں گے...........اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ تھوڑا پیسہ خرچ کر کے بچّے کو سنگیت ونگیت یا ڈانس اسکول بھیجئے۔ورنہ فیوچر کے سٹلمینٹ میں آپ کے بچّے پیچھے رہ جائیں گے۔‘‘ نیتا جیسی ٹوپی پہنے شخص نے نوٹوں کی گڈّی نکالی۔

آگے بڑھ جانے کے بعد بھی ہنسی کی ملی آوازیں دور تک اُن کا پیچھا کرتی رہیں۔

لیکن کب تک اور کہاں تک آوازیں اُن کا پیچھا کرتیں.........!

کسی نہ کسی کو تو پیچھے رہنا ہی تھا۔

کون پیچھے رہ گیا..........؟

☆☆☆

41

چائلڈ کیئر ایکٹ، کورٹ اور اخبار کی کٹنگ

قارئین!

پیچھے تو پریتی بھی رہ گئی تھی۔

نہیں نہیں وہ تو وقت سے بہت آگے گئی تھی۔خود سے بھی آگے........

خود سے آگے جانا اور خود سے پیچھے رہ جانا.........یہی وہ باتیں تھیں جس نے دونوں کے درمیان حدّ فاصل کھینچ دیا تھا۔فرق کو واضح کر دیا تھا۔اور اب اسی حدّ فاصل کو پریتی اپنے اندر شدّت سے محسوس کرنے لگی تھی۔

جب یہ شدّت کچھ اور بڑھی تو پریتی نے اُسے سوچ کا لبادہ پہنا دیا۔

اگر زندگی میں سب کچھ گیت سنگیت اور ڈانس ہے تو پھر کل آنے والی نسل کا کیا ہو گا........؟

سمندر میں پُل کون بنائے گا........؟

آسمان میں سٹیلائٹ کون بھیجے گا........؟

چار پر کمندیں کون ڈالے گا.......؟

مریضوں کو نئی زندگی کون دے گا........؟

اور یہ کون کرے گا........؟

اور وہ کون کرے گا........؟

........اب ایسے بہت سارے سوالات پریتی کے ذہن کے آسمان میں ستارے بننے لگے تھے۔وہ چاہ کر بھی کسی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔اُس نے سوچا کہ ممی سے پوچھ کر دیکھتے ہیں۔لیکن ہمّت نہیں ہوئی۔ایک دن ان ہی سوچوں میں گُم تھی۔شوبھا نے سبب پوچھا۔وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔لیکن پھر کچھ سوچ کر یکے بعد دیگرے سوالوں کی کڑی کو فکر کی

زنجیر بناتی چلی گئی۔۔

''یہ کون بنائے گا؟ اور وہ کون بنائے گا؟''

شوبھا نے جواب دینے کے بجائے اُسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''آئندہ ایسی فضول باتیں نہ ہی سوچنا اور نہ ہی مجھ سے کرنا۔ اِس طرح کی باتیں وقت کو برباد کرتی ہیں۔ کیریئر کو ایکسپلائٹ کرتی ہیں.........'' بات کے سرے کو پکڑ کر دوسری طرف گھماتے ہوئے اُس نے آگے کہا۔ ''اور رہی بات مریضوں کو نئی زندگی دینے کی؟ تو یاد رکھو کہ یہ سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ ورنہ ڈاکٹر کبھی نہیں مرتا.........ڈاکٹر کو بھی موت اُسی طرح دبوچتی ہے۔ اِس لئے بکواس سوچنا بند کرو اور دل لگا کر ڈانس کرو تا کہ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے۔''

پھر سمجھانے کے انداز میں۔ ''بیٹا آج کل سب کچھ پیسہ ہے۔ اور تم حُسن کی وہ مشین ہو، جس کا بٹن دباتے ہی نوٹ چھپ کر باہر آنے لگتے ہیں۔ اِس لئے اپنی اہمیت سمجھو۔ خود کو پہچانو۔ ایک دن ساری دنیا تمہارے قدموں میں ہوگی۔''

شوبھا اکثر اِس طرح کی باتیں کرتی۔

پریتی اِن باتوں کو خاموشی سے سنتی رہتی۔

لیکن اِس کے بعد بھی پریتی نے اپنی سوچ پر قدغن نہیں لگایا۔ جب بھی آنکھوں میں سوچ کے ستارے جھلملاتے۔ شوبھا اُس کی بے تابی کو بھانپ لیتی۔ پھر اِس کے بعد کیا تھا: جیسے ہی سورج آنکھوں کے سامنے پریتی کے جھلمل کرتے سوچ کے تارے آتے۔ اپنی روشنی کھو دیتے۔

☆

اب تو باپ کا اصلی چہرہ بھی اُسے یاد نہیں تھا۔ اُسے دیکھے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اور اب وہ چہرہ آنکھوں میں گُم ہونے لگا تھا۔ لیکن یادیں باقی تھیں۔ جسے وہ چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اور جب بھی وہ اُن یادوں کو اپنے اندر چھپانے کی کوشش کرتی۔ اکثر اس

کے اندر کا میگما پگھلنے لگتا اور اُس کے اندر کی پلیٹیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتیں۔ ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی۔ اُس وقت اُس کے چہرے کے رِکٹر اسکیل پر اندر کی اِس ہلچل کو بخوبی ریکارڈ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسے وقت میں وہ اپنے اندر کی ہلچل اور رِیکٹر اسکیل کے کنیکشن کو اپنی مسکراہٹ سے ڈسکنکٹ کرنے کی ایک ڈرامائی کوشش کرتی۔ اِس میں کبھی کامیاب ہو جاتی اور کبھی شوبھا کے ہاتھوں پکڑی جاتی۔

اُس دن بھی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

اخبار والا ابھی ابھی اخبار پھینک کر گیا تھا۔ پریتی کو ہر روز اخبار کا انتظار ہوتا۔ اور یہ انتظار اُس انتظار سے بہت حد تک مماثلت رکھتا تھا جو اُس نے اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ یہی ایک چیز تھی جسے وہ اب تک ساتھ لے کر چل رہی تھی۔ یعنی چائے کے ساتھ اپنے پاپا کی طرح اخبار کی ورق گردانی کرنا۔ اور اگر کوئی سرخی پسند آ گئی تو اسے اولیّت دینا۔

باہر جیسے ہی دروازے سے اخبار کے ٹکرانے کی آواز ہوئی پریتی ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔ ربر بینڈ میں لپٹا اخبار اُس کی طرف بے بسی سے اِس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح ہاتھ پاؤں بندھا ہوا شخص ملتجی نگاہوں سے سامنے والے کو دیکھتا ہے۔ پریتی نے وہیں کھڑے کھڑے اُسے ربر بینڈ سے آزاد کیا تو اُسے پہلے ہی صفحہ پر پاپا کی تصویر نظر آ گئی۔ پھر اُس نے دروازے سے جھانک کر ممّا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اُسے لگا کہ اب وہ بھی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے میک اپ میں مشغول ہے اور خود کو ہر اینگل سے دیکھ رہی ہوگی۔ اس نے دوبارہ تصویر پر نظر ڈالی اس تصویر کے ساتھ ایک اور بھی تصویر تھی۔ وہ تصویر اُسے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ کس کی ہو سکتی ہے؟......... پہلے پہل وہ پہچان نہیں پائی۔ لیکن آنکھیں بند کرتے ہی ماضی کے البم سے نکل کر ایک تصویر جھلملانے لگی۔ اُسے یاد آیا کہ یہ وہی ہے جس سے اُس کی ماں زبراً اپنے انڈر گارمینٹ دھُلوایا کرتی تھی۔

گذرے وقت کے اُسی البم سے نکل کر اُس کا ہمزاد سامنے آ گیا۔

''پریتی تم نے تو شیام سندر عرف شامو کو پہچان لیا۔ اب دیکھو کپڑے دھونے والا

، مالش کرنے والا آج کیا سے کیا بن گیا ہے..........ڈاکٹر کے لباس میں کتنا جچ رہا ہے؟''

وہ دروازہ بند کر کے سیدھے کمرے میں آ گئی۔ اخبار اُٹھانے کے بعد وہ ایسا کبھی نہیں کرتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر چائے کے ساتھ اخبار کا مزہ لیا کرتی تھی..........لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ اخبار لے کر قصداً بیڈ روم میں آ گئی۔ سب سے پہلے اُس خبر پڑھنا شروع کیا جس میں شیام سندر عرف شامو کے ڈاکٹر بننے کا قصّہ تحریر تھا۔

اُس میں ڈاکٹر کپل کے اُس خواب کا ذکر تھا کہ وہ بیٹی کو ڈاکٹر بنتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ایسا نہیں ہو پایا تو اُنہوں نے مشن کے طور پر اِس چیلینج کو قبول کیا اور نوکرانی کے بیٹے شامو کے اندر اپنے خوابوں کو انجیکٹ کر کے اُسے ڈاکٹر شیام سندر بنا دیا۔

پریتی کے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔

اِس سے پہلے کہ اخبار شوبھا کے ہاتھ لگے اور وہ اُسے چندی چندی کر آگ کے حوالے کر دے، تصویر کاٹ کر چھپا دینا چاہتی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر شوبھا اب بھی بیٹھی تھی۔

وہاں سے بیٹھے بیٹھے دروازے سے اخبار ٹکرانے کی آواز سُن چکی تھی۔ پریتی کے دروازہ کھولنے اور بند ہونے کی آواز بھی اُس کی سماعت سے ٹکرائی تھی، جس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اخبار اُٹھا کر پریتی اندر آ چکی ہے۔ لیکن جب ڈائننگ ٹیبل پر معمول کے مطابق چائے کے ساتھ اُسے اخبار پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تو اُس کے اندر شک وشبہات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ وہ آواز دیتے دیتے رُک گئی۔

پریتی اخبار کی اُس کٹنگ کو بیڈ کے نیچے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی کہ عین اُسی وقت شوبھا اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گئی اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔

''کیا چھپا رہی ہو۔؟''

''نہیں کچھ نہیں۔''

اس نے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے بیڈ کی دوسری جانب پھینکنے کی کوشش کی تا کہ

شوبھا کی نظر اُس پر نہیں پڑے۔

''نہیں کچھ تو ہے تمہارے ہاتھ میں جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟'' شوبھا کا شک کچھ اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

''میں نے کہا نا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

''نہیں کچھ تو ہے۔''

پریتی کسی بھی حال میں دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ کیوں کہ دکھاتے ہی واویلا شروع ہو جاتا۔ وہ بچنا چاہتی تھی اِس لئے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''وہ ایک لیٹر ہے۔''

''کس کا.........؟'' شوبھا نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''آفلورس کسی فین کا ہی ہو گا۔'' پریتی نے مسکراہٹ کے جال میں اُسے پھانسنا چاہا تا کہ سچّائی پر پردہ پڑا رہے۔

''ارے میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے یہ فین وین کے چکّر میں پڑ کر عشق وشق میں مت پھنس جانا۔ ورنہ عشق کا بھوت ساری زندگی ایک ہی کھونٹ سے باندھ کر رکھے گا۔ اور کولہو کی طرح پوری زندگی ایک ہی جگہ گھماتا رہے گا۔''

آنکھوں کے سامنے اب بھی پردہ پڑا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ جانے کے لئے مڑی اُس کی نظر اخبار کے اس حصّے پر پڑ گئی جہاں سے تصویر کاٹی گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ پھٹے ہوئے حصّے کو دیکھتی رہی..........تصویر تو پریتی نے جلد بازی میں کاٹی تھی، لیکن نیوز کا وہ حصّہ جو تصویر کے نیچے موٹی سرخی میں لپٹی ہوئی تھی غلطی سے اخبار کے ساتھ چپکی رہ گئی تھی۔

''ڈاکٹر کپل نے نوکرانی کے بیٹے کو ڈاکٹر بنا کر اتہاس رچا''

اب شوبھا کو سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا کہ پریتی کے ہاتھ میں کیا ہے اور وہ اُس سے کیا چھُپا رہی ہے اور کیوں چھُپا رہی ہے.......؟

لمحہ ٹھہر سا گیا تھا۔

لیکن شوبھا نے پریتی سے کچھ نہیں کہا۔ پریتی کو لگا جیسے اور نیوز آتے ہیں ممّی نے اُسے بھی اُسی طرح سے لیا ہے۔ لیکن کچھ ہی سکنڈ بعد پریتی کی یہ سوچ غلط ثابت ہوئی۔ شوبھا کے دائیں ہاتھ کا ایک بھرپور طمانچہ پریتی کے بائیں گال پر آ کر ٹھہر گیا۔

تڑاخ.........!

اُس وقت شوبھا کا غصّہ ساتویں آسمان پر تھا۔ اُس نے پریتی کے ہاتھ سے اخبار کی وہ کٹنگ چھین لی۔ ایک نظر تصویر پر ڈالی اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بین کے حوالے کر دیا۔

پریتی رونے لگی تھی۔

اور شوبھا چلاّئے جا رہی تھی۔

''تمہارے شاندار کیریئر کے لئے میں نے اتنی لمبی لڑائی لڑی ہے، اور تم ہو کہ اُس شیطان کا فوٹو رکھ رہی ہو۔ اور وہ بھی اُس نوکر کے ساتھ جسے میں اپنے ساتھ یہاں لانا چاہتی تھی کہ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد جب تھک جاؤں تو مالش والش کر کے میری تھکاوٹ نکال سکے۔ لیکن اُس حرام خور نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب تو تمہارے اُس کمینے باپ نے اپنی ساری پروپرٹی اُس کے نام کر کے تمہیں بھی اپنی جائداد سے بے دخل کر دیا ہے۔ تجھے بھی کہیں کا نہیں چھوڑا..........'' پھر دھمکاتے ہوئے۔ ''اگر تم نے آئندہ کبھی ایسی حرکت کی تو میں تمہارے ساتھ وہ کروں گی جو تم سوچ بھی نہیں سکتی۔ کوٹھے پر لے جا کر بیچ دوں گی یا سیدھے گلا دبا کر مار دوں گی۔ نہ رہے گی بانس نہ بجے گی بانسری۔''

شوبھا کی بانسری سے نکلنے والی اِس مدھر آواز پر پریتی کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو سحر زدہ ہو کر واپس آنکھوں میں لوٹ گئے۔

''لیکن مجھے جان مارنے کے بعد منتری جی کو کیا جواب دو گی، جس سے تم نے پیسے لے کر مجھے تیرہ سال کی عمر میں پہلی بار جوان کیا تھا، اور ان لوگوں کو کیا جواب دو گی جو

صرف میری وجہ سے آپ پر مہربان ہوتے رہے ہیں۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ کوئی تمہاری وجہ سے مہربان ہے۔ میں آج بھی جب بن سنور کر نکلتی ہوں تو قیامت ڈھاتی ہوں قیامت۔ سمجھی!'' یہ کہتے ہوئے وہ تن گئی تھی۔

''قیامت والی بات سے مجھے کہاں اِنکار ہے۔'' پریتی تنتے ہوئے سینے سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''لیکن پہلے یہ بتائیے کہ پاپا کے ساتھ یہ جو لڑائی ہے وہ کس کی ہے.........؟ میری، آپ کی یا پھر دونوں کی ہے؟''

''آفکورس تمہاری ہے۔''

''جی نہیں!''

''تم جو بھی کہو۔ لیکن سچّائی یہ ہے کہ میں نے تمہاری وجہ سے ہی تمہارے پاپا کو ٹھکرایا ہے۔''

''دیکھنے میں تو ایسا لگتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہے نہیں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ میں نے تمہارے کیریئر کے لئے یہ سب کیا ہے؟''

''اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے کیریئر کے بہانے آپ اپنا کیریئر سنوار رہی ہیں ۔ اِس طرح جس لڑائی کو آپ میری لڑائی کہہ رہی ہیں وہ صرف آپ کی لڑائی ہے۔ جھوٹی انا کی لڑائی ہے۔''

خبردار جو ایسی باتیں کیں۔ زبان نکال لوں گی حرم زادی۔''

شوبھا اُس کی طرف غصّے سے دوڑتی ہے۔ وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ پکڑنے کے لئے پھر آگے بڑھتی ہے۔ پریتی چھکا کر آگے نکل جاتی ہے اور کان پکڑ کر کونے میں کھڑی ہو جاتی ہے یہ سوچ کر کہ اگر زیادہ دوڑایا تو پھر اِس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑے گا۔ اِس لئے وہ رُک جاتی ہے کہ جتنا مارنا ہے مار لے۔ اُس وقت وہ چہرہ اِس طرح بنا لیتی ہے جیسے اُسے اِس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئے۔ ماں کا غصّہ کچھ دیر کے لئے شانت ہو جاتا ہے۔

لیکن وہ شوبھا کا غصّہ جانتی ہے۔

اور یہ بھی جانتی ہے کہ اُس نے اُسے حاصل کرنے کے لئے کس طرح کورٹ میں اُس کے باپ کے خلاف ایک لمبی لڑائی لڑی ہے۔

کورٹ کا منظر یکا یک اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

شوبھا چیخ رہی ہوتی ہے۔

''جج صاحب یہ کیا اِس لڑکی کی دیکھ بھال کرے گا۔ اِسے تو اپنے پیشینٹ سے فرصت نہیں۔ اِس نے تو گھر پر نوکرانی کو رکھیل بنا کر رکھا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اِس کمینے کے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔''

شوبھا نے جان بوجھ کر یہ الزام لگایا تھا تاکہ کپل کے ساتھ ساتھ وہ نوکرانی کو بھی سبق سکھا سکے۔

جج سوچ میں پڑ گئے۔

''آپ کے پاس اِس کا کوئی ثبوت ہے۔''

''جج صاحب! اگر میں غلط کہہ رہی ہوں تو اِس نوکرانی کی بچّی سے پوچھیئے کہ کیا یہ اپنے بیٹے کے ساتھ میرے گھر پر کام کرنے کے لئے تیار ہے .... لیکن جب تک یہ عورت ڈاکٹر کے گھر پر کام کرتی رہے گی میں اپنی بیٹی کو اِس کے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔'' اتنا کہہ کر شوبھا زور زور سے رونے لگتی ہے۔

''نہیں جج صاحب یہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' ڈاکٹر کپل کھڑا ہو جاتا ہے۔ ''میرا نوکرانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ لے جانا چاہتی ہے تو شوق سے لے جائے۔''

''جج صاحب اِن کے کہنے سے کیا ہوگا۔ پہلے نوکرانی سے تو پوچھ لیا جائے کہ کیا وہ اپنے بیٹے کے ساتھ میرے کلائنٹ کے گھر چلنے کے لئے تیار ہے۔؟'' شوبھا کے وکیل نے منصوبہ بند طریقے سے نوکرانی کے بہانے ڈاکٹر کپل کو گھیرنے کی کوشش کی۔

دوسری تاریخ کو پوچھ تاچھ کے لئے نوکرانی کو کورٹ میں حاضر کیا گیا۔

''نہیں وکیل صاحب نہیں! میم صاحب جو بھی کہیں۔ جتنی بھی گالیاں دیں۔ لیکن میں بھگوان جیسا صاحب کو چھوڑ کر اِس کے گھر نہیں جا سکتی۔ چاہے اِس کے بدلے یہ مجھے سونے چاندی میں ہی کیوں نہ تول دیں۔'' پھر اُس نے جج صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جج صاحب! یہ عورت نہیں ناگن ہے ناگن۔ اِس نے تو میرے بیٹے کو پوری طرح سے ڈس ہی لیا تھا لیکن وہ بھگوان کی کرپا سے بچ گیا.........'' اتنا کہتے کہتے وہ رونے لگی تھی۔

لیکن اِس سے پہلے کہ نوکرانی آگے کچھ اور کہتی، وکیل نے جج صاحب سے کہا۔

''مائی لاڈ! اگر میرے کلائنٹ کے حق میں فیصلہ کرنے سے آپ سنکوچ کر رہے ہیں تو اِس سے بہتر یہ ہوگا کہ کیوں نہ پریتی سے پوچھ کر دیکھ لیں کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔''

''آبجیکشن یور آنر! بچّی سے پوچھنے کا مطلب.........؟'' ڈاکٹر کپل کے وکیل نے روکنا چاہا۔

جج نے اُنہیں بیٹھنے کا اِشارہ کیا اور گردن ہلا کر شوبھا کے وکیل کو پریتی سے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

وکیل نے شوبھا کی گود میں ڈری سہمی پریتی سے سوال کیا۔

''بیٹا تمہیں ممی پاپا میں سب سے زیادہ کون پیار کرتے ہیں؟''

''ممّی۔''

اچھا اب یہ بتاؤ کہ تمہیں کس کے ساتھ رہنے میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔

شوبھا نے فراک کے اندر سے ایک بار پھر ویسی ہی چیونٹی کاٹی۔

''ممّی۔''

''جج صاحب! اب میرا بس اتنا کہنا ہے کہ پریتی جس کے ساتھ رہنے میں خوشی محسوس کرے اُسے اُس کے ساتھ رہنے دیا جائے۔''

''آبجیکشن یور آنر! پریتی ابھی بچّی ہے۔ اور اِس عمر میں فطرتاً ہر بچّے کا لگاؤ ماں

کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر بچّے کا پوزیشن اُن کی ممی کو دے دیا جائے۔میرے کلائنٹ پیشے سے ایک ڈاکٹر ہیں جو اپنی بچّی کی دیکھ بھال اچھّی طرح سے کر سکتے ہیں۔اِس لئے پریتی کو ڈاکٹر صاحب کے حوالے کیا جانا چاہئے۔ دیٹس آل یور آنر۔‘‘

شوبھا نے نوکرانی کو لے کر جس طرح کی کہانی گڑھی تھی اور رونے دھونے کا جو ناٹک کیا تھا اُس کی وجہ سے جج صاحب کچھ کنفیوز ہو گئے اور جھانسے میں آ گئے۔اِس لئے جب فیصلہ سنایا گیا تو ڈاکٹر کپل ہکا بکّا رہ گئے۔

’’تمام کارروائیوں پر مدِّ نظر رکھتے ہوئے عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پریتی کا لگاؤ ماں سے زیادہ ہے۔چائلڈ کیئر قانون کے مطابق بچّہ جہاں خوش رہے اُسے وہیں رہنے دیا جانا چاہئے۔ اِس لئے پریتی کو شوبھا کو حوالے کیا جاتا ہے۔لیکن ایک باپ ہونے کے ناطے ڈاکٹر کپل کو مہینے میں ایک بار پریتی سے ملنے کی اجازت ہوگی.........‘‘ چشمے کو ٹھیک کرتے ہوئے آگے کہا۔’’لیکن جس دن پریتی بالغ ہو جائے گی اُس دن وہ آزاد ہے جس کے ساتھ چاہے رہ سکتی ہے۔ماں کے ساتھ بھی، باپ کے ساتھ بھی، دونوں کے ساتھ یا پھر دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں۔اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بھی اپنا گھر بسا سکتی ہے۔‘‘

42

عورت، لیسن پلان اور قانون کے جوتے

قارئین!

فیصلہ ہو چکا تھا۔

اب قانون کے جوتے میں پریتی کے پاؤں سما چکے تھے۔شوبھا خوش تھی کہ ڈاکٹر کپل بہلا پھسلا کر بھی پریتی کے قدم اٹھارہ سال سے پہلے اپنے گھر کی طرف نہیں موڑ سکتے ....اور تب تک وہ اُس کے سر سے پاپا کا بھوت اِس طرح اُتار دے گی کہ وہ یاد کرنے کے قابل ہی نہیں رہے گی۔

اُس شام شوبھا کے یہاں جشن کا ماحول تھا جیسے اُس نے کپل کو ہرا کر دنیا جیت لی ہو۔اِس کے بعد ڈاکٹر کپل کے لئے ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔کسی طرح سے اُنھوں نے خود کو سنبھالا تھا۔یہاں تک کہ فیصلے والی رات وہ اِتنے پریشان تھے کہ اگر اکیلے ہوتے تو خودکشی کر لیتے۔اُس رات ڈاکٹر حامد عالم اُس کے گھر رک گئے تھے۔کورٹ میں بھی ساتھ ساتھ تھے۔ایک دوست ہونے کے ناطے اُنہیں انہونی کا ڈر تھا۔وہ پوری رات نہیں سوئے تھے۔اُس کے ساتھ ہی لیٹے رہے تھے۔سمجھاتے رہے تھے۔اِس وجہ سے سورج کی پہلی کرن نے ڈاکٹر کپل کے چہرے سے رات کے تناؤ کو کچھ کم کر دیا تھا۔

رات جو بات حمید عالم نے کہی تھی وہ اب اُنہیں سمجھ میں آنے لگی تھی۔

’’یار کپل! ہر کسی کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب وہ اندر سے ٹوٹتا ہے۔اگر ہر کوئی ایسے میں خودکشی کر لے تو پھر اِس خوبصورت دنیا کا کیا ہوگا.........؟ مزا تو تب ہے کہ ایسے حالات میں خود پر قابو رکھ کر ٹوٹتے بکھرتے لمحے کو اپنی مُٹھی میں قید کر کے خوشیاں حاصل کی جائیں۔‘‘

یہی وہ معنیٰ خیز جملے تھے جس نے اُنہیں اُس رات خودکشی کرنے سے باز رکھا تھا۔

جس کے بعد شروع ہوئی جینے کی چاہت ....اس چاہت نے اُنہیں شیام سندر سے بہت قریب کر دیا۔اتنا قریب کہ زندگی کے معنیٰ بدل گئے ۔

زندگی کا مطلب..........شیام سندر!

شیام سندر کا مطلب.......... پریتی!!

پریتی،شیام سندر!

شیام سندر، پریتی!!

☆

پریتی اخبار سے تصویر کاٹنے کے جرم میں پکڑی جا چکی تھی ۔

اُس دن اُسے شوبھا کے غصّے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ مار بھی کھائی تھی ۔لیکن اِس نے پہلی بار ماں کے خلاف کچھ کہنے کی جُرأت کی تھی ۔اُس کی ہمّت دیکھ کر شوبھا حیران رہ گئی تھی ۔اور حیرانی کی بات بھی تھی کہ جس نے کبھی زبان نہیں کھولی ہو وہ اچانک اتنی بڑی بات کیسے کہہ گئی ۔

’’پاپا کے ساتھ جو لڑائی ہے وہ میری نہیں آپ کی ہے ۔‘‘

اگر پریتی یہ بات زندگی بھر نہیں کہتی تب بھی شوبھا اِسے اپنی ہی لڑائی سمجھتی ۔لیکن جب سمجھانے کی بات آتی تو وہ اِس لڑائی کو پریتی کی لڑائی کہہ کر باپ اور بیٹی کے بیچ کے نفاق کو کچھ اور بڑھانے کی کوشش کرتی تا کہ نفاق کی کھائی گہری ہوتی جائے ۔

’’نہیں تم غلط فہمی کا شکار ہو ۔ یہ صرف تمہارے کیریئر کی لڑائی ہے ۔‘‘

شوبھا نے مار پیٹ کر ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا بُجھا کر اُس کے ذہن میں ایک بار پھر یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ اِس لڑائی کے پیچھے کا سچ کیا ہے ۔ یہ سب اُس کی وجہ سے ہوا ہے ۔ جو عورت کے سمّان کی لڑائی ہے اور آزادی کی بھی ۔‘‘

پاپا نے ایسا کیا کیا تھا ، جس سے عورت کی آزادی اور عورت کے سمّان کو چوٹ لگی ہو ۔لیکن کیریئر کی بات اُسے سمجھ میں آ رہی تھی کہ کیریئر ممّا نے چُنا تھا اور پاپا نے ہمیشہ اُس کی

مخالفت کی تھی ۔

مخالفت کا یہی درس شوبھا اُسے اکثر پڑھایا کرتی ۔ اب اُسے لگنے لگا تھا پریتی بڑے چاؤ سے سبق یاد کرنے لگی ہے تب شوبھا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا کہ جو اُس نے جو لیسن پلان تیار کیا تھا وہ کارگر ثابت ہو رہا تھا۔

اُن درسی چیزوں کے علاوہ بھی پریتی کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ۔

اخبار ہر روز مطالعے میں رہتا ۔

ہر روز اُس کی آنکھیں صفحات میں کچھ ڈھونڈتیں ۔

اور پھر جب ایک دن شیام سندر کی زندگی پر آرٹیکل آیا تو ساتھ میں ڈاکٹر کپل کی بھی تصویر تھی ۔ ایک لمحے کے لئے تو ایسا لگا کہ آنکھیں جِسے ڈھونڈا کرتی تھیں وہ سامنے آ گیا ہے ۔اب اِدھر اُدھر دیکھ کر پریتی چھپانے کی کوشش کرے گی ۔تصویر کاٹ کر اپنی فائل میں محفوظ کر لے گی ۔لیکن یہ کیا..........؟ شوبھا باتھ روم میں تھی اور وہ زور زور دروازہ کھٹکھٹائے جا رہی تھی ۔ پھر شوبھا بھی ہڑبڑا کر آدھے ادھورے میں ہی باہر نکلی جیسے پریتی کو کچھ ہو گیا ہو ۔ جب اُسے صحیح سلامت پایا تو حیران ہوئی ۔لیکن اُس کی حیرانی تب خوشیوں میں بدل گئی جب پریتی نے اخبار میں چھپی تصویر کو اُس کے سامنے پھاڑ کر ہواؤں میں لہرا دیا تھا۔ اُس کی اِس ادا پر وہ پھولے نہیں سما رہی تھی ۔ سینے سے لگاتے ہوئے بولی ۔

’’بیٹی !تم نے ماں کا دل جیت لیا ہے ۔آج جو مانگو گی ملے گا تجھے ۔‘‘

اُس نے اندر ہی اندر کہا.........’’پاپا‘‘

’’بول بیٹی بول ۔آج تیری ماں بہت خوش ہے ۔‘‘ شوبھا نے پُر جوش لہجے میں کہا ۔

’’کیا مانگوں ۔؟ سب کچھ تو ہے میرے پاس ۔‘‘ پریتی نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا ۔’’جس کے پاس اتنی پیاری ماں ہو اُسے بھلا کسی اور چیز کی ضرورت کیوں ہو گی ؟ ۔‘‘

شوبھا ایک طرح کی نفسیاتی جیت کی اِس خوشی میں ضدّی بچّے کی طرح اپنی بات

منوانے کی کوشش میں اڑی رہی۔

''تمہیں اپنی پسند کی کوئی بھی ایک چیز آج مانگنی ہی ہے۔''

''اچھا مما آپ ہی بتائیں کہ میری جگہ آپ ہوتیں تو ایسے موقع پر کیا مانگتیں۔''

پریتی نے سوچا جو وہ مانگنا چاہتی ہے وہ تو کسی بھی قیمت میں مانگ نہیں سکتی۔ اور جو نہیں مانگنا ہے اُسے مانگ کر فائدہ کیا۔ اس لئے اُس نے سب کچھ ممّی کے ہی سر ڈال دیا۔

''میں کیا مانگتی.........؟''

''ہاں آپ.........!''

''میں.........میں اپنی مرضی بھری ایک ایسی رات مانگتی، جس کی کوئی صبح نہ ہو۔''

شوبھا نے یہ کہتے ہوئے اُسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔ اور وہ کچھ دیر تک کسمساتی رہی تھی۔ خوشیوں کی یہ گرفت جب ڈھیلی پڑی تو پریتی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''مما آپ کو اس طرح کی بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ آپ اپنی بیٹی کو مرضی بھری ایک رات جینے کا کھلا آفر دے رہی ہیں۔''

''ارے نہیں بیٹی وہ تو میں اپنی بات کہہ رہی تھی۔'' شوبھا ایک ماں کے بچاؤ میں تھوڑی دیر کے لئے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''ہاں کہہ تو آپ اپنی رہی تھیں، لیکن اُس میں در پردہ میری رات کا ہی ذکر تھا۔''

پریتی نے ماں کے جملے سے سچ کا پردہ اُٹھایا تو اُس نے اپنے اندر کا ایک اور سچ سامنے رکھ دیا۔

'' بیٹی! دنیا کی زیادہ تر لڑکیاں جوانی میں قدم رکھتے ہے ماں کے سائے تلے گھٹ گھٹ کر زندہ رہتی ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسی 'ماں' ملی ہے۔ جو تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے۔''

''تم نے پاپا کی ضرورتوں کا تو خیال ہی نہیں رکھا تو میرا کیا رکھو گی۔'' وہ اندر ہی

اندر بُد بُدائی۔

شوبھا کو لگا کہ اُس نے کچھ کہا ہے۔ لیکن پوچھنے پر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکرا کر رہ گئی۔

مسکرانے کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا، کیوں کہ جس طرح سے کورٹ کی لمبی لڑائی کے بعد شوبھا نے اُسے ہتھیایا تھا وہ اُس کے معصوم ذہن میں اب بھی محفوظ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ماں کے خلاف نہیں جا سکتی تھی۔

اُس کے عیش و آرام پر بریک نہیں لگا سکتی تھی۔

بریک لگانے کا مطلب تھا۔ خود سے اپنی چلتی پھرتی سانسوں پر بریک لگانا۔ وہ کسی بھی قیمت پر ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

کیوں کہ وہ جینا چاہتی تھی۔

دنیا کو اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ ایک ایسی زندگی جینے کی آرزومند تھی۔ جہاں کسی دوسرے کا دخل نہ ہو۔ صرف اُس کی مرضی چلے.........لیکن ابھی یہ سب کچھ اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔

کیوں کہ وہ ابھی اٹھارہ کی نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

43

نئی گلوبل بیوٹی، اور ٹین ایج آئیڈیل تھیوری

قارئین!

ڈانسنگ اسکول سے لے کر ماڈلنگ تک پریتی کی ٹین ایج بیوٹی کو جتنا کیش کرانا چاہتی تھی شوبھا کرا چکی تھی۔ اب تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ میچیوریٹی میں قدم رکھنے لگی تھی ۔جیسے جیسے وہ میچیور ہو رہی تھی ویسے ویسے اُس کے اندر سمجھ داری کی پرت، تہہ در تہہ جمتی جا رہی تھی۔

نئی گلوبل بیوٹی کی نظریاتی تھیوری کے مطابق .... ''حُسن کی عمر چودہ سے اٹھارہ سال ہے۔ اِس عمر سے جہاں لڑکیاں تجاوز کر گئیں، سمجھئے حُسن میں اسٹیگ نیشن آ گیا۔ اس کے بعد وہ صرف بچّہ ہی جن سکتی ہیں۔''

اِس تھیوری کے مدّنظر حُسن کے نئے گلوبل ولیج میں ٹین ایجر کی مانگ میں دن بدن اِضافہ ہو رہا تھا۔ اور یہ سب اِس لئے ہوا کہ لوگوں کا نظریہ پھول کے تئیں بدل گیا تھا ۔کیوں کہ پھول کی قسمت میں مرجھانا ہے، جب کہ کلی میں مرجھانے کا عمل بہت بعد میں شروع ہوتا ہے اور پائداری زیادہ ہوتی ہے.........پھول بننے کے عمل میں ہزاروں آنکھیں اُس سے الجھتی ہیں ۔لیکن 'کلی' بذاتِ خود اِس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ ابھی چند ایک آنکھیں ہی لذّتِ لمس سے سرفراز ہوئی ہوں گی۔ یا پھر اُس کی آنکھیں ہی پہلی ہیں۔ اَن چھوئے پن کا یہی وہ احساس ہے، جس نے آہستہ آہستہ 'مرد ذات' کو کلی کی طرف راغب کیا۔ ورنہ آج سے پہلے گلدانوں میں پھول سجانے کا رواج تھا۔ کلیوں کو توڑنا سماجی بے ادبی میں شامل تھا۔ لیکن اب یہی موڈرن سماج کے گلے کی عزّت و توقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوبھا جیسی ماؤں نے بچیوں کے جسموں میں وقت سے پہلے شبابی دوائیاں انجیکٹ کرنا سیکھا۔

شوبھا نے بھی پریتی کی جانگھوں میں کئی انجیکشن لگائے۔ پریتی کے ایسے بال و پر نکلے تھے کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ لیکن اس کا سائڈ ایفیکٹ بھی تھا کہ جب ریئل جوانی کا وقت آئے گا تو اُس کا حسن گہنانے لگے گا۔

پریتی ابھی سترہ کی ہی تھی۔ اور سب کچھ اُس کے اندر موجود تھا۔

جب کسی شئے میں اُس کی خصوصیت کے مطابق سارے اوصاف موجود ہوں اور اُس وقت بولی لگائی جائے تو قیمت اچّھی ملتی ہے۔ ایسے میں کوئی فریش لیگس ایسی نہ آ جائے جو راتوں رات راج ملہوترہ کی نیندیں اُڑا کر اُس دل پر راج کرنے لگ جائے۔

اِس خیال نے اُسے اندر ہی اندر خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب جیسے بھی ہو پریتی اپنے لٹکوں جھٹکوں سے جلد اُسے پھانس لے اور 'راج بار اینڈ ڈانس کلب' کی راج رانی بن جائے۔ بچّے پیدا کرے..........اور اگر نہیں بھی کرے تو بھی کوئی بات نہیں۔ بس اُس کی زندگی کے آخری دن بھی عیش کی چھاؤں میں گذرنی چاہئے۔

عیش کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے کہ جب بھی کسی کے سر چڑھ کر بولتا ہے تو وہ نہ آگے دیکھتا ہے اور نہ پیچھے، منزل تک پہنچنے کے جنون میں اکثر زندگی کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔

شوبھا کے اوپر بھی کچھ ایسا ہی نشہ چھایا تھا۔

لیکن یہاں ہارنے کے لئے اُس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ جیتنے کی صورت میں کروڑ پتی داماد اُس کی مُٹھی میں آ رہا تھا اور ہارنے کے بعد بھی راج کی کروڑوں کی پراپرٹی پریتی کی ہونے والی تھی۔

پریتی کا مطلب اُس کا ہونے والا تھا۔ اِس طرح وہ پوری زندگی راج کی پراپرٹی پر راج کر سکتی تھی۔

اِدھر شوبھا کی آنکھیں یہ دیکھنے لگی تھیں کہ راج ملہوترہ تمام بار بالاؤں میں پریتی کو عزیز رکھتے ہیں۔ اِس پر دل سے مرتے ہیں۔ اُس پر جان چھڑکتے ہیں۔ ایک دن موقع غنیمت جان کر اُس نے بات ہی بات میں راج کے دل کو ٹٹولنا چاہا۔

''ارے بھئی راج! کیا بات ہے؟ آج کل میں دیکھ رہی ہوں کہ تم پریتی پر بہت زیادہ بھروسہ کرنے لگے ہو۔''

''شوبھا جی اِس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ پریتی نے اپنے پرفارمینس سے میرے گراہکوں کا ایسا دل جیتا ہے کہ پیسے کی ریل پیل ہوگئی ہے ....اور آپ سے کیا چھُپانا؟ اب تو وہ گراہک بھی ہمارے یہاں آنے لگے ہیں جس نے ہمارے بار میں آنے سے توبہ کر لی تھی۔ سچ پوچھئے تو پریتی جیسی ڈانسر یہاں کسی ڈانس بار میں نہیں ہے۔'' راج نے صاف دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پریتی کی جم کر تعریف کی۔

''اور اگر مان لو کسی نے پریتی کو بہلا پھُسلا کر اپنے ڈانس بار میں جوائن کروا لیا تو ....؟'' شوبھا نے آنکھوں کے اشارے سے اُس کے دل پر سوالیہ نشان بنا دیا۔

''تو میں تو مر جاؤں گا شوبھا جی ....میرا پورا بزنس ہی چوپٹ ہو جائے گا۔''

راج نے شوبھا کا ہاتھ اِس طرح تھام لیا جیسے پریتی کے جاتے ہی اُس کا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

''راج اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو تم کھُل کر پریتی سے بات کیوں نہیں کرتے۔''

رازدارانہ انداز میں شوبھا نے اُس کے کان میں کہا۔

''بات.........کیسی بات.........؟'' راج نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ تم اُس سے پیار کرتے ہو۔''

شوبھا نے جیسے ہی اِس بات کا انکشاف کیا راج کی باچھیں کھِل گئیں۔

''شوبھا جی! سچ تو یہ ہے کہ میں اُس سے بے انتہا پیار کرتا ہوں۔ لیکن آپ سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں ناراض ہو گئیں اور پریتی کو لے کر چلی گئیں تو.........؟''

''چلو اب تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میری طرف سے گرین سگنل ہے.........
اب دیکھنا یہ ہے کہ جس نے اپنی زندگی میں اَنگنت لڑکیوں کو پٹایا ہوگا وہ پریتی کے آگے عشق کا جال کیسے ڈالتا ہے۔'' شوبھا نے ماہر مچھوارے کی طرح جال اس کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔

''لیکن شوبھا جی! مجھے اِس کے بعد بھی ڈر لگ رہا ہے کہ اِس میں سنہری مچھلی پھنس پائے گی بھی یا نہیں..........؟'' راج کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔

''ارے کیسے نہیں پھنسے گی۔ جال ڈال کر تو دیکھو..........؟'' شوبھا نے کسی ماہر شکاری کی طرح حوصلہ افزائی کی۔

''اگر جال میں کسی طرح پھنس بھی گئی تو کیا آسانی سے ہاتھ آپائے گی.........؟''

''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو..........''

شوبھا نے بےفکری سے اِس طرح کہا جیسے پہلے سے اُسے سب کچھ معلوم ہو کہ پریتی مان جائے گی۔ نہیں مانی تو وہ کسی طرح سے اُسے منوا لے گی۔ اتنا اُسے اپنے آپ اُوپر بھروسہ تھا۔

''میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اِس نیک کام میں میری اِس طرح سے مدد کریں گی۔ ساسو جی! خوشی کے اِس موقعے کی شروعات میں 'گفٹ' سے کرنا چاہتا ہوں تا کہ آج کا یہ دن یادگار بن جائے۔'' راج نے گفٹ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اس سے اچھّی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔'' شوبھا نے اُس کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اُس کی سوچ کو سراہا۔

''کہئے پریتی کو کیا پسند ہے؟'' راج نے شاہانہ انداز میں پیشکش رکھی۔

''کپڑے میں یا جیولری میں.........؟'' شوبھا نے اُس کے شاہانہ انداز کو لفظوں کے ترازو میں تولنا چاہا۔

''ارے کپڑے تو دو چار دن میں پھٹ جائیں گے شوبھا جی۔ میں اِس وقت بات جیولری کی کر رہا ہوں۔'' راج کا شاہانہ انداز کچھ اور نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔

''سونے کے تو بہت ہیں اُس کے پاس۔ ویسے آپ کی مرضی..........'' شوبھا نے یہ بات اِس طرح سے کہی کہ راج کو وہ بھی سمجھ میں آ گیا جو اُس نے کہا نہیں تھا۔

''مرضی تو آپ کی ہی چلے گی۔ سونے ہیں تو ہیرے لے لیجئے۔'' راج کے

چہرے پر ہیرے جیسی چمک اُس وقت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''نہیں نہیں راج! ہیرے ویرے کے ہار تو بہت مہنگے پڑیں گے۔ رہنے بھی دو۔ اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت.........؟'' شوبھا نے ہمدردانہ لہجہ صرف دکھاوے کے لئے استعمال کیا تھا۔

''کیسے رہنے دوں.........اور پھر خوشی کی خاطر کیا سستا اور کیا مہنگا۔ بس دینا ہے تو دینا ہے۔ چاہے گھر بار ہی کیوں نہ بِک جائے۔'' راج ملہوترا پریتی کے حُسن کے ایسے اسیر ہو گئے تھے کہ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

''اور اب جب اتنا سمجھانے پر بھی تم نہیں مان رہے ہو تو جیسی تمہاری مرضی ....ویسے میری مرضی پر چلو گے تو ساری زندگی جوان بنے رہو گے۔'' شوبھا نے اُس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے اُسے جوان بنے رہنے کا سبق یاد کرا دیا۔

اُس دن راج شہر کے سب سے بڑے برانڈیڈ جیولری شاپ سے پریتی کے لئے ہیرے کا ہار خرید لایا۔ اور اُسے شوبھا کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

''اس ہار میں میری پریتی بہت سندر لگے گی۔''

☆

راج کی طرف سے جب شوبھا کو پوری طرح سے اطمینان ہو گیا تو اُس نے پریتی سے بات کرنا چاہی کہ اگر وہ مان گئی تو ٹھیک ہے اور اگر نہیں مانی تو پھر منوانے کا کوئی اور راستہ اختیار کرے گی۔

''پریتی تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اِس لائن میں کتنا ٹف کمپٹیشن ہے۔ اور اب بدقسمتی سے تم اٹھارہ کی ہونے جا رہی ہو۔''

''ہاں تو.........؟''

پریتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی ممّا کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

''تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اٹھارہ کی ہوتے ہی تمہارے حُسن کا اِمیج دھندلا

جائے گا۔ جس کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ایسے میں جب ہر طرف سے ناکامی ہاتھ آ رہی ہوگی۔ تمہارے لئے خود کو سنبھال پانا بہت مشکل ہو جائے گا.........''

''کیسی مشکل.........؟''

دیکھو بیٹا! جس عیش سے ہم نے اب تک زندگی گذاری ہے اگر باقی کی زندگی اُسی طرح بسر نہیں ہوئی تو لوگوں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم کروڑ پتی راج ملہوترہ سے شادی کر لو۔'' شوبھا نے مستقبل کو سامنے رکھ کر پریتی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں......؟''

''ہاں تم۔''

''لیکن ممّا.........؟''

''ممّا وما کچھ نہیں۔ بس مائنڈ سیٹ کر لو۔ اور باقی مجھ پر چھوڑ دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچّی ....'' پھر رازدارانہ انداز میں اُس نے پریتی سے کہا۔ ''راج کسی وجہ سے تمہیں پسند نہیں آیا، یا بعد میں کوئی اور تمہیں مل گیا تو چھوڑ دینا.........اور ویسے بھی کون سا تمہیں زندگی بھر اُس کے پلّو سے بندھا رہنا ہے۔ سال دو سال میرے حساب سے بہت ہے.........پھر پوری زندگی کی آزادی۔''

لیکن شوبھا کے اِتنے سمجھانے کے باوجود پریتی نے چالاکی سے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''ممّا بھلے ہی دواؤں نے جسمانی طور پر مجھے وقت سے پہلے جوان کر دیا ہو لیکن آپ تو جانتی ہیں کہ ابھی قانوناً میں 'بالغ' نہیں ہوئی۔'' پھر اُس نے قانون کا پاٹھ پڑھاتے ہوئے آگے کہا۔ ''اگر شادی ہوتی ہے اور کوئی کیس کر دے تو آپ اور آپ کا داماد راج جیل کی ہوا کھاتے نظر آئیں گے۔ اور پھر میں جب تک اٹھارہ کی نہیں ہوتی تب تک میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی.........رہی بات آپ کی تو اِس سلسلے میں آپ کو جو سوچنا

ہے سوچیں ۔راج ملہوترہ کو کیا کہنا ہے وہ آپ دیکھیں ....ویسے اب تک کی میری زندگی آپ کے اشارے پر ہی ناچتی رہی ہے۔لیکن ایک بات آپ اُس راج کو بتا دیں کہ جب تک شادی نہ ہو وہ مجھے ہاتھ تک نہ لگائے۔''

شوبھا کو پریتی کے اِس آخری جملے سے اُس وقت کوئی مطلب نہیں تھا۔بس اُسے خوشی اِس بات کی تھی کہ وہ راج کے ساتھ شادی کے لئے راضی ہوگئی ہے۔

دوسرے دن جب شوبھا ڈانس بار میں پریتی کو لے کر آئی تو اُس نے موقع غنیمت جان کر راج سے پریتی کی بات کہہ دی۔

''ایسا ہے راج کہ وہ شادی کے لئے تو مان گئی ہے۔لیکن اس کی ایک شرط ہے کہ تم شادی سے پہلے اُسے ہاتھ تک نہیں لگاؤ گے۔''

''آپ کہیں تو ساسو ماں! میں پیر تک نہیں لگاؤں گا۔'' راج نے خوشی کے اِس موقعے پر مذاقاً کہا۔

''راج یہ وقت مذاق کا نہیں ہے ۔سوچنے کا ہے.........ویسے اگر کبھی تم نے اُسے منا لیا تو ہاتھ پیر کیا کچھ بھی لگا سکتے ہو۔'' شوبھا یوں تو اُسے مذاق نہیں کرنے کی تلقین کرتی ہے لیکن خود داماد سے اُس طرح کا مذاق کرتی ہے جو مشرقی کلچر کے منافی ہے۔

''آپ بھی شوبھا جی بہت مذاقیے ہو۔آپ جیسی ساسو ماں پا کر تو میں دھنیہ ہوگیا ہوں۔'' راج نان ویج مذاق پر ہنس دیتا ہے۔

''اور راج جیسا داماد پا کر دھنیہ تو میں بھی ہوگئی ہوں۔کیوں کہ شہر کے سارے رئیس ویک اینڈ پر تمہارے یہاں آتے ہیں۔اِس بہانے تھوڑی بہُت میری بھی عزّت بڑھ جائے گی۔'' شوبھا نے اِٹھلاتے ہوئے کہا۔

''عزّت تو ہم سبھوں کی تب اور بڑھ جائے گی ساسو ماں! جب عزّت پور کے ٹکٹ سے جیت کے آپ اسمبلی پہنچیں گی۔''

''ہاں وہ تو ہے۔لیکن تمہیں کیا لگتا ہے کہ مجھے سچ مچ ٹکٹ ملے گا۔''

''سو پرسینٹ ۔اور اگر ایسا نہیں ہوا تو آگ لگ جائے گی عزّت پور میں۔''

''لیکن یہ سب تمہیں کیسے معلوم ۔؟''

''پچھلی بار جب منتری جی آئے تھے تو پریتی کے سامنے ہی بول رہے تھے۔''

''وہ سب چھوڑئے اور حکومت کے گرنے کا انتظار کیجئے۔''

گرنے کا انتظار کون کرتا ہے ۔آج کل تو دن تاریخ اور یہاں تک کے وقت بھی پہلے سے طے ہوتا ہے..........آج سے ٹھیک چھ مہینے بعد بھرسٹا چار کے مُدعے پر دس بیس ایم ایل اے ریزائن کریں گیا اور حکومت گر جائے گی۔''

''یہ سب کیسے پتہ چل جاتا ہے؟''

''ارے یہاں نشے میں لوگ سب کچھ بک دیتے ہیں۔''

''یعنی حکومت گرنے کے کچھ ہی دنوں بعد الیکشن کا اعلان ہو جائے گی اور پھر........'' وہ ابھی کچھ اور کہتی کہ راج نے آگے کہنا شروع کیا۔

''اور پھر ساسو ماں کے ساتھ ساتھ ہم سبھوں کی قسمت کا ستارا جاگ اُٹھے گا۔ آپ کی اِسی طرح ذرّہ نوازی رہی تو اِس ڈانس بار کو مفت میں پانچ سال کے لئے لائسنس مل جائے گا۔'' راج نے یوں تو یہ بات مذاق میں کہی تھی۔لیکن کہنے کے بعد اُسے لگا کہ اُسے حقیقت کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔

''پانچ ہی کیوں دس اور پندرہ سال کے لئے کیوں نہیں۔'' شوبھا نے مسکراتے ہوئے آگے کہا۔''بس ایک بار سیاست میں موقع تو ملنے دو۔پھر آگے کے راستے خود بخود کھلتے چلے جائیں گے۔اور پھر شروع ہوگا دور جشن کا۔پارٹی کا۔''

''آپ کہیں تو پارٹی کا انتظام آج ہی کروا دوں۔'' راج کی آنکھوں میں جیت کا نشہ صاف چھلک رہا تھا۔

شوبھا نے راج کے دل کی بات سمجھ لی تھی۔اور یہ بھی جان گئی تھی کہ وہ اُس وقت کس پارٹی کی بات کر رہا ہے۔

''راج اتنے بھی اُتاولے مت ہو۔ پریتی نے 'ہاں' کر دیا ہے، مطلب ہاں ہو گیا ہے۔ لیکن جہاں تک سگائی پارٹی کی بات ہے وہ اُسی دن ہوگی جس دن وہ اٹھارہ کی ہو گی۔ اور اب اٹھارہ کی ہونے میں وقت ہی کتنا بچ گیا ہے۔''

''تو اِس کا مطلب ہے کہ دو تین ماہ مجھے اور انتظار کرنا پڑے گا۔'' راج ملہوترا کے لئے یہ انتظار صدیوں جیسا تھا۔

''انتظار میں جو لذّت ہے وہ دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں ہے۔'' شوبھا اُس کی حالت کو سمجھتے ہوئے تسلّی دینے کی کوشش کرتی ہے۔

''تو اب انتظار کرنے کے سوا میرے پاس چارہ بھی تو نہیں ہے۔''

راج نے مسکراتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ لیکن اُس میں بھی اُسے اپنی ہی جیت دکھائی دے رہی تھی۔

''تو پھر ٹھیک ہے، جس دن وہ اٹھارہ کی ہوگی اُس دن ہی سگائی ہو جائے گی۔ اور اِس کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد شادی.........اب تو خوش ہو نا میرے راج!''

راج کی خوشی کا واقعی ٹھکانہ نہیں تھا۔

44

سالگرہ، سگائی اور فارم ہاؤس منیجمنٹ

قارئین!

اور اِس طرح سگائی کا انتظار ختم ہوا۔

اٹھارویں سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ راج بار اینڈ ڈانس کلب کو نئی نویلی دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رنگ وروغن سے لے کر فرنیچر کا سارا سیٹ اپ بدل دیا گیا تھا۔ حالاں کہ منیجر نے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن راج نے یہ کہہ کر اُس کا منہ بند کر دیا کہ جب پیسے میرے ہیں تو تمہارا کیا جاتا ہے۔ وہ بے چارہ خاموش ہو گیا تھا۔ اور ابھی دو سال پہلے ہی بار کو نیا لُک دیا گیا تھا۔ اتنی جلدی جلدی سیٹ بدلنے میں منیجر کو کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر آگے اُس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ مالک کا فائدہ کرنے میں اپنا نقصان نہ کر بیٹھے۔

لیکن نقصان سے زیادہ راج اپنا فائدہ دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ لٹا کر بھی اگر کوئی پریتی جیسی خوبصورت کلی کو کورٹ کی کالر میں سجالے۔ تو یہ اُس کی زندگی کا حاصل ہوگا۔

سگائی کے دن راج اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھ رہا تھا۔

شوبھا بھی خوش نظر آ رہی تھی کہ اُس نے بہت صحیح وقت پر پریتی کا سٹلمینٹ کر دیا ہے.

''بیٹا جو کام صحیح وقت پر ہوتا ہے اُس میں پرفیکشن ہوتا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ میں نے وقت رہتے تمہارا سٹلمنٹ کروڑ پتی کے ساتھ کر دیا ہے۔'' شوبھا نے لفظ کروڑ پتی پر زور دیا۔

''ممّا مجھے کروڑ پتی نہیں، سنگل پتی چاہئے۔'' یہ پہلا موقع تھا جب شادی کے معاملے میں پریتی ممّی کے ساتھ اِس طرح سے گفتگو کر رہی تھی۔

''ارے واہ! اٹھارہ کی ہوتے ہی تم تو لفظوں سے کھیلنے بھی لگی۔'' شوبھا نے

مسکراتے ہوئے ایک طرح سے اُسے کمپلیمینٹ دیا۔

''صرف لفظوں سے ہی کھیلنا نہیں۔ مجھے تو پتی کھیل بھی آتا ہے۔'' پریتی مسکرا مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

''بے شرم لڑکی! ابھی اٹھارہ کے پر ٹھیک سے لگے نہیں کہ اُڑنے لگی پتی کھٹولہ میں۔'' شوبھا شبابی جسم کے فراز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کھلکھلا اُٹھی۔

''ممّا! یہ سب تو آپ نے ہی مجھے سکھایا ہے۔'' پھر اِٹھلاتے ہوئے بولی۔''شادی تو میری صرف نام کی ہو رہی ہے۔لڈّو تو آپ پہلے ہی لوگوں کو کھلوا چکی ہیں۔''

''بیٹا! یہ ربر کا وہ لڈّو ہے جس پر دانتوں کا جتنا دباؤ پڑے گا، وہ اتنا پھیلے گا۔لیکن دانتوں سے آزاد ہوتے ہی وہ ایک بار پھر اپنی حالت میں آجاتا ہے۔اور یہ سب تو تجھے پہلے سے ہی معلوم ہے۔'' شوبھا مسکرا رہی تھی۔

''کتنی عجیب بات ہے ممّا! کہ جو لڈّو ایک آدمی پوری طرح کھا لیتا ہے وہی پلیٹ میں پورا کا پورا بچا بھی رہتا ہے اور دوسرا خریدار شکایت بھی نہیں کرتا اور اُسی چاؤ سے کھاتا ہے جیسے پہلے والے نے کھایا تھا۔ یہ جادو نہیں تو اور کیا ہے کہ لڈّو ایک اور کھانے والے انیک۔تب بھی ختم نہیں ہوتا۔'' ہنسی کے لڈّو اُس کے مُنہ سے پھوٹتے ہی جاتے ہیں۔

''پریتی! مجھے تم پر ناز ہے کہ تم نے میری سوچ کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔اب تم لکھ لو کہ تمہاری آگے کی زندگی میری طرح ہی عیش میں گذرے گی۔''

کہنے کے لئے تو شوبھا کہتی ہے لیکن اس کے باوجود اُسے یقین نہیں آتا کہ راتوں رات پریتی میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی کہ وہ جو اکثر نان ویج پر ناراض ہو جایا کرتی تھی، آج ریسرچ اسکالر بن بیٹھی ہے.........؟

لیکن سگائی کے دن شوبھا کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اِس سلسلے میں کچھ سوچتی۔بس وہ اتنا جانتی تھی کہ ریئلیٹی شو سے راج اینڈ بار تک کے سفر میں اُس نے ڈِنر پارٹیوں میں پریتی کو زبردستی نان ویج کھلایا تھا۔لیکن اِس کے بعد بھی ٹین ایج منہ سے ڈکار

تک نہیں نکلی۔ ہاضمہ خراب ہونے کی شکایت تک نہیں کی۔ بلکہ ایک نیک بچّی کی طرح ماں کی ہر بات مانتی رہی۔ درد کی دوا کھاتی رہی۔

نان ویج کھانا اور نان ویج پر گفتگو کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔

لیکن یہ دونوں باتیں پریتی کو پسند نہیں تھیں۔لیکن آج وہ اپنی مرضی سے شوبھا کے ساتھ نان ویج گفتگو کر رہی تھی تاکہ موقع ملتے ہی وہ اعتماد کے بین پر اُسے نچا سکے۔ سگائی سے پہلے کی پلاننگ کو عملی جامہ پہنا سکے۔

''میں آج اپنی 'ممّا' سے نہیں اپنی 'سہیلی' سے باتیں کر رہی ہوں۔'' پریتی نے ماں گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔

''کیا! کہا سہیلی.........؟'' بازوؤں میں بھرتے ہوئے۔

''ارے اِس میں بھی کوئی دو رائے ہے کیا؟ جس طرح سے آپ نے میری پرورش کی ہے۔زندگی گذارنا سکھایا ہے، وہ ماں نہیں سہیلی کی فطرت کا حصّہ ہے۔''

پریتی نے اپنی عادت کے برعکس زور سے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے جب یہ کہا تو شوبھا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا کہ پریتی 'ماں' سے زیادہ اُسے 'سہیلی' سمجھتی ہے۔

آج وہ میچیوریٹی کے اٹھارویں زینے میں قدم رکھ رہی تھی۔اِس لئے شوبھا کو لگا کہ وہ عمر کے ساتھ ساتھ پوری طرح سے میچیور بھی ہو گئی ہے اس لئے وہ ماں اور سہیلی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اتنی میچیوریٹی دکھا رہی ہے۔

''اور 'ماں' جب 'سہیلی' بن جائے تو بیٹی کو پرابلم فیس کرنے میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوتی۔خاص کر کے اُن دنوں میں جب سرخ گلاب اُس کے جسم کے آنگن میں پہلی بار کھلتا ہے۔'' شوبھا کی نظریں اُس کی کمر کے آس پاس کہیں ٹھہر گئی تھیں۔

''ممّا! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جسم کا بھی اپنا ایک آنگن ہوتا ہے لیکن اگر کسی کے یہاں سرخ گلاب نہ کھلے تو............؟'' وہ پہلو بدل کر سوال کر بیٹھی تھی۔

''تمہارے یہاں کِھل رہا ہے نا؟ بس..........اور ہاں! اِس سلسلے میں کچھ زیادہ

معلوم کرنا ہوگا تو راج سے پوچھ لینا۔ اُس کی تو اِسی میں پی ایچ ڈی ہے۔'' شوبھا کو راج سے ملنے کی جلدی تھی اِس لئے وہ یہاں سے جلد سے جلد جانا چاہتی تھی۔

لیکن اُس آنگن پر گلاب والے کا ادھیکار کیوں نہیں ہوتا.........؟'' پریتی نے اس بار سیریسلی پوچھا تھا۔

''بیٹا تم کیا کہہ رہی ہو وہ میرے پلّے نہیں پڑ رہا ہے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ آج سگائی ہے اور تم خوش ہو۔ اتنی خوش کہ تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل کر دیا ہے۔ اور اب میں چلی راج کے دل کی دھڑکنوں کو چیک کرنے کہ اُدھر کیا حال ہے۔'' وہ گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے راج ملہوترا کو چھیڑنے نکل گئی۔

راج ملہوترہ کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ وہ تو پاگل سے ہو رہے تھے کہ پریتی کی آمد نے قلیل مدّت میں بار کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ کر کے لائف پارٹنر کا جو حسین تحفہ دیا۔ وہ صدیوں میں کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

شوبھا نے اُسے جب کریم کلر کے شیروانی اور چوڑی دار میں دیکھا تو چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔

'' راج آج تو تم قیامت ڈھا رہے ہو۔ ایسے میں تو پریتی کا قتل واجب ہے۔''

''قتل تو پریتی نے کیا ہے اپنے حُسن سے اور الزام مجھ پر ڈال رہی ہیں؟'' مجنوں والے انداز میں راج ملہوترا نے کہا۔

''وہ سب چھوڑو.........بتاؤ سگائی کے بعد کا پلان کیا ہے؟'' شوبھا نے اُس کے دل کو ٹٹولنا چاہا۔

''پلان تو یہ ہے کہ کل میں منہ میٹھا کرنا چاہتا ہوں۔'' راج نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ہوئے مسکرا کر شوبھا کو دیکھا۔

''ارے اتنے بھی بے چین نہ ہو جاؤ کہ پریتی ناراض ہو جائے۔'' شوبھا نے یہ بات اُسے ڈرانے کے لئے کہی تھی۔

''سگائی کے بعد سب جائز ہو جاتا ہے۔ شادی میں ابھی ایک ہفتے ہیں۔ اتنا کون انتظار کرے گا۔'' راج کسی بھی حال میں انتظار کے موڈ میں نہیں تھا۔

''اگر وہ نہیں مانی تو.........؟'' شوبھا اُس کی بے چینی کو دیکھنا چاہتی تھی۔

''نہیں ماننے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ جیسے بھی ہوگا میں اُسے رام کر لوں گا۔'' راج نے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا۔

''لیکن مہمانوں کی موجودگی میں نہ منہ میٹھا میرے گھر پر ہو سکتا ہے اور نہ ہی تمہارے گھر پر۔'' شوبھا اُس طرح کی باتوں سے اُسے بے چین کر دینا چاہتی تھی۔

''اُس کی آپ چنتا نہ کریں ساسوماں! میں نے فارم ہاؤس منجمینٹ کورس کر رکھا ہے۔ ندی کے کنارے والا فارم ہاؤس ہے نا؟ وہیں پہلے میرا آفس تھا جہاں لڑکیوں کا کلاس لیا کرتا تھا۔ کل ہی میں نے اُسے ٹھیک کروایا ہے۔ اُسے اِسی مقصد کے لئے تو خریدا تھا ....وہ سب اِل لیگل تھا۔ لیکن پریتی کا معاملہ تو لیگل کورٹ میں بھی میرے ہی حق میں جائے گا۔ کیوں کہ اُس وقت تک وہ میری منگیتر ہو چکی ہوگی۔ اور پھر جب آپ میرے ساتھ ہوں گی تو مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔'' کچھ رُک کر۔ ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ اُس کے ساتھ کسی طرح کا زور زبردستی کروں۔ اِس لئے آپ اُسے پہلے ہی سمجھا دیں گی، تا کہ میرا کام آسان ہو جائے۔''

''راج یہ سب بھی کہنے کی بات ہے۔'' شوبھا اب اُس کی حمایتی نظر آ رہی تھی۔ ''جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔ اور پریتی کوئی بچّی تو ہے نہیں۔ وہ سب کچھ جانتی بھی ہے۔ بھلا وہ سگائی کے بعد کیوں انکار کرے گی۔ ویسے شادی تک تمہیں رُکنا چاہئے۔ لیکن ....لیکن میں نے اُسے آج جتنا خوش دیکھا ہے اتنا تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ خود سپردگی کے لئے بے چین ہے۔ ویسے اِس عمر تک پہنچتے پہنچتے بھی اُس نے کئی طرح کے دیسی بدیسی پھلوں کے ذائقے چکھے ہیں۔ لیکن وہ پھل جو برسوں پیڑ میں پکا ہو، اُس کا ذائقہ کیسا ہوگا وہ اُسے نہیں معلوم۔ وہ تو صرف اتنا جانتی ہے کہ کوئی بھی پھل ہو اس

میں رس ہوگا ہی۔''

''ساسو ماں! آپ تو پھلوں کے بارے میں ایسے بات کر رہی ہیں جیسے آپ کی پھلوں کی دکان ہو۔'' راج نے رسیلے انداز میں کہا۔

''دکان بھی کھولوں گی۔ اور پھل بھی بیچوں گی۔ بس ایک بار عزّت پور کی سیٹ تو ہاتھ لگ جائے۔'' شوبھا کی آنکھوں کا خواب ہونٹوں پر آ کر کچھ اور چمکنے لگا تھا۔

'' مجھے اُس دکان میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری دے دیجئے گا.........؟'' راج نے مذاق ہی مذاق میں شوبھا کو گھیر لیا۔

''ارے میں ویسی ساس نہیں کہ داماد کو صرف بیٹی کے ساتھ ہی باندھ کر رکھوں گی ۔موڈرن زمانہ ہے جب جو جس کے ساتھ رہنا چاہے رہے۔ دنیا میں اور رکھا ہی کیا ہے ۔اِسی محور پر تو دنیا گھوم رہی ہے.........'' پھر اُس نے کلینڈر میں بنے شیولنگ کی طرف اشارہ کیا۔''ہم سب تو اُن کے انویائی ہیں۔ اس لئے دل کرے تو پریتی کے ساتھ عیش کرنا ۔نہیں تو دوسرے کے ساتھ ....اور اگر دونوں جگہ سے دل بھر جائے تو مجھے یاد کر لینا۔'' شوبھا یہ کہہ کر آنکھ مارتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔

''نہیں نہیں ساسو ماں!'' اُس نے ہاتھ پکڑ کر پیار سے بٹھاتے ہوئے کہا۔'' وہ تو بار اِنٹری فیس تھی۔ اور وہ بھی آپ نے آفر کی تھی۔ ویسے اِنٹری فیس تو پریتی کی بنتی تھی۔ میں نے اُس دن اُسے اِس لئے چھوڑ دیا تھا کہ جس دن چاہوں گا کام سے نکالنے کی دھمکی دے کر فیس بھروالوں گا.........لیکن اِس سے پہلے کہ میں ایسا کرتا، وہ میرے دل کی دھڑکن بن گئی اور میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا کہ اُسے پیار سے جیتوں گا۔ لیکن اِس سے قبل کہ میں اُسے محبّت کے جال میں پھانس کر اپنے نزدیک کرتا آپ نے شادی کا آفر دے کر میرے لئے سب کچھ آسان کر دیا۔ میری دنیا ہی بدل دی۔''

☆

سگائی شام میں تھی۔

لیکن پریتی کی خوشی کا عالم یہ تھا کہ وہ صبح سے کئی بار قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔ کبھی فیسیل کرتی تو کبھی کریم لگاتی۔ ہونٹوں کو لپ اسٹیک سے سجاتی ۔کبھی آنکھوں میں آئی لائینر لگاتی۔ پنکھڑیوں کو درست کرتی اور کبھی گالوں میں افشن کا چھڑکاؤ کرتی۔ بالوں کو دس بارہ بار الگ الگ اِسٹائل عطا کرنے کے بعد بھی وہ خود کو مطمئین نہیں کر پائی۔ میکپ کے ساز و سامان ڈریسنگ ٹیبل کے ارد گرد اِس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی چھوٹے بچّے نے کھیلنے کے دوران اِدھر اُدھر کر دیا ہو۔ شوبھا اُسے اِس طرح سجتے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ آخر میں اُس نے رہا گیا۔

''تم سج رہی ہے یا بیوٹی پارلر کھول کر بیٹھی ہے۔؟''

''ممّا!'' وہ شوبھا سے لپٹ گئی اور بچّوں کی طرح بولی۔'' دیکھو نا میں جیسا میک اپ اور ہیئر اِسٹائل چاہتی ہوں، ویسا ہو ہی نہیں رہا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟''

''ارے میری بیٹی اتنی سندر ہے کہ بغیر میک اپ کے بھی حور لگ رہی ہے۔'' شوبھا نے بڑھ کر بلائیں لیں۔

''ممّا! میں ایک دو بار اور ٹرائی کرتی ہوں۔ اگر نہیں ہوا تو پھر مجھے بیوٹی پارلر جانا ہوگا۔'' اُس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

شوبھا نے بھی اُس کی مدد کی۔ لیکن پریتی نے ہر اِسٹائل پر مُنہ بنا لیا۔ آخر دوپہر ہوتے ہوتے اُس نے بیوٹی پارلر جانے کا ارادہ کر لیا۔

''تو ٹھیک ہے میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔'' شوبھا نے کہا۔

''پوری زندگی میں آپ کے ساتھ چلتی رہی، کم سے کم آج تو مجھے اپنے ساتھ چلنے دیجئے۔'' پریتی کے اِس ایک جملے میں اُس کی پوری زندگی رقم تھی۔

پریتی نے آگے یہ کہہ کر اُسے روک دیا۔'' آپ کیا کریں گی وہاں جا کر۔ آپ یہاں راج ملہوترہ کے ساتھ پارٹی کا انتظام دیکھیں۔ میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔''

''تو ٹھیک ہے ساتھ میں ڈرائیور لے جاؤ۔''

''میں نے کہا نا کہ آج کے دن مجھے تھوڑا فری رہنے دو۔''

''لیکن بیٹا ابھی تیرا لائسنس بنا نہیں ہے۔کہیں پکڑی گئی تو مشکل ہو جائے گا۔''

''تم فکر مت کرو ممّا! پانچ سو اور ہزار میں تو ہندوستان کا کوئی بھی پولس والا بِک سکتا ہے۔اور ویسے بھی میرے پاس لائسنس ہے۔''

لائسنس کل ہی اُسے بن کر ملا تھا اور وہ اپنی ماں کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔لیکن زبان پر بریک لگاتے لگاتے بھی وہ بات تک پہنچ گئی تھی جسے وہ ہر حال میں چھپانا چاہتی تھی۔

''تمہارا لائسنس ابھی کیسے بن جائے گا؟.........تمہاری تو ابھی عمر بھی نہیں ہوئی ہے۔''

''ممّا میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی تھی۔'' اُس نے سچّائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔پردہ چھوٹا پڑ گیا اور سچّائی کی ٹانگ باہر نکل آئی۔''لیکن سچّائی یہ ہے کہ میرا لائسنس ایک سال پہلے بھی بن سکتا تھا۔''

''وہ کیسے..........؟'' شوبھا حیرت زدہ اُس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

''جس انگلش اسکول میں پاپا نے ایڈمیشن کروایا تھا وہاں سے نکال کر جب میرا ایڈمیشن ڈانسنگ اسکول میں کروایا گیا تو آپ نے وہاں کے پرنسپل سے مل کر ایک سال کم کروا دیا تھا تاکہ ریئلیٹی شو اور بیوٹی کونٹیسٹ میں ایک سال کا بینیفٹ مل جائے۔''

''ارے ہاں میں تو یہ بھول ہی گئی تھی۔اور اِس حساب سے تم اٹھارہ کی ایک سال قبل ہو چکی ہو۔'' پھر کچھ سوچتے ہوئے اُس نے پوچھا۔''لیکن یہ سب تجھے کیسے معلوم ہوا؟''

''ارے یہ سب تو آپ نے ہی مجھے بتایا تھا۔'' پریتی نے فوراً جھوٹ کا سہارا لیا۔

''میں نے.........'' شوبھا سوچ میں پڑ گئی تھی کہ اس نے اُسے کب یہ بتایا تھا۔

''ہاں آپ نے ....ایک سال پہلے سالگرہ کے موقعے پر۔'' پریتی نے یہ سب کچھ، کچھ اِس طرح سے کہا کہ شوبھا کنفیوز ہو گئی۔

''سال گرہ کے موقعے پر........؟'' کچھ دیر تک وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔''بات تو صحیح ہے۔لیکن میں مصلحتاً کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں قانونی لفڑے میں نہ پڑ جاؤں۔اور کچھ حد تک میں بھول گئی تھی یا ہمیشہ کے لئے بھول جانا چاہتی تھی۔پھر تمہیں کیسے بتا دیا۔مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''سگائی کہ موقعے پر وہ سب یاد کرنے سے فائدہ کیا ہے۔'' پریتی نے بات بنانے کی کوشش کی۔''اور اب تو میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ جب سے میرا رشتہ آپ نے راج سے طے کیا ہے بہت کچھ بھولنے لگی ہیں۔کل ہو کر آپ مجھے بھی بھول جائیں گی۔'' پھر کچھ رُک کر۔''ارے آپ کے چکّر میں ممّا میں تو یہ بھی بھول گئی تھی کہ مجھے بیوٹی پارلر جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے جاؤ لیکن جلدی لوٹ آنا۔''

پریتی نے مسکراتے ہوئے شوبھا کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔پیشانی پر اپنے ہونٹوں کو رکھا اور چابھی کو انگلیوں میں نچاتے ہوئے پاس ہی رکھے لال بیگ کو اُٹھایا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

''ارے بیٹا یہ بیگ لے کر کہاں جا رہی ہے۔''

''ممّا! آپ بھی کتنی بدھّو ہیں۔میں سگائی والا پنک ڈریس لیتی جا رہی ہوں۔وہیں سے میک اپ کے بعد تیّار ہو کر آ جاؤں گی۔''

''اچھّا اچھّا! ٹھیک ہے جلدی جا۔لیکن دیکھ دیر مت کرنا۔''

''آج کے دن بھلا کون دیر کرتا ہے۔بس سمجھو یوں گئی اور یوں آئی۔آپ راج کے ساتھ مل کر پارٹی کا انتظام دیکھیں۔''

☆☆☆

45

بیوٹی پارلر، لائسینس اور بنارسی ساڑی

قارئین!

جاتے جاتے شوبھا نے سوچا کہ وہ بھی کتنا بےوقوف ہے جو بات ممّا سے چھُپا لینا تھا وہی بات اُس نے ظاہر کر دی تھی ۔ وہ تو اچّھا ہوا کہ شک نہیں ہوا۔ ورنہ بیوٹی پارلر جانا مشکل ہو جاتا۔ ویسے وہ اٹھارہ کی ایک سال قبل ہی ہو چکی تھی لیکن یہ بات اُسے بھی کہاں معلوم تھی۔

اِسٹیئرنگ گھُمانے کا لائیسنس اُسے کل ہی ملا تھا۔

عدالت میں ڈانسنگ اسکول کا جو سرٹیفکیٹ پیش ہوا تھا۔ اُسی کو بنیاد بنا کر اٹھارہ سال کی مدّت طے کر دی گئی تھی ۔ بھاری بھیڑ اور ہنگامے کے بیچ جج نے سنِ بلوغت کی جو تاریخ اناؤنس کی وہی ڈاکٹر کپل نے اپنے اندر محفوظ کر لیا تھا۔ جس میں پریتی کی عمر، حقیقی عمر سے ایک سال کم درج تھی ۔ اُس وقت اُن کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی تھی ۔ لیکن شوبھا کو سب کچھ معلوم تھا۔

لیکن ایک دن جب اُن کے دوست حمید عالم نے اپنے ایک پروفیسر دوست جسے ڈاکٹر کپل بھی جانتے تھے، کا ذکر کرتے ہوئے جب یہ بتایا کہ اُس کی بیٹی نے کورٹ میرج کر لی ہے تو اُنہیں حیرت ہوئی ۔ کیوں کہ جب وہ چھوٹی تھی اور بیمار پڑ گئی تھی اور اُن دنوں حمید عالم کسی عزیز کی شادی میں ایک ہفتے کے لئے باہر گئے ہوئے تھے تو اِس دوران اُنہوں نے ہی اُس کا علاج کیا تھا۔ اُس وقت وہ پریتی سے قریب سات آٹھ ماہ چھوٹی تھی ۔ اس لئے اُنہیں یقین ہی نہیں آیا کہ اُس کی کورٹ میرج ہو گئی ہے ۔ جس کی وجہ سے اُس کے پاپا اِن دنوں کوما میں ہیں۔

’’لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو پریتی سے چھوٹی ہے۔ جب پریتی اٹھارہ کی نہیں

ہوئی ہے تو وہ کیسے ہو گئی۔؟‘‘

’’میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔‘‘ کچھ یاد کرتے ہوئے۔ ’’لیکن اِس بات میں سچّائی ہے کہ پریتی سے وہ چھوٹی ہے۔ میں نے اپنی شادی کے پہلی سالگرہ پر تم دونوں کو انوائٹ کیا تھا۔ کچھ یادگار تصویریں اب بھی میرے البم میں ہیں۔ اور ذہن میں جو تصویر گھوم رہی ہے اُس میں پریتی اِس کمرے سے اُس کمرے میں دوڑ رہی ہے اور وہ گھٹنوں کے بل چل رہی ہے۔‘‘

پھر فون کر کے حمید عالم نے اپنی اہلیہ کو اُس تصویر کے متعلّق بتایا اور اسکین کر کے ڈاکٹر کپل کی آئی ڈی پر میل کرنے کے لئے کہا۔

اور جب تصدیق ہوئی تو ڈاکٹر کپل کو لگا جیسے ایک سال قبل جو زندگی اُن کو ملی تھی اُس کا گلا اُنہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹا ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہوتے چلے گئے تھے ۔ ایک بےچینی سی پیدا ہو گئی تھی ....اُس دن وہ رات بھر نہیں سوئے ۔ پرانی فائلوں میں برتھ سرٹیفکیٹ تلاش کرتے رہے۔ لیکن نہیں ملا۔ کیوں کہ وہ تو شوبھا اپنے ساتھ لے گئی تھی ۔

دوسری صبح وہ کلینک جانے کے بجائے پریتی کے اُس اسکول پہنچے جہاں نرسری میں اُس کا ایڈمیشن کروایا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ اسکول کا اسٹیٹس سال بھر قبل بدل دیا گیا تھا۔ اِس لئے وہ فائلیں کباڑی والے کے پاس ہیں۔

اُس کباڑی والے کا پتہ معلوم کرنے کے بعد جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اتنے بڑے کباڑ خانے میں کون سے چیز کہاں ہے خود کباڑی والے کو بھی نہیں معلوم ہوگی ۔ اور اِس بات کی بھی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اسی کباڑ خانے میں ہو۔ کوئی یہاں سے لے بھی گیا ہوگا۔ ویسے اُنہوں نے منت وسماجت کی تو کباڑی والے نے ڈھونڈنے کی اجازت دے دی۔ لیکن کچھ ہی دیر کے بعد اُبکائی آنے لگی۔

پھر نل کے پاس مُنہ دھوتے دھوتے اُنہیں اچانک یاد آیا کہ پریتی کی پیدائش تو اُسی کے نرسنگ ہوم میں ہوئی تھی۔ اور وہ اُسے کباڑ خانے میں تلاش کر رہا ہے۔

☆

اِدھر پریتی لال بیگ لے کر بیوٹی پارلر کے لئے جیسے ہی نکلی اُدھر شوبھا سگائی کے انتظام میں جٹ گئی۔ بات ہی بات میں راج نے شوبھا سے پوچھا۔

''پریتی کا کیا حال ہے؟''

مسکراتے ہوئے کہا۔''بے حال ہے۔ اور اُسی حال میں بیوٹی پارلر گئی ہے۔''

''بیوٹی پارلر۔ لیکن کس کے ساتھ.........؟''

''ڈرائیور اور میں یہیں ہوں تو آفکورس اکیلے ہی گئی ہے۔''

''لیکن آج کے دن اُسے اکیلے نہیں بھیجنا چاہئے۔''راج کے چہرے پر تشویش کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

''ارے وہ اب بچّی نہیں رہی۔ سیانی ہوگئی ہے۔''شوبھا نے سیانی لفظ پر زور دیا۔

''سیانی ہوگئی ہے......... اِسی لئے تو.........ڈر رہا ہوں۔''راج کی آواز میں کپکپاہٹ صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے لئے شوبھا بھی ایک انجانے خوف سے کپکپا کر رہ گئی۔ اُس نے فوراً بیوٹی پارلر والے کو فون لگایا۔

''ہیلو.........!''

''گڈ افٹرنون شوبھا جی۔''اُٹھانے والے نے نمبر دیکھتے ہی کہا۔

پریتی کو اِس بات کا اندیشہ تھا کہ یہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد راج یا ممّا کا فون آجائے گا۔ اُس نے میک اپ کی حالت میں ہی بیوٹی پارلر والے سے فون لے لیا۔

''کیا بات ہے ممّا.........؟''

''ارے بیٹا کوئی بات نہیں، بس ایسے ہی یہ معلوم کرنے کے لئے فون کیا کہ اور کتنا وقت لگے گا؟''

''ممّا! ویسے تو آج یہاں کافی رش ہے۔ لیکن اُنہوں نے دو کے بعد مجھے نمبر دے

دیا ہے۔ کم سے کم دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''شوبھا نے بات بناتے ہوئے پارلر والے کو دیکھا۔

''اچھا ٹھیک ہے پارلر والے کو دو۔''

فون دینے سے پہلے پریتی نے ہاتھوں میں دبا کر دھیرے سے اُسے سمجھا دیا کہ ممّا کو کیا بولنا ہے۔

''مُنّا جی! آج اُس کی سگائی ہے اِس لئے ٹائم نکال کر ذرا جلدی کر دینا۔''شوبھا نے تعلّقات کو کیش کرانا چاہا۔

''ایسا ہے شوبھا جی! کہ پہلے سے دو لڑکیوں کی بکنگ ہے جن کی آج شادی ہے۔ بس پریتی کا ہوتے ہوتے ڈھائی تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

پھر پریتی سے.........

''ہاں بیٹا! دیکھو جیسے ہی کام ہو جائے، فوراً چلی آنا۔ نہیں تو ذرا بھی لیٹ کرنے پر راج پہنچ جائے گا لینے۔''شوبھا نے مذاق میں کہا۔

''ممّا! جب تک سگائی نہیں ہوتی تب تک اُس سے کہئے کہ پیسینس رکھے۔ بھاگی تھوڑے جا رہی ہوں۔''پریتی نے اِسے سریسلی لیا۔

''اچھا بابا جاؤ، نہیں بھیجوں گی۔''

جب پریتی بیوٹی پارلر کے لئے نکل رہی تھی تو اُس نے سوچا کہ مت ماری گئی تھی کہ اُس نے ڈرائیونگ لائسینس کی بات چھیڑ دی۔ ویسے لائسینس کے لئے ایک ہفتہ قبل راج نے بھی فارملٹیس پوری کر کے آر ٹی او میں بھجوایا تھا۔ بیس بائیس دن میں لرننگ بھی بن جاتا۔ لیکن جس لائسینس کی بات پریتی کر رہی تھی وہ اِس شہر کے آر ٹی او سے نہیں بنا تھا اور اگر یہاں سے بنا ہوتا تو اُس میں اصل تاریخ پیدائش کہاں سے درج ہوتی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس وقت ممّا سگائی کی وجہ سے خوش تھی۔ اِس لئے ذہن کچھ اور نہیں سوچ پایا۔ ورنہ.........؟

☆

کام سے تھوڑی سی فرصت ملی تو شوبھا کا ذہن پریتی کی طرف گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ایک سال کم کر کے ایڈمیشن والی بات پریتی کو کیسے معلوم ہوئی؟ پریتی نے تو کہا کہ گذشتہ سالگرہ میں، میں نے اُس سے یہ بات کہی ہے۔

وہ اِس بار کچھ اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ لیکن اُسے کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ پھر اس نے ان باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ کیا فرق پڑتا ہے کہ پریتی کب اٹھارہ کی ہوئی۔ ایک سال قبل یا ایک سال بعد۔

پریتی کو ایک سال قبل اِس بات کا علم تھا۔ وہ چاہتی تو اپنی مرضی کی زندگی چُن سکتی تھی.........لیکن اُس کی سوچ مجھ سے کتنی ملتی ہے۔ کروڑوں کی مالکن بننے کے لئے اُس نے کتنا بڑا سمجھوتہ کیا ہے وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اِس سگائی سے بے حد خوش ہے۔ اِس لئے تو خوشی کے اِس موقعے پر راج نے جو اسپیشل ڈیزائن کروا کر فورن سے جو ڈریس منگوایا تھا اُسے ساتھ لے کر بیوٹی پارلر گئی ہے۔

بیوٹی پارلر.........؟ ذہن میں گھنٹی بجتی ہے۔

اُس نے گھڑی دیکھی تو تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔

پھر پریتی کو فون کر کے معلوم کرنا چاہا کہ اُس کا میک اپ ہوا یا نہیں.........؟ اور کتنا وقت لگے گا.........؟

شوبھا چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد گھر آ جائے۔ اب تو اِکا دُکا مہمان بھی آنے لگے تھے۔ لیکن پریتی کا فون ہر بار انگیز آ رہا تھا۔ اُس نے بیوٹی پارلر والے منّا جی کو فون لگایا۔

''ہیلو.........''

''جی شوبھا جی! بولئے.........''

''ارے وہ پریتی نکلی کہ نہیں.........؟''

''آپ نے جلدی کر دینے کے لئے کہا تھا تو میں آپ کی بات کیسے ٹالتا۔ اُسے

یہاں سے نکلے ہوئے تقریباً دوڈھائی گھنٹے ہو گئے ہیں ۔''

''دوڈھائی گھنٹے.........؟ لیکن وہ تو یہاں پہنچی نہیں ہے۔ اور پھر تم نے تو خود کہا تھا کہ ڈھائی تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ دوڈھائی گھنٹے پہلے وہ کیسے نکل گئی.........؟'' شوبھا کی آنکھوں کے سامنے دھُند سا چھانے لگا تھا۔

''دراصل شوبھا جی! اُس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آج سگائی ہے اور وہ ایسے موقع پر گھر والوں کو انتظار کروانا چاہتی ہے۔ میں نے اُس کے کہنے پر ڈھائی تین گھنٹے لیٹ والی بات کہی تھی۔ ویسے جب آپ کا فون آیا تھا اُس وقت میں فیسیل کر رہا تھا۔''

''تو وہ دولڑکیوں والی بات.........؟''

''ارے میڈم! ابھی تو شادی کا سیزن ہی نہیں ہے۔ جب وہ آئی تو میں خالی بیٹھا تھا، اور اُس کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کل ہی اُس نے فون کر کے ٹائم لکھوا دیا تھا۔''

''کیا ایک دن قبل.........؟'' دھُند اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

''ہاں ہاں ایک دن قبل۔ اُس نے آپ سے یہ کہنے کے لئے منع کیا تھا۔ اُس کی باتوں سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ سگائی کے دن سب کو سرپرائیز دینا چاہتی تھی۔''

''اچھا یہ بتاؤ! کہ وہ لہنگا چولی پہن کر نکلی ہے یا.........''

''لہنگا چولی.........؟'' منّا نے اُلٹا سوال کر دیا تھا۔

''ہاں ہاں! پنک کلر کا لہنگا چولی۔'' شوبھا نے کلر تک بتا دیا۔

''پنک کلر کا لہنگا چولی.........؟'' منّا کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں ہاں جو وہ اپنے ساتھ لال رنگ کے بیگ میں لائی تھی۔؟'' شوبھا نے بیگ کا کلر بھی بتا دیا۔

''نہیں میڈم نہ ہی وہ کسی طرح کا بیگ لائی تھی اور نہ ہی کوئی لہنگا چولی اُس کے پاس تھا۔ ایک پالی تھین میں سرخ کلر کی کام دار ساڑی تھی۔ جسے میک اپ کے بعد واش روم میں ٹاپ اور جینس کو چینج کر کے اس نے پہنا تھا۔ اور ساڑی تو وہ لیڈی مساج کرنے والی

ہے اُس نے بڑی مشکل سے پہنایا تھا۔ وہ اُسی سرخ ساڑی میں گاڑی تک سنبھل سنبھل گئی تھی۔ ٹاپ اور جینس کو تو اُس نے واش روم میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب مساج کرنے والی نے مجھے بتایا تب میں ٹاپ اور جینس کو لے کر اُس کے پیچھے گاڑی تک بھاگا۔

'' نہیں ممّا جی! اب مجھے اِن کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے، اِسے ڈسٹ بین میں ڈال دیں۔ یا کبھی ممّا آئے تو اُسے میری طرف سے تحفے میں دے دینا۔''

''یہ کہتے ہی گاڑی اِسٹارٹ ہوگئی تھی۔''

''میں نے سوچا کہ آج اِس کی سگائی ہے۔ نئے کپڑوں کا انبار لگ گیا ہوگا اِس لئے وہ پرانے کپڑے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل نئے ہیں۔ میں نے سنبھال کر رکھ دیا ہے۔ دو چار دن میں اِدھر آنا ہوا تو لے جایئے گا۔''

شوبھا پریشان ہوگئی کہ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ پنک رنگ کا لہنگا چولی کے بجائے سرخ رنگ کی ساڑی پہن کر وہ وہاں سے نکلی۔ لیکن ابھی تک لوٹی کیوں نہیں؟ وہاں سے نکلے ہوئے دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے ہیں۔

اس نے ایک بار پھر پریتی کو فون لگانا چاہا۔

لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود کنکٹ نہیں ہو پایا۔ بار بار انگیز ملا۔ شوبھا نے کنول کے پاس فون لگایا کہ ایسے موقع پر سہیلیوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔؟ لیکن اس کا فون بھی نہیں لگا.........سگائی میں شامل ہونے کے لئے کنول اپنی ممی کے ساتھ آ رہی تھی۔ اِس لئے اُس نے سوچا کہ کہیں وہ اُس کو لینے کے لئے اسٹیشن تو نہیں چلی گئی۔ یہ سوچ کر اُسے ایک راحت ضرور ملی۔ لیکن بے چینی کا ڈنک اُسے ہر پل تڑپا رہا تھا۔

46

رنگین قمقمے، طلسماتی ماحول اور تشویس کا سنّاٹا

قارئین!

تشویش بڑھتی جا رہی تھی اور جیسے جیسے تشویش بڑھ رہی تھی ویسے ویسے سگائی میں آنے والے مہمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شوبھا کے لئے پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہت مشکل سے اُس نے خود کو سنبھال کر رکھا تھا۔

''راج ڈانس اینڈ بار'' کا ہال مہمانوں سے پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف لڑکیاں میوزک پر تھرک رہی تھیں۔ جلتے بجھتے رنگین قمقمے ایک ایسا طلسماتی ماحول پیدا کر رہے تھے کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

یہ شادی ہی کچھ ایسی تھی کہ ہر کوئی اِس لمحے کا گواہ بننا چاہتا تھا۔ آنکھوں میں قید کرنا چاہتا تھا.........لیکن یہی یادگار لمحے جب طویل ہونے لگ جائیں تو انتظار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس مشکل اوقات میں اِس سے نبرد آزما ہونے کے لئے شوبھا مسکرا مسکرا کر سب کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ لوگوں کو راج سے ملوا رہی تھی۔ اِس امیّد پر کہ وقت پر پریتی آ ہی جائے گی۔

اور اِدھر قریب ایک گھنٹے میں اس نے ''انڈر سکسٹین سُپر ڈانسنگ چمپیئن شپ'' کے تینوں ججیز رونق افروز، شان کانچ والا اور ہیم بھاردواج، اناؤنسر پنکھڑی اور ''اپنا نرسنگ ہوم کی لیڈی ڈاکٹر آرتی کے ساتھ ساتھ کئی نامی گرامی لوگوں کو راج سے ملوا چکی تھی۔

شوبھا نے پرنسپل کے ساتھ مسیز شرما کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا تو مذاق کرنے سے باز نہیں آئی۔

''مسیز شرما! کیا بات ہے۔ مسٹر شرما کے بجائے پرنسپل کے ساتھ آ رہی ہیں؟۔''

''ارے بس یوں ہی اُن کو فرصت نہیں تھی۔ اور اِن کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔''

مسیز شرما نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے بھی بڑی کھلاڑی ہو مسیز شرما!......... پتی بھی خوش اور پڑوسی بھی مُٹھی میں .... جب دھوپ رہی تو اندر سو گئی اور سردی لگی تو دھوپ میں آ گئی ۔ دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل میری قسمت میں کہاں؟ ۔ میں تو حرام خور ڈاکٹر کو لائن پر لانا چاہتی تھی، لیکن وہ کمینہ نکلا۔'' شوبھا اِن باتوں میں اتنا محو ہو گئی کہ تھوڑی دیر قبل جو بے چینی کا ڈنک اُس کے جسم کو نیلا کر رہا تھا وہ مہمانوں کے آ جانے کی وجہ سے زائل ہونے لگا تھا۔

''لیکن تمہارے اِس کمینہ ہسبینڈ نے تمہارے اُس ٹین ایجر نوکرانی کے لونڈے کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنا دیا ہے ۔ تجھے معلوم ہوا یا نہیں ہوا ۔؟''مسیز شرما نے جانکاری کا پٹارہ کھول دیا تھا۔

''ہاں معلوم تو ہوا لیکن ....؟ ارے چھوڑ اِن باتوں کو ۔ اچھا خاصا سگائی کا مزہ خراب ہو جائے گا۔'' پھر کچھ یاد آتے ہی وہ بولی ۔''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے اُس لنڈورے ہسبینڈ کا کیسا چل رہا ہے ۔''

''ارے اُس کی تو چاندی ہو گئی ہے ۔ ایم ایل اے صاحب نے منتری سے مل کر قسمت پور سے اِس بار ایم پی کا ٹکٹ دلوا دیا ہے ۔ وہ وہاں کے تمام چھٹے ہوئے لوگوں کے ساتھ مل کر جیتنے کا فارمولا بنا رہے ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فائنل کرنے میں لگے ہیں کہ جیتنے کے بعد کسے کون سی ذمّہ داری، یا کسے کون سا کونٹریکٹ ملے گا.........آج کل جیت ہار کا فیصلہ تو اِن ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اور یہ لوگ تو ووٹ سے پہلے ہی اپنے اپنے محلّے کے ووٹ کا ٹھیکہ پارٹی سے لے لیتے ہیں ۔ جس نے جتنی بڑی بولی لگائی اُس کے لئے اتنا بڑا ٹھیکہ ۔ جتنا بڑا داغی اُس کا اتنا ویلیو.........سمجھی! ابھی سے یہ سب سیکھ کر رکھ لو ۔ کیوں کہ مجھے اندر کی بات معلوم ہے ۔ ایم ایل اے الیکشن میں تمہارے ہی ہاتھوں عزّت پور کی عزّت نیلام ہونے والی ہے ۔''مسیز شرما نے کسی جیوتشی کی طرح اُس کا کل اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

''دیکھو کیا ہوتا ہے ۔ ویسے میں نے ایم ایل اے صاحب اور منتری جی کی عزّت بڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے ۔ اِس کے بدلے وہ تھوڑی بہت میری عزّت بڑھاتے ہیں تو اچھی بات ہے ۔ اور پھر میں تو اِتنا جانتی ہوں کہ جو 'سیوا' کرے گا وہی 'میوہ' پائے گا۔'' وہ ہنسنے لگتی ہے۔

''ارے کیوں نہیں شرما جی کو اِسی کا تو انعام ملا ہے ۔''مسیز شرما نے اپنا 'میوہ' سامنے رکھ دیا تھا۔

''ہاں ہاں ! وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ایک بات بتاؤ، جب ہم بھی ایم ایل اے یا منتری بن جائیں گے تو سوچو کتنا مزہ آئے گا ۔ ہم لوگ بھی اِن منتریوں کے نقش قدم پر چل کر اپنے لئے ہر روز نئے نئے شکار تلاش کریں گے ۔''شوبھا کی آنکھیں اِس طرح چمک اُٹھیں جیسے بھوکی بلّی کی نظر چوہے پر پڑتے ہی چمکتی ہے۔

''ارے پہلے کون سا تم دودھ میں دھُلی تھی ۔ نوکرانی کے اُس بیٹے کا کیا نام تھا ....؟ پھر اُسے خود ہی یاد آ جاتا ہے ۔''ارے شامو! لیکن اب جانتی ہے اُس کا نام شیام سندر ہے، اور اب تو وہ ڈاکٹر بن گیا ہے ۔ تم اُس چھوکرے کے پیچھے ایک دن باتھ روم میں کیسے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی ۔''

''ارے اُن باتوں کو چھوڑو ۔ وہ تو حرام خور نکلا ۔ لیکن یہ بتاؤ کہ کنول کو ساتھ کیوں نہیں لائی ....؟ تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہاری بیٹی کو چھوڑ کر پریتی کی کوئی اور سہیلی نہیں ہے ۔ اور وہ تو آنے والی تھی ۔؟''

کنول کا خیال آتے ہی شوبھا یہ سوچنے لگی کہ پھر پریتی کس کو لینے اسٹیشن گئی ہو گی ۔ اُس کی بے چینی ایک بار پھر بڑھنے لگتی ہے ۔ لیکن اُسے اِس طرح کی باتوں میں مزہ بھی آ رہا تھا ۔ اس لئے وہ مسیز شرما کی بات سننے لگتی ہے۔

'' آنے والی تھی نہیں وہ بس آنے ہی والی ہے ۔''

''لیکن کس کے ساتھ ....؟''

''بس جب آئے گی تو دیکھ لینا کہ جوڑی کیسی لگ رہی ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔لیکن یہاں آ کر جب راج سے ملی تو لگا کہ اِس معاملے میں تم نے بازی مار لی ہے کیوں کہ.........'' اُس نے زور کا ٹھہا کہ لگایا۔

اُسی وقت ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کی اِنٹری ہوتی ہے اور اُن کی بانہوں میں باہیں ڈالے کنول نظر آتی ہے۔

اِس جوڑی کو دیکھ کر تو شوبھا کی ہنسی رُکتے نہیں رُک رہی تھی۔

'' ارے مسیز شرما ! اتنی اُونچی اُڑان اڑو گی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا ....لیکن جو بھی بولو جوڑی جم رہی ہے۔''

''ارے شوبھا یہ بولو کہ خوب جم رہی ہے۔داماد لگے گا تیرا۔اور یہ بات بھی یہاں صرف تمہیں ہی معلوم ہے کہ گولڈن فریم کے نیچے جو ایک آنکھ ہے وہ پتّھر کی ہے۔لیکن وہ پتّھر بھی بہُت قیمتی ہے۔''

کنول اور ایم ایل اے صاحب شوبھا کے سامنے آ کر رک جاتے ہیں۔

''ہیلو انٹی اِن سے ملئے یہ ہیں میرے.........''

ایم ایل اے سلیم کانے بھی مسکرا دیتے ہیں۔شوبھا سے بھی ہنسی رُکتی نہیں ہے۔

''بہت خوب جوڑی ہے۔بھگوان دونوں کو سلامت رکھے ....'' پھر وہ آگے شکایت بھرے انداز میں۔'' مسیز شرما!تم نے شادی کی خبر نہ ہی مجھے دی کی اور نہ ہی کنول نے پریتی کو۔آخر بات کیا ہے۔؟''

''ارے کیا کہوں ۔'' بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے۔''ایم ایل اے سلیم کانے صاحب ایک دن کنول کے ہمراہ سمندری لہروں کی سیر کے لئے گئے تھے۔وہاں سالے کچھ فوٹو گرافروں نے دونوں کی ننگی فوٹو اُتار لی۔اور بلیک میلینگ کرنا شروع کیا۔نگیٹیو کے بدلے پانچ کروڑ کا ڈیمانڈ رکھ دیا۔لیکن اِنہوں نے چالا کی یہ دکھائی کہ کنول کو دوسری پتنی بتا دیا۔پھر پنڈت سے مل کر اُسی دن جعلی کاغذات بنائے اور مالا والا میں فوٹو کھینچوا کر اُس سے

شادی رچالیا۔دوسرے دن ننگی تصویروں کی جگہ دونوں کی شادی کی تصویریں شائع ہوئیں۔ اِس طرح سے کسی کو بلانے کا موقع ہی نہیں ملا اور شادی ہوگئی۔

''پھر تو ایم ایل اے صاحب کو تو دو دو پارٹی دینی چاہئے۔؟'' شوبھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دودو۔وہ کس لئے.........؟'' سلیم کانے نے جاننا چاہا۔

ایک پانچ کروڑ کا چونا لگنے سے بچنے کے لئے اور دوسری کروڑوں کی کنول کو مفت میں حاصل کرنے کے لئے.........'' شوبھا نے ٹھہا کہ لگایا۔

''ہاں وہ تو ہے۔''

''کنول اپنے اِس کروڑ پتی کانے پر نظر رکھنا ورنہ.........'' شوبھا نے یہ بات کچھ اور مقصد سے کہی تھی لیکن کنول نے اِسے دوسری طرف سے لپک لیا۔

''ویسے انٹی میری طرف سے کھُلی اِجازت ہے۔کبھی ایم ایل اے صاحب سے کوئی کام وام ہو تو بے جھجک چلے آیئے گا۔اِس بہانے اُس رات آرام سے بستر پر سو تو سکوں گی میں۔''

کنول نے بولڈنیس دکھائی تو مسیز شرما کی بھنویں بھی تنیں۔

''کنول !تمہیں انٹی سے اِس طرح کی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آ رہی ہے ....؟''

''اب شرم کس لئے ممی!جب دونوں کے پاؤں میں ایک ہی جوتے سما رہے ہوں ۔''اس جواب نے سب کو چت کر دیا تھا۔

'' بیٹا پھر بھی عزّت داروں سے اِس طرح کی بات کرنا تمہیں شوبھا نہیں دیتا۔''مسیز شرما نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''لیکن شوبھا انٹی کو عزّت پور کا ٹکٹ تو شوبھا دیتا ہے نا.........؟اگر یہ شوبھا دیتا ہے تو یہ کیوں نہیں۔؟'' کنول نے ایم ایل اے سلیم کانے کی طرف اشارہ کیا۔

''شوبھا جی اب جب سے کنول زندگی کے گلدان میں سجنے لگا ہے تب سے مجھے کوئی دوسرا پھول آکرشت ہی نہیں کر رہا ہے ....لیکن اب رہی عادت کی تو یہ تو جاتے جاتے جائے گی۔'' ایم ایل اے سلیم کانے نے اپنے تجربات کی کچھ روشنی بانٹی۔

''لیکن داماد بابو! اب رشتے میں یہ آپ کی ساس ہوگئی ہیں۔ اِس بات کا خیال رکھیں گے ....ویسے یہ تو میں جانتی ہی ہوں کہ آپ کو گلدانوں میں پھول بدلنے کا شوق ہے۔ کبھی باغ میں کمی پڑ جائے تو اِس پھول سے بھی گلدان سجا سکتے ہیں۔'' مسیز شرما نے اپنے جوڑے میں سے ایک پھول نکال کر ایم ایل اے سلیم کانے کی طرف پیار سے بڑھایا۔

''ممی.........!'' کنول کی ناراضگی بجا تھی۔

پھر سبھی ایک ساتھ ٹھہاکہ مار کر ہنسنے لگے۔ ہال میں موجود سبھی اِن لوگوں کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اِنہی ٹھہاکوں کے درمیان شوبھا اِن سبھوں کو راج سے ملواتی ہے۔

''مسیز شرما! میں نے کہا تھا نا کہ میرا راج لاکھوں میں ایک ہے۔ بولو کیسا لگا۔؟'' شوبھا کن انکھیوں سے سب کی طرف باری باری سے دیکھتی ہے۔

''بہت خوب! میں آپ کے اِس انتخاب کی داد دیتی ہوں۔'' مسیز شرما تو راج پر لٹّو ہو رہی تھی۔

''اور ایم ایل اے سلیم کانے صاحب! آپ بتائیں.........؟'' شوبھا نے اُن سے بھی پوچھا۔

''میں ہی کیا منتری جی بھی اِس رشتے کی کافی تعریف کر رہے تھے۔ بھئی راج بہت بہت مبارک ہو۔'' ایم ایل صاحب نے اتنے تپاک سے گلے سے لگایا کہ وہ بس گرتے گرتے بچے۔

''اور راج صاحب مجھ سے نہیں ملیں گے میں ہوں ایم ایل اے سلیم کانے کی فریش وائف۔ مسیز کنول.........خوش قسمتی سے آپ جس کے پتی بن رہے ہیں وہ میری

بچپن کی سہیلی ہے۔ اِس لئے جیجا جی اُس کا پوری طرح سے خیال رکھئے گا کہ مس فائر نہ ہونے پائے ورنہ چڑیا پھُر ہو جائے گی۔''

''نہیں، نہیں کنول صاحبہ! میں نے ساری تیاّری کر لی ہیں۔'' پھر اُس نے کالی شیروانی میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا.........'' وہ صاحب حکیم ہیں اور مجھ سے بہت یارانہ ہے۔ اگر کبھی آپ کو ضرورت پڑی تو اُن سے ضرور مل لیجیئے گا۔''

راج کی باتوں پر ایم ایل اے سلیم کانے نے مسکراتے ہوئے کنول کے کان میں کہا۔ ''اِن سے کہو کہ ابھی حکیموں سے ملنے کا وقت ہمارا نہیں ہوا ہے۔''

ابھی ہنسی مذاق کے پیرائے میں یہ سب گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ ہال کے اندر منتری جی آتے دکھائی دیئے۔

سب کے ساتھ ساتھ راج بھی اُن کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن عین وقت پر اُن کے کچھ پرانے دوست واحباب سامنے آگئے۔ مبارک باد دینے لگے۔ تو وہ اُن کے درمیان گھر کر رہ گئے۔

آیئے آیئے! منتری جی۔ کہئے آنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ شوبھا نے مسکراتے ہوئے مہندی لگے گورے ہاتھوں کو اُن کی طرف بڑھا دیا۔

''ارے تمہارے ہوتے ہوئے تکلیف کیسی۔'' گرم جوشی سے شوبھا کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے منتری جی بولے۔ ''پلان کے مطابق سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا......... یا کہیں کوئی ڈائریکٹر فلم کی ریل کی طرح میری زندگی کے اسکرپٹ کو کانٹ چھانٹ کر رہا ہے۔'' خوشی کے اِس موقعے پر بھی منتری جی کو صرف اپنی فکر تھی۔

شوبھا منتری جی کو کنارے لے جا سمجھاتی ہے۔

''ارے آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں منتری جی! میں تو اب تک آپ کے ہی پلان کو فولو کر رہی ہوں۔ صرف نام کی سگائی راج کے ساتھ ہو رہی ہے۔ لیکن پریتی بعد میں تو آپ کی ہی ہوگی۔''

''بعد میں کیوں..........؟ ابھی کیوں نہیں..........؟''

''میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟''

''میرا مطلب ہے کہ سگائی کے بعد راج کو اتنا پلا دیں گے کہ وہ خود ہی ہوش میں نہیں رہے گا اور پھر تم پریتی کو میرے کمرے میں بھیج دینا منہ میٹھا کرنے کے لئے..........''

''اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں منہ میٹھا ہونا تو..........؟''

شوبھا اِس بات سے ڈر رہی تھی کہ وہاں تو بہت سارے راج کے بھی گیسٹ تھے۔ جو رات کو منتری جی کے کمرے میں جاتے یا نکلتے دیکھ لیں اور بات پہنچ جائے تو راج ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔'' منتری جی نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے آگے کہا۔ ''میں تو صرف اِس لئے کہہ رہا تھا کہ بس اگلے ہفتے ہی عزّت پور کے ٹکٹ کا فیصلہ سی ایم آواس میں ہونا ہے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ..........ویسے تمہاری مرضی..........کہ ٹکٹ بُک کروانا ہے یا نہیں۔''

''ارے اِس میں میری کیا مرضی۔'' شوبھا نے وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے آگے کہا۔ ''سب کچھ تو آپ کا ہی ہے منتری جی۔ اور پھر جب اتنی دور سے اِس شُبھ کام کے لئے ہی آئے ہیں تب تو منہ میٹھا کرانا ہی ہوگا۔''

''اس ذرّہ نوازی کے لئے پیشگی شکریہ..........''

''لیکن پہلے راج سے تو مل لو۔''

اور پھر شوبھا منتری جی کو لے کر راج کے پاس گئی۔ وہ اپنے کچھ خاص دوستوں سے مبارک باد وصول کرنے میں لگا ہوا تھا۔

''راج! دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے۔ میں نے خاص طور سے اِس سگائی میں اِنہیں انوائٹ کیا ہے۔ تا کہ آج کا دن اور بھی یادگار ہو جائے۔'' شوبھا نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''راج نے منتری جی کی طرف مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے ہاتھ بڑھایا۔

منتری جی نے اپنے مضبوط ہاتھوں کا سہارا دیتے ہوئے کہا۔ ''راج صاحب بہت لاڈوں سے پالا ہے ہم نے پریتی کو۔ اُسے ذرا بھی تکلیف ہوگی تو سمجھو میرے دل پر چوٹ لگے گی۔ اِس لئے بھئی سنبھال کر رکھنا میری امانت کو۔''

''منتری جی! آپ آ گئے تو اِس محفل کی رونق ہی بڑھ گئی ہے۔ کہئے کیا لیجئے گا..........؟''

''بھئی لین دین کی بات تو ہم سگائی کے بعد کریں گے۔''

☆☆☆

47

لال بیگ، جعلی کاغذات اور لہنگا چولی

قارئین!

پنڈت نے بہت کچھ دیکھ اور سمجھ کر ۶:۴۵ کا وقت سگائی کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور وہ وقت بھی نکلا جا رہا تھا۔ ایسے میں وہ تمام مہمان جو اِس انوکھی سگائی کا گواہ بننا چاہتے تھے۔ اِس یادگار لمحے کو قید کرنا چاہتے تھے وہ سب کے سب شوبھا سے پوچھ رہے تھے۔

''پریتی کہاں ہے۔؟''

اور وہ ہر کسی کو مسکرا مسکرا کر یہی کہہ رہی تھی۔ ''بیوٹی پارلر گئی ہے بس آتی ہی ہوگی۔''

لیکن اب اُس کے اندر انجانہ خوف سر اُبھارنے لگا تھا۔ ہر بار اُس نے کسی نہ کسی طرح کا بہانہ بنا کر سُلا دیا تھا۔ اِس دوران اُس نے پریتی کو کئی بار فون کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو انگیز مل رہا تھا۔ لیکن بعد میں سوئچ آف کا میسیج آنے لگا۔ آخر کار اُس سے رہا نہیں گیا۔ اُس نے راج ملہوترہ کو احتیاطاً اِس بات کی جانکاری دی۔ اُس نے بھی اِدھر اُدھر فون کر کے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ پھر کئی جان پہچان ہاتھ پریتی کا نمبر ڈائل کرنے کے لئے آگے آئے۔ لیکن کسی کو کامیابی نہیں ملی۔

''اب میرا دل گھبرا رہا ہے کہ کہیں اُس کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا۔'' شوبھا اندر سے ٹوٹنے لگی تھی۔

''وہ گاڑی ٹھیک سے چلا لیتی تھی نا۔؟'' راج کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

''ہاں! لیکن اکثر ڈرائیور یا میں اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ آج وہ پہلی بار ضد کر کے اکیلی باہر نکلی تھی۔'' پھر اپنے آپ میں بڑبڑاتے ہوئے۔ ''ویسے گاڑی تو اتنی صفائی سے چلاتی تھی کہ حادثہ ہونے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔''

''لیکن میرا دل تو کسی اور بات کے لئے ڈر رہا ہے۔'' راج کے دل کی دھڑکنیں

بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

''کس بات کے لئے.........؟''

''آئے دن لڑکیوں کے کڈنپ جو ہوتے ہیں۔''

''چلتی کار میں گینگ ریپ وغیرہ تو عام سی بات ہے آج کل۔ لیکن ڈر اِس بات کا ہے کہ غنڈے موالی کہیں شناخت چھپانے کے لئے اُس کا خون نہ کر دے۔'' ایئر کنڈیسنڈ ہال میں بھی شوبھا پسینے سے بھیگنے لگی تھی۔

حادثہ، کڈنپ، گینگ ریپ اور خون کے خیال سے شوبھا اور راج کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ دونوں اپنی اِس پریشانی کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اِس لئے آرکیسٹرا اِسی طرح بج رہا تھا۔ بالاؤں کا ڈانس بھی اِسی طرح جاری تھا.........لیکن بار کے منیجر جو راج کے ہمدردوں میں سے تھے اُنہیں اِس کی مہک لگ گئی۔ مشورہ دیا۔

'' آپ دونوں جلد سے جلد پولس اسٹیشن جائیں اور رپورٹ لکھوائیں۔ زمانہ خراب ہے۔ اکیلی جوان اور خوبصورت لڑکی کبھی اور کہیں بھی ہوس کا شکار ہو سکتی ہے۔ کب کہاں کون شکار ہوگی اس کی خبر بھی پولس والوں کو ہوتی ہے۔ بے چاروں کی تنخواہ اتنی ہے کہ بیوی بچّوں کا پیٹ پالنے کے لئے نوکری کے ساتھ اِس طرح کی خبر بھی رکھنی پڑتی ہے۔''

شوبھا اور راج بار منیجر کو ہدایت دے کر ابھی ہال کے مین گیٹ تک پہنچے تھے اور چُپکے سے باہر نکلنے والے تھے کہ تبھی شوبھا کے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اسکرین پر پریتی کا نام روشن ہو گیا۔ اُس کے اندر سے باہر نکلتی روح اچانک جسم کے اندر دوبارہ حلول کر گئی۔ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے میوزک کے شور میں چلاّ کر اپنے قریب کھڑے راج سے کہا۔

''پریتی کا فون ہے۔''

راج نے ہاتھ اٹھا کر آرکیسٹرا والے کو اشارہ کیا تو پاپ میوزیکل ہنگامہ یکا یک جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ سب چونک کر دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس وقت تک شوبھا نے مسکراتے ہوئے موبائل کو کان سے لگا لیا تھا۔

''بیٹا کہاں ہو۔؟

''جہاں مجھے ہونا چاہئے تھا ممّا۔''

''ارے مذاق چھوڑ و اور جلدی آؤ۔ سگائی کے انتظار میں بے چارے راج کا بُرا حال ہو رہا ہے۔''

پریتی کا جواب سُنے بغیر مسکراتے ہوئے شوبھا نے راج ملہوترہ کی طرف دیکھا اور آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''اب زیادہ پریشان مت ہو میرے راج۔ بس وہ آ ہی رہی ہے۔''

''لیکن کب.........؟'' راج نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''ارے یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ اگر اتنے ہی بیتاب ہو تو خود اپنی ہونے والی منگیتر سے پوچھ لو۔'' شوبھا نے نزاکت کے لہجے میں کہا۔

''میں..........؟''

''ہاں تم خود سے سن لو تا کہ تمہارا دل ایک بار پھر سے جوان ہو جائے.........''

شوبھا نے اسپیکر آن کر کے راج ملہوترہ کو دے دیا۔

پریتی کی آواز ہال میں گونجنے لگی..........

''ممّا! اسّی سالہ بوڑھے راج ملہوترہ کی پراپرٹی پر تمہاری نظر ہے۔ اس لئے تم اُس کی رکھیل بن جاؤ.........میں مندر میں پھیرے لے چکی۔ انڈرگارمینٹ دھونے والا شیام سندر اب ڈاکٹر بن چکا ہے ممّا۔''

ہال میں موجود تمام لوگ ہکّا بکّا ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ ایک ایسی خاموشی جہاں رہتے ہوئے بھی لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔ خاموشی کا سینہ چیر کو ایک بار پھر آواز باہر نکلی اور چاروں طرف پھیل گئی۔

''اور ہاں راج کی پراپرٹی کے وہ سارے جعلی کاغذات جو تم نے پہلے سے ہی بنوا رکھے تھے وہ بھی میں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ کسی کو اِس طرح دھوکہ دینے سے پہلے ہزار

بار سوچا ہوتا ممّا کہ جب تمہیں کوئی اِس طرح دھوکہ دے گا تو تمہارے دل پر کیا بیتے گی۔؟''

پھر کچھ دیر کے لئے گہری خاموشی.........

''اور ممّا! راج کو اُس کا لہنگا چولی واپس کر دینا۔ میں اُسے اپنے ساتھ لائی ہی نہیں۔ وہ الماری میں ہے اور اس کی چابھی نیچے رکھی ہوئی ہے۔'' کہتے کہتے پریتی کی سانسیں بھی پھولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

''ممّا! کیا یہ نہیں معلوم کرو گی.........کہ اُس لال بیگ میں کیا تھا.........جسے میں سوغات کے طور پر اپنے ساتھ لائی ہوں.........؟

''نہیں ممّا! تمہیں ان کاغذوں کی قیمت کا بھلا کہاں اندازہ ہوگا.........ویسے پھر بھی بتا دیتی ہوں کہ جب بھی پاپا اور شیام سندر کی کوئی تصویر یا انٹرویو شائع ہوتا، میں اُس کا تراشا گدّے کے اندر چھُپا کر رکھتی تھی۔ تمہیں معلوم نہ ہو اس کے لئے میں نے ایک جگہ سے تھوڑی سی سلائی اِس صفائی سے کھول دی تھی کہ کبھی تم اگر گدّا پلٹنے کی کوشش بھی کرو تو تمہاری آنکھوں کے رڈار میں نہ آئے۔''

''اور ہاں لائسنس پاپا نے بنوا کر ایک دن قبل شیام سندر سے بھجوایا تھا۔ تا کہ میں سو، سوا سو کیلو میٹر کا سفر کر کے اُن کے پاس پہنچ سکوں.........تمہاری گاڑی میں نے واپس کر دی ہے۔ ایک ڈرائیور ابھی ابھی گاڑی لے کر یہاں سے نکلا ہے۔ ویسے بھاگنے کے لئے تو میں پہلے بھی بھاگ سکتی تھی۔ لیکن سگائی کے دن بھاگنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے ممّا۔''

''اور ممّا یہ نہیں معلوم کرو گی کہ شیام سندر نے مجھے لائسنس کب، کہاں اور کیسے دیا۔ ارے وہ تو قریب ایک سال سے ہر ہفتہ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر بھیس بدل کر بار میں آتا تھا۔ اور یہ سب کچھ پاپا کے اشارے پر ہو رہا تھا۔''

اس کے بعد پریتی کا موبائل آف ہو گیا۔

☆☆☆

48

ریئلیٹی کی سنہری کرن، رِم جھم اور بوسیدہ چھتری

قارئین!

ہر طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔کسی کو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔؟

تھرکتے پاؤں نے جمود کی بیڑیاں پہن لیں۔

جام تھامے ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رُک گئے۔

مسکراتے ہونٹوں پر چپ کے تالے پڑ گئے۔

آنکھیں حیرت واستعجاب میں ڈوب گئیں۔

ذہن کے مدار پر بے شمار سوالات گردش کرنے لگے........اور گردش کرتے سوالوں کے درمیان جواب تلاش کرتے لوگوں نے دیکھا کہ اِس طوفان میں شوبھا کے جسم کا شاداب شجر اپنی بنیاد سے الگ ہو کر زمیں بوس ہو گیا ہے۔جس کی جڑیں تو موٹی تھیں لیکن زمین کے اندر تک جانے کے بجائے اوپر ہی اوپر کنڈلی مارے بیٹھی تھیں۔ایسے میں گہرائی جو جڑ کو توانائی بخشتی ہے وہ اِس کے حصّے کو نصیب نہیں ہوئی۔اِس لئے کمزور پڑنا اور مٹّی کو چھوڑ دینا فطری عمل تھا۔

شوبھا کے گرتے ہی راج پر بھی غشی طاری ہو گیا۔یکا یک جسم کا توازن بگڑا اور وہ بھی وہیں سر پکڑے پکڑے گر پڑے۔

اُس وقت شوبھا اور راج کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔کوئی ان دونوں کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔کوئی جوتے چپّل کھول کر تلوے رگڑ رہا تھا۔تو کوئی سر کی مالش کر رہا تھا۔

سینیئر جج رونق افروز کی معشوقہ ڈاکٹر آرتی نے راج ملہوترہ کو تو فوراً سنبھال لیا۔لیکن شوبھا کو ہوش میں لانے میں گھنٹوں لگے.........جس دن وہ سب سے زیادہ خوش تھی

اُسی دن اُسے سب سے گہرا زخم ملا تھا۔اُسی کا تیر اُسی کے بان سے نکل کر اُسی کے جسم کے آر پار ہو گیا تھا۔کبھی ایسا بھی ہو گا؟ اُس نے سوچا نہیں تھا۔لیکن ایسا ہو گیا تھا۔اُس وقت اُس کی حالت اُس شیرنی کی سی تھی جس کے پنجوں اور جبڑوں کی گرفت میں شکار پوری طرح سے آ چکا ہو اور وہ گھسیٹ کر اُسے ماند تک لے گئی تھی۔لیکن ذرا سی چوک ہوتے ہی وہ اُسے غچّا دے جائے۔

لیڈی ڈاکٹر آرتی نے معائنہ کے بعد ہدایت کی کہ''اگر دوبارہ اس طرح کا شاک لگا تو آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔اِس لئے جو ہوا اُسے بھول جائیں اور پھر سے ایک نئی زندگی کی شروعات کریں۔''

''نئی شروعات.........کے لئے........بھولنا.......ضروری ہے ڈاکٹر.........؟''

رُک رُک کر اِس طرح کہا جیسے سینے میں زور کا درد ہو۔

''ہمیشہ نہیں..........''ڈاکٹر آرتی نے اُسے سمجھایا۔''کبھی کبھی تو نئی شروعات کے لئے پرانی باتوں کو یاد کرنا ضروری ہوتا ہے...........لیکن یہ سب کچھ منحصر کرتا ہے اُس کے ماضی پر کہ وہ یادوں کے کیسے ستونوں پر کھڑا ہے۔''

لیڈی ڈاکٹر سمجھا کر اور پاس کی دکان سے دوا منگوا کر اپنے عاشق جج رونق افروز کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

اِس کے بعد بہت سارے لوگ چلے گئے۔کھانا کسی نے نہیں کھایا۔ہر طرف اُداسی کا عالم تھا۔سگائی والی ہیرے کی انگوٹھی کو راج نے ناگرا جوتے سے دبا کر بدہیئت کر دیا تھا۔اِس سے بھی اُس کا دل نہیں بھرا تو اُس نے اُسے ٹوائلیٹ میں ڈال کر فلش چلا دیا تھا۔

راج غصّے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔اور اِن کانپتے ہاتھوں سے ہی آسمان کو سر پر اٹھا لیا تھا۔شانت اور ہنس مُکھ نظر آنے والے راج کو اِس روپ میں کسی نے دیکھا تھا۔

''شوبھا! تمہارا کام ختم ہو گیا۔اب جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے رفو چکّر ہو جاؤ۔ورنہ میں پولس کو فون کر دوں گا.........'' پیر پٹکتے ہوئے۔''لعنت ہے ایسی ماں پر جو بیٹی کا سہاگ اُجڑنے کا انتظار کرے۔تا کہ وہ اُس کی پراپرٹی پر راج کر سکے۔''

پھر اُس نے پاگلوں کی طرح چلاّ کر اپنے نجی گارڈ کو بُلا لیا۔شوبھا کا وہاں رہنا اُسے ایک پل بھی گوارہ نہیں تھا۔

''حرام خوروں! دیکھتے کیا ہو اِس عورت کا سارا سامان نکال کر گیسٹ روم سے باہر پھینک دو۔میں ایک پل بھی ناگن کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ اپنے سر کے بچے کھچے بال نوچنے لگے تھے۔

منتری جی نے روکنے کی کوشش کی۔لیکن راج نہیں مانے۔اپنی اِس بے عزّتی کے ساتھ منتری جی کو یہ خوف ستانے لگا کہ پریتی تو ہاتھ سے نکل گئی اب مفت میں کہیں شوبھا اُس کے لئے جان کا جنجال نہ بن جائے۔اِس لئے اُنہوں نے فوراً گرگٹ کی طرح اپنی گردن گھمائی اور مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ لئے۔

''ایسا ہے کہ مجھے ایک اور پارٹی میں شامل ہونا ہے آپ لوگ جب یہاں ہیں ہی تو میرا کیا کام.........ویسے بھی راج ملہوترا کچھ دیر تک ہلّہ گُلّہ کرے گا پھر خود بخود شانت ہو جائے گا۔؟''منتری جی نے ایم ایل اے سلیم کانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

منتری جی ابھی دودھیا روشنی کی سیڑھیاں ہی اُتر رہے تھے کہ ایم ایل اے سلیم کانے صاحب کو بھی پارٹی کا کام یاد آ گیا۔پہلے گولڈن فریم کے چشمے کو اُتارا۔پھر اُس آنکھ کے کنارے کو صاف کیا جو پتھّر کی تھی۔لیکن اچانک یاد آیا کہ پتھّر سے آنسو؟ دوسری آنکھ کے کنارے کو دکھاوے کے لئے صاف کرتے ہوئے روہانسی آواز میں بولے۔

''شوبھا جی! دُکھ کی اِس گھڑی میں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔عزّت پور والے ٹکٹ کو فائنل کرنے لئے کل صبح مجھے ہر حال میں ہیڈ کوارٹر پہنچنا ہے۔اگر پہنچنے میں لیٹ ہوئی تو ٹکٹ.........؟ اِس لئے مجھے ابھی اور اِسی وقت نکلنا پڑے گا۔ویسے پرنسپل صاحب اور ساسوماں تو یہاں ہیں ہی۔سب سنبھال لیں گے۔''

شوبھا کے جواب کا انتظار کئے بنا ایم ایل اے سلیم کانے کنول کی کمر میں ہاتھ ڈالے تیزی سے باہر نکل گئے۔

منتری اور ایم ایل اے کے جاتے ہی انڈر سکسٹین سُپر ڈانسنگ کے جج رونق افروز، شان کانچ والا، ہیم بھاردواج اور اناؤنسر پنکھڑی نے سوٹنگ کا بہانہ بنا کر آہستے سے اپنا اپنا راستہ ناپ لیا۔

راج کا ہنگامہ اب بھی جاری تھا۔وہ تو لاتوں اور گھونسوں سے مارنے کے لئے کئی بار دوڑے تھے۔لیکن منیجر اور اُن کے دوسرے ساتھیوں نے روک لیا کہ خواہ مخواہ عورت پر ہاتھ اُٹھانے کا کوئی کیس نہ بن جائے۔لیکن اِس کے بعد بھی وہ سامان پھنکوانے اور اپنے گیسٹ روم سے نکلوانے پر بضد تھے۔

اب شوبھا کے ساتھ بچ گئے تھے پرنسپل اور مسیز شرما۔دونوں چاہ کر بھی شوبھا کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔اور اب تو شوبھا کے ساتھ ساتھ اُنہیں بھی اپنی بے عزّتی سی محسوس ہونے لگی تھی۔اُنہیں اب ایسا لگنے لگا تھا جیسے سامان کے ساتھ اِن دونوں کو بھی باہر پھینک دیا جائے گا۔

پرنسپل نے مسیز شرما کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اِشارہ کیا۔بہت دیر تک رونے کی وجہ سے وہ نڈھال ہو گئی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے اُس کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔اِس بندی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مسیز شرما نے ہاتھوں کے نیچے سے بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ کھینچے اور بغیر آواز کئے سہج پاؤں رکھتے پرنسپل صاحب کے ساتھ سیڑھیاں اُتر گئی۔

منیجر نے مالک کے حکم کی تعمیل میں شوبھا کا سارا سامان باہر پھینکوا دیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جب شوبھا کو اپنے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہوئی محسوس ہوئی تو اُس کی سوجی آنکھوں نے دیکھا کہ نہ ہی وہاں پرنسپل ہیں اور نہ ہی مسیز شرما.......اور وہ سڑک کے کنارے ٹوٹی ہوئی کرسی پر ادھ مری سی اپنے ہی سامان کے درمیان اِس طرح پڑی ہے جیسے کباڑی کی دکان میں ایک اور سامان کا اضافہ ہو گیا ہو.......اُس کے چاروں طرف تماش بینوں کا ہجوم تھا۔لیکن اِس ہجوم میں جب اُس نے اپنوں کو نہیں پایا تو بے چین ہو گئی۔

آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔سامنے گھنا اندھیرا چھا گیا۔

لیکن اُس کی آنکھوں نے اس اندھیرے میں بھی دیکھ لیا تھا کہ بار کے مین گیٹ

پر تالا لگ چکا ہے اور منیجر اپنے دو چار لوگوں کے ساتھ راج کو سنبھالے گاڑی کی طرف جا رہا ہے۔ پھر اُس کے سامنے ہی راج کی گاڑی اِسٹارٹ ہوئی اور دھواں اڑاتی گیٹ تک پہنچ گئی۔تبھی سامنے ایک گاڑی آ کر رُکی۔

’’بھائی صاحب!‘‘

ڈرائیور نے سر باہر نکال کر رُکنے کا اشارہ کیا تاکہ وہ کچھ پوچھ سکے۔لیکن راج نے گاڑی پہچان لی۔اُس نے ڈرائیور کو آگے چلتے رہنے کا اِشارہ کیا۔

ڈرائیور کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔پھر وہ سامنے کی ایک دکان میں گیا۔دکان دار پارٹی میں موجود تھا۔اُس نے رام کہانی سُناتے ہوئے شوبھا کی طرف اشارہ کر دیا۔اُسے یقین نہیں آیا کہ شوبھا اُسے گیسٹ روم کے بجائے سڑک کے کنارے ٹوٹے پھوٹے سامانوں کے درمیان پژمردہ حالت میں ملے گی۔

یہ ڈاکٹر کپل اور شیام سندر کا مشترکہ ڈرائیور تھا۔اُس نے شوبھا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔لیکن اتنی تو اُسے سمجھ تھی کہ جب پریتی ڈاکٹر کپل کی بیٹی ہے اور یہ پریتی کی ماں تو رشتے میں یہ اُس کے مالک کی کیا ہوئی۔

پھر وہ پاس آیا اور بولا۔

’’پریتی نے یہ گاڑی آپ کے پاس چھوڑنے کے لئے بھیجا ہے۔چابھی لیجئے اور میں چلا۔

شوبھا نے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رُکا نہیں۔ یہ کہتے ہوئے بھیڑ کا حصّہ ہو گیا کہ’’پریتی نے مجھے صرف گاڑی چھوڑنے کے لئے کہا ہے۔رُکنے کے لئے نہیں۔‘‘

(ذہین قاری کے لئے یہ ناول یہاں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

اس لئے وہ باب نمبر ۴۹ کو پڑھے بغیر سیدھے باب نمبر۔۵۰ پر جائیں

اور وہاں سے آگے پڑھیں۔)

☆☆☆

49

دوسرا اختتام اور عام قاری کا ری ایکشن

’’پریتی نے یہ گاڑی آپ کے پاس چھوڑنے کے لئے بھیجا تھا.........لیکن اب آپ یہ بتائیں کہ میں آپ کو کہاں چھوڑ دوں۔؟‘‘

شوبھا نے ڈرائیور کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ڈرائیور نے ہمدردانہ لہجے میں دوبارہ کہا تو وہ کچھ خاص سامان گاڑی میں رکھنے لگی۔

’’چلو۔‘‘

’’کہاں۔؟‘‘

درد بھری آواز میں........’’وہاں جہاں ایک ’’لیمی نیٹیڈ گرل‘‘ سرخ رنگ کی ساڑی پہنے.........شیام سندر عرف شامو کی دُلہن بنی بیٹھی ہوگی..........میں بھی تو دیکھوں کہ دُلہن کے لباس میں آج میری بیٹی کیسی لگ رہی ہے..........؟‘‘

گاڑی چلاتے چلاتے ڈرائیور نے ایس ایم ایس کر دیا تھا۔گیٹ کے باہر پریتی اور شیام سندر پاؤں چھونے کے لئے کھڑے تھے۔گیٹ پر شیام سندر کی ماں تھی اور گیٹ کے اندر ڈاکٹر کپل اپنی تہذیبی مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھے۔

شوبھا کے کار سے اُترتے ہی مشرقی اُفق سے ریئلیٹی کی سنہری بارش ہونے لگی۔

ڈاکٹر کپل دوڑ کر اندر گئے۔اور وہی بوسیدہ سی چھتری لے آئے۔شوبھا کو لگا کہ وہ پریتی کی طرف بڑھیں گے۔لیکن یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ پریتی تو شیام کے ساتھ برآمدے میں دوڑ کر پہنچ چکی ہے۔پھر یہ چھتری.........؟

ایک پل وہ کچھ سوچتی ہے اور پھر دوڑتی ہوئی اُسکے نیچے آ جاتی ہے۔

☆☆☆

50

لیمی نیٹیڈ گرل اور قارئین

قارئین!

ناول کو اپنے اِس ذیلی عنوان سے پہلے ہی میں نے اختتام تک پہنچا دیا ہے اور وہ بھی دو بار۔ تیسری بار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر ایک بھی جملے کا اضافہ کیا تو اِس کی روح مجروح ہو جائے گی............ اِس کے باوجود اگر آپ اس موضوع پر کچھ اور سوچیں تو ''لیمی نیٹیڈ گرل'' کے کئی ابواب اور بڑھ سکتے ہیں............اور جو ابواب آپ کی طرف سے بڑھیں گے اسے بھی اِس میں ضم کرتے چلے جائیں گے تا کہ آنے والی نسل جب بھی اِس ناول کا مطالعہ کرے تو اُسے تشنگی کا احساس نہ ہو۔ ورنہ میرے ساتھ ساتھ آپ بھی مورد ِ الزام ٹھہرائے جائیں گے۔ کیوں کہ وقت کے مورّخ کی آپ پر بھی نظر ہو گی ہے۔

اختر آزاد

ا رجنوری ۲۰۱۳ء

☆☆☆

مختصر تعارف

نام	:	اختر علی
قلمی نام	:	اختر آزاد
پیدائش	:	۲۰ رفروری ۱۹۶۶ء شام پور، پیرپینتی، بھاگلپور (بہار)
والد کا نام	:	محمّد حسین
والدہ کا نام	:	نجم انساء
تعلیم	:	ایم اے (اردو) گولڈ میڈلسٹ (رانچی یونیورسٹی، ۱۹۹۱ء)
نیٹ	:	(یو جی سی ۔ ۲۰۰۴ء)
پی ایچ ڈی	:	(میرٹھ یونیورسٹی ۔ ۲۰۰۷ء)
پہلا افسانہ	:	'علاج' 1985 سہ ماہی ''صدف'' بھاگل پور

کُتب

بابِل کا مینار (افسانوی مجموعہ 2000)
ایک سمپورن انسان کی گاتھا (افسانوی مجموعہ 2005)
ہم کہاں جائیں...؟ (افسانوی مجموعہ۔ ہندی 2007)
منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ (تنقید 2007)
سونامی کو آنے دو (افسانوی مجموعہ 2011)
لیمی نیٹیڈ گرل (ناول -2013)

ترتیب

جمشید پور کا اردو ادب (اردو ر ہندی)
ایک شمارہ جمشید پور کے نام (''ہماری آواز'' 2006)

آئندہ شائع ہونے والی کُتب

(افسانوی مجموعہ۔ اردو میں زیرِ ترتیب)
جھارکھنڈ میں اردو افسانہ (تحقیق و تنقید)
اردو افسانہ: سمت و رفتار (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
چھڑی (ہندی کہانیوں کا سنگرہ)
برف پگھلے گی (ناول)
شکست کی آواز (ناول)
گھر واپسی وایا شدّھی کرن (ناول)
لیمی نیٹیڈ گرل (ہندی میں۔ ناول)

گھر جنّت

نور الصّباح (اہلیہ) کائنات اختر (بیٹی) تابش اختر (بیٹا)

پیشہ

درس و تدریس، صدر شعبۂ اردو، جواہر نواُودیہ ودیالیہ
سیچولتا، سرائے کیلا۔ (جھارکھنڈ) 831002

اِنعامات / اعزازات

☆ سعادت حسن منٹو ایوارڈ (فارینگ ٹلینٹ اِن پروز)
''اردو ہیریٹیج کارواں'' کی جانب سے
اِنڈیا اِنٹرنیشنل سِنٹر دہلی ۔(2012)
☆ اعزاز: شعبۂ اردو میرٹھ یونیورسٹی (2012)
☆ اعزاز: حلقۂ شائق کی جانب سے (2012)
☆ منظر کاظمی: پرائڈ آف پرفارمینس ایوارڈ (2011)
☆ ادارہ ''شائقینِ ادب، اعزاز (2011)
☆ شیلڈ آف آنر (2010)
وائس چانسلر، میرٹھ یونیورسٹی کے ہاتھوں
☆ ہِم کلا ساہتیہ سمّان، ہماچل پردیش (2009)
''ہم کہاں جائیں'' ہندی کہانی سنگرہ کے لئے
☆ حسن عسکری ایوارڈ (بہار اردو اکاڈمی کی جانب سے)
''منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ''
(تحقیق و تنقید) 2006-2007 کے لئے
☆ لدار چا فیر سمّان (کازا، ہماچل پردیش 2005)
☆ ''بہار اردو اکاڈمی ایوارڈ۔ (2005)
''ایک سمپورن انسان کی گاتھا'' کے لئے

ایک اور اعزاز

ڈاکٹر اختر آزاد کی افسانہ نگاری (تحقیق و تنقید)
ہزاری باغ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھا گیا

نصابی اعزاز

ایم اے کے نصاب میں افسانہ ''چھڑی'' شامل
''جھارکھنڈ کے منتخب افسانہ نگار اور افسانے'' مرتّب۔ ڈاکٹر افسر کاظمی
کولہان یونیورسٹی (جھارکھنڈ)

ساھتیہ اکادمی اعزاز

''سمکالین ہندی ساہتیہ'' کے گلوبلائزیشن نمبر میں مختلف زبانوں کی کہانیوں کے انتخاب میں اردو کی طرف ''بیوٹی فیکیشن'' شامل

دوسری زبان میں ترجمہ

انگریزی میں پانچ افسانے اور ہندی میں ایک

اردو / ہندی کے اہم کلیکشن

درجنوں افسانے

تحریریں

''ادبی چوپال'' کی جانب سے شائع کیا گیا۔ جس میں اردو ہندی اور انگریزی میں تقریباً ۲۰ رمضامین شامل ہیں

رابطہ

DR.AKHTAR AZAD
ROADNO.1,HOUSE-38,AZADNAGAR
JAMSHEDPUR-832110(JHARKHAND)
MOB:09572683122
E.Mail:dr.akhtarazad@gmail.com